WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ
حنا
اپریل 2015
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ

جلد: 37 شمارہ: 4
اپریل: 2015
قیمت: 60 روپے

مدیر اعلیٰ : سردار محمود
مدیر : سردار طاہر محمود
نائب مدیران : تسنیم طاہر
ارم طارق
ربیعہ شہزاد
عاصمہ راشد
مدیرہ خصوصی : فوزیہ شفیق
قانونی مشیر : سردار طارق محمود (ایڈووکیٹ)
آرٹ اینڈ ڈیزائن : کاشف گوریجہ
اشتہارات : خالدہ جیلانی
0300-2447249
برائے لاہور : افراز علی نازش
0300-4214400

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انشاء نامہ

ناولٹ

مکمل ناول

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

قارئین کرام! اپریل 2015ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

پوری دنیا میں جہاں مختلف قسم کی تبدیلیاں ہر روز رونما ہو رہی ہیں ان میں ایک تبدیلی موسم کی بھی ہے۔ ہمارے ملک میں ماہ اپریل میں ہی موسم گرما کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے شہری ادارے جو کے عوام کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کے ذمے دار ہیں۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کے جوہر دکھانے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ موسم گرما کا آغاز ہوتے ہی بجلی کی غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ شہریوں کے لئے انتہائی تکلیف کا باعث بنتی ہے اور افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سلسلہ سالہا سال سے جاری و ساری ہے۔ ہر سال بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود کوئی اس مسئلہ کا حل نہیں نکال پایا۔ بارہ بارہ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کر کے بھی بحران پر قابو نہیں پایا جا سکا۔

دوسری طرف بدامنی، دہشت گردی کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاری تقریباً رک چکی ہے۔ اس پر توانائی کے بحران نے معشیت کا پہیہ جام کر رکھا ہے روزگار کے مواقع معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ توانائی کے وسائل میں اضافہ ہوا نہ متبادل ذرائع تلاش کیے جا سکے۔ لاکھوں عوام ذہنی کرب کی زندگی گزار رہے ہیں ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ جمہوری حکومت کو ان حالات میں اصلاح احوال کے لئے حقیقت پسندانہ فیصلے کرنے چاہیے کہ ملک و قوم کا مفاد اسی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار و اختیار کو درست پالیسیاں مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں عمارہ امداد اپنے شب و روز کے ساتھ، سحرش بانو، فرحین اظفر اور فرح طاہر کے مکمل ناول، فرحت شوکت کا ناولٹ، فوزیہ احسان، عائشہ خان، حنا اصغر، نوشین اقبال اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے، سدرۃ المنتہیٰ اور نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

طوفاں میں جیسے دور سے ساحل دکھائی دے
میں ان کو سوچ لوں مجھے منزل دکھائی دے

یہ اور راستے ہیں حدی خواں! سنبھل کے چل
طیبہ کا ذرہ ذرہ مجھے دل دکھائی دے

گم ہو نہ جاؤں راہ میں اے صاحب کرم
اک بار پھر جادہ منزل دکھائی دے

طرز دعا بھی سونپ رہی ہوں نگاہ کو
کیوں صرف التجاؤں میں حائل دکھائی دے

وہ راہرو نہیں ہے اسے کارواں کہو
اس در کی آرزو میں جو شامل دکھائی دے

مل جائیں گے وہیں سے اجالے جہاں ادا
تنویر مہر و ماہ بھی سائل دکھائی دے

نعت رسول مقبول ﷺ

زمین پر اور آسماں پر الٰہی
ذکر ہے ترا ہر زباں پر الٰہی

تری دسترس سے نہیں کوئی باہر
تو حاکم ہے سب جہاں پر الٰہی

خزاں رت میں گل کھلائے ہیں تو نے
کرم ہے ترا گلستاں پر الٰہی

جلانے کو بے تاب ہیں بجلیاں
نظر ہو مرے آشیاں پر الٰہی

مرادیں دل کی وہ پا کر ہی جائے
جو آئے ترے آستاں پر الٰہی

نہیں ہے مرا اس جہاں میں کوئی
ترا نام ہے بس زباں پر الٰہی

سید اختر ناز

حرمت نفس انسانی

حضرت عمر بن خطاب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ قیدی آئے، قیدیوں میں سے ایک عورت کسی کی متلاشی تھی، اچانک قیدیوں میں سے ایک بچہ مل گیا، اس ن فوراً اسے اپنے پیٹ سے چمٹا لیا اور اسے دودھ پلانے لگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیکھا تو پوچھا۔

''کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی؟''

صحابہ کرام نے عرض کیا۔

''نہیں اللہ کی قسم! جہاں تک اس کا بس چلے گا وہ اسے آگ میں نہیں پھینکے گی۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سن کر فرمانے لگے۔

''جتنی یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے، اللہ اس سے کہیں زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔''

ایسا شفیق خالق کائنات کبھی انسانی جان پر ظلم وستم، بے انصافی اور بے جا قتل ہوتا نہیں دیکھ سکتا اور نبی ختم المرتبت سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہیں خدا نے دونوں جہانوں کے لئے رحمت اور رؤف و رحیم کہا ہے، بھلا انسانی جان کو اپنے دائرہ رحمت سے کیسے نکال سکتے ہیں۔

لوگوں سے برائی نہ کرنا

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھو، یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنی ذات پر کرتے ہو۔'' (بخاری شریف)

سب سے بہتر اسلام

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اس شخص کا اسلام سب سے بہتر ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' (بخاری شریف)

ہمسائے کے حقوق

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دے اور اسے چاہیے کہ مہمان کا احترام کرے اور اسے چاہیے کہ اگر بولے تو بھلائی کی بات کرے، ورنہ خاموش رہے۔'' (بخاری شریف)

مہمان کی عزت

حضرت ابوشریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا۔

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کا احترام کرے اور اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے، ایک دن رات خاطر مدارات کرے اور تین دن رات اسے اپنے ساتھ کھانے میں شامل کرے اور جو اس سے بھی بڑھ جائے، وہ پھر اس کے لئے صدقہ ہے اور اسے چاہیے کہ اگر بولے تو بھلائی کی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔''
(مسلم، کتاب الایمان)

سلام کرنا

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ تم غرباء اور مساکین کو کھانا کھلاؤ اور ہر شخص کو خواہ شناسا ہو یا اجنبی سلام کرو۔'' (بخاری شریف)

آسانی پیدا کرو

''آسانی پیدا کرو اور سختی میں مبتلا نہ کرو، لوگوں کو خوشخبری دو اور ایسی باتیں نہ کرو جن سے نفرت پیدا ہو۔'' (بخاری شریف)

منہ پر مارنا

''اگر تم میں سے کوئی شخص کسی سے لڑائی کرے تو اسے چاہیے کہ منہ پر مارنے سے اجتناب کرے۔'' (بخاری شریف)

مسلمان کے حقوق

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور بھائی نہ تو اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو ظلم یا تکلیف میں مبتلا دیکھ سکتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کا کفیل ہو جاتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی ایک تکلیف دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکالیف میں سے ایک تکلیف دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔'' (بخاری شریف)

خود کشی کرنا

''تم سے پہلی جو امتیں گزری ہیں، ان میں سے ایک شخص زخمی ہو گیا اور زخموں کی تکلیف سے اس قدر بے چین ہو کہ اس نے چھری سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا، جس کے نتیجے میں زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی، اس کی اس حرکت پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

''میرا بندہ خود کو ہلاک کرنے میں مجھ پر سبقت لے گیا، اس لئے میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔'' (بخاری شریف)

''جس شخص نے خود کو پہاڑ سے گرا کر خود کشی کی، وہ جہنم میں جائے گا اور وہاں بھی مسلسل اسی طرح پہاڑ سے گرائے جانے کے عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہے گا اور جس نے زہر کھا کر خود کو ہلاک کیا، وہ بھی جہنم میں زہر ہاتھ میں لئے خود کو اسی زہر سے ہلاک کرتا رہے گا اور ہمیشہ اسی تکلیف میں مبتلا رہے گا اور جس شخص نے خود کو لوہے کے کسی ہتھیار سے ہلاک کیا، وہ جہنم میں بھی ہتھیار ہاتھ میں لئے مسلسل اسے اپنے پیٹ میں مار کر خود کو ہلاک کرتا رہے گا اور ہمیشہ اسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔'' (بخاری شریف)

مسلمانوں کا آپس میں لڑنا

"جب دو مسلمان آپس میں تلوار سے لڑتے ہیں تو قاتل و مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں، مقتول اس لئے جہنم میں جائے گا کہ وہ خود بھی تو اپنے مقابل کو قتل کرنے کا خواہشمند تھا۔" (بخاری شریف)

"تمہارا خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں اسی طرح حرام و محترم ہیں، جیسے حج کے مہینہ میں مکہ مکرمہ میں عرفہ کا دن ہے اور یاد رکھو، عنقریب تم کو اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے، سو وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں باز پرس کرے گا، تو خیال رہے کہ تم میرے بعد دوبارہ ایسے گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں لڑنے لگو اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو اور وہاں ہر حاضر موجود پر لازم ہے کہ وہ یہ احکام ان لوگوں تک پہنچائے جو موجود نہیں ہیں۔" (بخاری شریف)

قتل کا بدلہ

"جو شخص جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے گا تو اس کا بدلہ جہنم ہے۔" (بخاری شریف)

سات کام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"سات تباہ و برباد کر دینے والے کاموں سے بچو، وہ یہ ہیں۔"

1۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا۔

2۔ جادو کرنا۔

3۔ اس جان کو ہلاک کرنا جس کا ہلاک کرنا اللہ نے حرام کیا ہے۔

4۔ سود کھانا۔

5۔ یتیم کا مال ہڑپ کرنا۔

6۔ جنگ کے دن منہ موڑ کر بھاگ جانا۔

7۔ پاک دامن بھولی بھالی مومن خواتین پر تہمت لگانا۔ (بخاری شریف)

مومن کی حرمت

"مومن پر لعنت بھیجنے کا گناہ مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے، مومن پر کفر کی تہمت لگانے کافر کہنے کا گناہ بھی مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔" (بخاری شریف)

جھگڑا کرنے والا

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت شخص وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔" (بخاری شریف)

نفس کو برا کہنا

"کسی شخص کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میرا نفس خبیث ہو گیا ہے۔" (بخاری شریف)

بدکلامی کرنے والا

"بدترین انسان وہ ہے جس کی بدکلامی سے بچنے کے لئے لوگ اس سے ترک تعلقات کر لیں۔" (بخاری شریف)

رحم کرنے والا

"جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔" (بخاری شریف)

"تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" (مستدرک)

مسلمان

"تم لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔" (ترمذی

شریف)

کامل مومن

"تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند ہو اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے۔" (مسند احمد)

حق کفالت انسانی

انسانی ضروریات کی کفالت کے حوالے سے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت کچھ فرمایا، چند ایک فرمودات کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "خرچ کرو تاکہ میں بھی تم پر خرچ کروں۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے اور دن رات بے تحاشا خرچ کرنا بھی اس میں کچھ کمی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پست کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بلند کرتا ہے۔" (بخاری شریف)

صدقہ کرنا

"جب کوئی شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پاک چیز ہی پہنچتی ہے تو اللہ اسے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی شکل ہو جاتا ہے۔" (بخاری شریف)

گھر والوں پر خرچ

"مسلمان جب اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے اور خرچ کرتے وقت ثواب کی امید رکھتا ہے تو وہ خرچ اس کا صدقہ بن جاتا ہے۔" (بخاری شریف)

صدقہ

"صدقہ دو اور اس لئے کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب ایک شخص صدقہ دینے کے لئے نکلے گا اور اسے لینے والا کوئی نہ ہوگا۔" (بخاری شریف)

محنت کرنا

"انسان کا جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا کمر پر اٹھا کر لانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے جو اسے کچھ دے یا انکار کر دے۔" (بخاری شریف)

بھیک مانگنا

"جو شخص لوگوں سے ہمیشہ مانگتا رہتا ہے، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔" (بخاری شریف)

عطا بخشش

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مجھے کچھ عطا فرماتے تو میں عرض کرتا کہ یہ اسے دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا ضرورت مند اور محتاج ہو۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "تم تم کو کوئی مال بغیر لالچ کیے اور بلا مانگے ملے تو اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ آئے، اس کے پیچھے مت پڑا کرو۔" (بخاری شریف)

خرید و فروخت

"غلے اور اناج کو قبضہ میں لینے سے پہلے آگے فروخت نہ کیا جائے۔" (بخاری شریف)

"عمدہ کھجوروں کے بدلے میں گھٹیا کھجوریں زیادہ مقدار میں دینے کے بجائے پہلے گھٹیا کھجوریں بیچو، اس سے جو رقم حاصل ہو، اس کے اعلا قسم کی کھجوریں خرید لیا کرو۔" (بخاری شریف)

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونے کو چاندی کے بدلے ادھار بیچنے سے منع فرمایا۔" (بخاری شریف)

بیوی کے حقوق

"ایک موقع پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟"

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب خود کھائے اسے کھلائے، جب خود پہنے تو اسے پہنائے نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے اور نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علیحدہ کرے۔" (ابن ماجہ کتاب النکاح)

صلہ رحمی کرنا

"جو صلہ رحمی یعنی حق قرابت ادا نہیں کرتا، وہ کبھی جنت میں داخل نہ کیا جائے گا۔" (بخاری کتاب الادب باب صلہ الرحم)

صلہ رحمی کا اجر

"جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں فراخی ہو اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔" (بخاری)

غیر مسلم ہمسایہ

"حضرت عبد اللہ بن عمرو نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے اہل خانہ کو کہا کہ" کیا تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبرائیل علیہ السلام ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا وہ پڑوسی کو ترکہ میں حصہ دار نہ بنا دیں۔" (ابوداؤد کتاب، الادب باب حق الجار)

یتیموں پر رحم

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا مگر وہ دعویٰ ثابت نہ کر سکا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑا رحم آیا اور مدعا علیہ سے فرمایا۔

"کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو، اللہ تم کو اس کے بدلے جنت دے گا۔" وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا۔

ابوالدحداح نامی صحابی حاضر تھے، انہوں نے اس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو۔" اس نے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ انہوں نے فوراً بدل لیا اور نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔

☆☆☆

درجہ اول کے اشتہارات

ابن انشاء

درجہ وار اشتہارات اردو صحافت میں نو وارد ہیں، ہم حیران ہوا کرتے ہیں کہ جب یہ نہ ہوا کرتے تھے تو لوگ بنگلے کیسے بیچتے یا خریدتے تھے، نام کیسے بدلا جاتا تھا کہ مجھے آئندہ گھسیٹا خاں کے بجائے مرزا صبغتہ اللہ بیگ کہا جائے، مشفق والدین، سعادت مند اولاد کو کیسے عاق کرتے اور ان کے لین دین سے بے تعلقی کا اظہار کرتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ شادیاں کیسے ہو جاتی تھیں؟ ہماری تحقیق یہ ہے کہ ان اشتہاروں میں سے اور کوئی پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے، ضرورت رشتہ کا اشتہار ضرور پڑھا جاتا ہے اور اس میں زید، بکر، بچے، بوڑھے، شادی شدہ، غیر شادی شدہ کی تخصیص نہیں۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے

عرضی نویسوں کی زبان کی طرح ضرورت رشتہ کے اشتہاروں کی عبارت بھی قریب قریب مقرر ہے، دوشیزہ ہمیشہ قبول صورت، پابند صوم و صلوۃ اور سلیقہ مند ہوتی ہے اور اس کا ایک معزز گھرانے سے تعلق ہوتا ہے، مرد ہے تو پڑھا لکھا، ہے، بی اے پاس لڑکی کے لئے ایم اے پاس شوہر ڈھونڈا جاتا ہے۔

ان اشتہاروں کا تجزیہ کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں شکل عقل کا ہونا ضروری نہیں، یہ آنی جانی اور فانی چیزیں ہیں۔

پرانے زمانے میں شادی کا مسئلہ بہت آسان تھا، درویدی کے سوئمبر میں فقط اتنی سی شرط تھی کہ یہ جو اوپر چکر میں مچھلی گھوم رہی ہے، اس کا عکس پانی میں دیکھ کر تیر سے اس کی آنکھ پر نشانہ لگایا جائے، یہ کوئی نہ پوچھتا تھا کہ نشانہ لگانے والا کانا ہے یا لنجا ہے، کالا ہے یا گورا ہے، اکبر الہٰ آبادی سے روایت ہے کہ لیلیٰ کی ماں نے بھی مجنوں کا حسب و نسب، سکونت، ولدیت وغیرہ نہیں پوچھے تھے۔

بس یہی کہا تھا۔

کہ بیٹا تو جو کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے، ورنہ آج کل ایک ایک یونیورسٹی سے اتنے ایم اے نکل رہے ہیں کہ لیلیٰ کی ماں کے لئے بڑی مشکل ہو جاتی، اسی طرح فرہاد میاں نے رشتہ مانگا تو شیریں نے فقط یہ شرط کی کہ یہ سامنے والا پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لے آؤ تو بندی کو عذر نہیں۔

پرانے لوگ بہت احتیاط کرتے تو سوجھ بوجھ کا امتحان لینے کے لئے پہیلیاں اور معمے دیتے، کبھی نہ پوچھتے کہ کیا تنخواہ ہے، کرائے کے

مکان میں رہتے ہو یا اپنا ہے، پنجاب کے ہو یا یوپی کے، شیعہ ہو یا سنی، ایسا ہی ایک شخص ایک بار کسی راج کماری سے شادی کا طلبگار ہو کر آیا، راج کماری کو بالعموم سخت پردے میں رکھا جاتا تھا، چشم فلک بھی اسے دیکھنے کو ترستی تھی، لیکن اس امیدوار نے اتفاقاً اس حسن جہاں سوز کو جھروکے میں کھڑے دیکھ لیا، بہت فرار کی کوشش کی لیکن پہرے کا انتظام سخت تھا، آخر وہ سوال و جواب کے لئے بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔

وزیر اعظم نے حسب دستور قابلیت جانچنے کے لئے سوال پوچھنے شروع کیے۔

''دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟'' امیدوار نے حساب لگا کر کہا۔

''سات۔'' وزیر اعظم نے کہا۔

''شاباش، اب دوسرے سوال کا جواب بھی ٹھیک دو تو تم کامیاب سمجھے جاؤ گے۔''

''وہ کون سا جانور ہے جس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور جو بھونکتا ہے؟'' امیدوار نے تھوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا۔

''طوطا۔''

لیکن اس کی یہ ترکیب نہ چلی، درباریوں نے مبارک سلامت کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا اور دھوم دھام سے شادی کر کے راج کماری سے گلوخلاصی کرائی۔

شادی کے متعلق حکماء کا قول ہے، کہ جو کرے پچھتائے جو نہ کرے پچھتائے۔ یہ ایک حلقہ ہے کہ ہر باہر والے اندر جانے کے لئے بے چین ہیں اور اندر والے باہر نکلنے کے لئے مضطرب، عام لوگوں کے لئے شادی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا ایک دن مقرر ہے، چاہے نیند رات بھر آئے یا نہ آئے، آج تم کل ہماری باری ہے۔

اشتہاری شادی میں شروع میں دونوں طرف خلوص زوروں پر ہوتا ہے، نہ صرف خط و کتابت بلکہ بیشتر حالات بھی صیغہ راز میں رہ جاتے ہیں، رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہے کہ دلہن صاحبہ ویسے ٹھیک ہیں، لیکن گنجی ہیں اور دولہا صاحب جو کالی عینک لگائے رہتے ہیں نقطہ نظر کے لحاظ سے موحد ہیں، ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں، بیوی بے شک کھری سیدزادی ہے لیکن ان کے دادا کا بریلی میں ہیئر کٹنگ سیلون تھا، دولہا صاحب البتہ مغل ہیں، بیوی جن کو ان کے ظفر السلت والدین بے بی کہہ کر یاد کرتے ہیں، پہلی جنگ عظیم کے واقعات کی چشم دید گواہ ہیں اور میاں آٹھوں گانٹھ کمیت ہیں، لیکن ان کی ڈگری تقسیم کے ہنگامے میں ہندوستان میں رہ گئی، انگریزی بولنے، لکھنے پڑھنے سے احتراز ایسا اختیاری بھی نہیں جیسا کہ بتایا تھا، اردو کی محبت کے علاوہ اس کی اور وجہیں بھی ہیں۔

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
زیست نے ہم سے بے وفائی کی

یہ خیال کرنا غلط ہو گا کو ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہو سکتیں، بلکہ زیادہ کامیاب یہی ہوتی ہیں، دونوں طرف آگ برابر لگی ہوتی ہے، دونوں کے خضاب کی مدت ایک وقت ختم ہوتی ہے، دونوں کے صیغہ راز سے ایک ساتھ پردہ اٹھتا ہے، نتیجہ یہ کہ داستانوں کے کرداروں کی طرح بقیہ عمر ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں، اس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

☆☆☆

ایک دن حنا کے ساتھ

عمارا امداد

ڈیئر قارئین اور فوزیہ آپی! آپ سب کو محبت بھرا سلام، کیسے ہیں آپ سب؟ پیاری فوزیہ آپی نے ''ایک دن حنا کے ساتھ'' میں لکھنے کا کب سے کہا ہوا ہے لیکن جانے کیا بات ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے دن رات گزرتے جاتے ہیں، ہر نئے دن خود سے عہد کرتی ہوں کہ اب ضرور کچھ نہ کچھ لکھنا ہے جو ادھوری کہانیاں پڑی ہیں ان کو پورا کرنا ہے یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے لیکن وقت ہے کہ ریت کی مانند پھسلتا ہی رہتا ہے اور پھر جب اپنا احتساب کرنے بیٹھو تو خود سے شرمندگی ہوتی ہے کہ اپنے سے کیے سارے عہد، سارے وعدے پھر ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن خیر اب آپ کی محفل میں آ ہی گئی ہوں تو اتنی جلدی جانے والی نہیں کیونکہ مجھے آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں، اس سلسلے میں لکھنے سے پہلے میں سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں آپ لوگ مجھے جانتے بھی ہیں یا نہیں، ہے کیا کہا؟

میں کون ہوں؟ نہیں نہیں قارئین، ایسے تو نہ کرو۔

چلیں کوئی بات نہیں، اب تعارف ہو جائے گا، سب سے پہلے تو مجھے فوزیہ آپی کا بے حد شکریہ ادا کرنا ہے، آپ کی محبت اور پیار کا شکریہ۔ ابھی فی الحال تو کوئی تیر نہیں مارا ماسوائے چند افسانے لکھنے سے۔ لیکن اب تک جو بھی لکھا ہے یہ آپ کی محبت ہی ہے جو تحریک دیتی رہتی ہے اور جناب میں اوکھی سوکھی قلم چلا ہی لیتی ہوں۔

آج ''ایک دن حنا کے ساتھ'' میں لکھتے ہوئے عجیب سے احساسات ہو رہے ہیں، بے پناہ خوشی کی رمق مجھے اپنے اندر محسوس ہو رہی ہے کہ کیا میں اتنی اہم ہو گئی ہوں کہ اپنے بارے میں لکھوں اور میری پیاری قاری بہنیں اسے پڑھیں، وقت سرکتا ہوا مجھے کئی سال پیچھے لے گیا ہے، مطالعہ کا شوق مجھے شروع سے ہی تھا، میرے ابو مطالعہ کے بے حد شوقین تھے شاید ان سے ہی مجھ میں منتقل ہو گیا یہ شوق، بڑی بہنیں ڈائجسٹ پڑھتی تھیں چنانچہ ان سے چھپ کر میں نے فورتھ کلاس سے ہی ڈائجسٹ پڑھنے شروع کر دیئے تھے، جب ناینتھ کلاس میں تھی تو ایک دفعہ کسی مصنفہ کے شب و روز کے بارے میں پڑھتے ہوئے میری دوست نے کہا کہ کاش ہم میں بھی لکھنے کی صلاحیت ہوتی اور ہم لکھتے تو ہمارے بارے میں بھی چھپتا تو میں نے مذاق سے کہا کہ میرے اندر ایک لکھاری ہے اور ایک دن میں ضرور اپنے بارے میں لکھ رہی ہوں گی تو اس نے کہا کہ ایسی بات ہے تو پھر پہلے ہمیں تو لکھ کر دکھاؤ نا اور میں نے بھی گھر جاتے ہی ذہن و دماغ میں جاری و ساری کہانیوں میں سے ایک لکھ ڈالی، سب دوستوں نے تقریباً پوری کلاس نے ہی پڑھ کر بہت تعریف کی لیکن وہ تو جوش میں لکھ ڈالی تھی، سب دوستوں نے اشاعت کا مشورہ بھی دیا لیکن میں نے سوچا اتنا فضول سا لکھا ہے میں نے میری کہانی کی کہاں اشاعت ہو گی یہ سوچ کر کہانی جلا ڈالی اور لکھنے کا سلسلہ وہیں رک گیا، پھر گریجویشن میں تھی جب ایک دوست کے

سمجھانے پر دوبارہ لکھنے کا شوق ہوا، اس نے کہا کہ لکھ کر بھیجنے میں کیا قباحت ہے؟ بات تو اس کی صحیح تھی تو جناب میں نے پھر لکھنا شروع کیا اور آغاز ہی ایک ناول سے کیا (جو ابھی تک ادھورا ہے) کیونکہ وہ ناول پورا ہونے سے پہلے ہی میری اپنی زندگی کی کہانی شروع ہو گئی۔

گریجویشن کے دوران ہی شادی ہو گئی تو پھر لکھنا تو دور کی بات پڑھنا بھی چھوٹ گیا کیونکہ میرے پیا کے گھر میں جو میری سسرال ہے، لکھنا، مطالعہ کرنا وغیرہ فضولیات کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے اور ڈائجسٹ پڑھنا اس میں سرے فہرست ہے، بمشکل گریجویشن مکمل کیا، بڑے بیٹے کی پیدائش کے بعد مزید مصروفیات بڑھ گئیں لیکن میری کہانیاں، میرے کردار زندگی کے سفر میں میرے ساتھ ساتھ رہے، 2007ء میں سب سے چھپ کر ایک مختصر سا افسانہ لکھ کر ایک میگزین میں بھیجا، یہ میرا پہلا افسانہ تھا اور اس پر انعام بھی ملنا تھا جو کہ مجھے ملا ایک اور افسانہ بھی لکھا اور پھر بریک آ گئی اور اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے چکر میں الجھ گئی، پھر 2009ء میں اپنے ہزبینڈ کے کہنے پر دوبارہ ایک افسانہ لکھا اور ایک ڈائجسٹ میں بھیجا جو اگست 2009ء میں چھپا تھا۔

یہ مہینہ میرے لئے یادگار تھا کیونکہ اس کا آغاز ہونے سے پہلے اللہ نے مجھے دوسرے بیٹے سے نوازا تھا، اس مہینے میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا افسانہ شائع ہوا تھا اور میرا ایم اے اردو اور بی ایڈ کا شاندار رزلٹ آیا تھا، لیکن پھر لکھنے کے سفر کو جاری نہیں رکھ سکی، بیٹے کی پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی میں شدید بیمار ہو گئی تھی کہ زندگی کی ناؤ ہی ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے نئی زندگی دی۔

کہتے ہیں کہ جو چیز جبلت میں ہو آپ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے بالکل ایسا ہی میرے ساتھ ہوا، 2012ء میں پھر ہاتھوں کو کچھ ہونے لگا تو حنا میں افسانہ بھیجا جو اکتوبر میں شائع ہوا، یہاں میں ایک بار پھر فوزیہ آپی کی مشکور ہوں کہ شاید ایک آدھ تحریر کے بعد میں پھر نہ لکھ پاتی لیکن آپ کی محبت نے میری بہت حوصلہ افزائی کی، ہر ماہ جب ادارہ حنا کی جانب سے ڈائجسٹ ملتا تو بہت خوشی ہوتی آپ کی اپنائیت نے یہ احساس دلایا کہ میں کچھ کر سکتی ہوں، اس دوران حنا میں لکھنے کے ساتھ ایک دو اور ماہناموں میں بھی تھوڑا بہت لکھا، ابھی بھی بہت کم لکھ پاتی ہوں لیکن حنا کے ساتھ جو رشتہ استوار ہوا ہے اسے انشاء اللہ جاری و ساری رکھوں گی، یہاں میں اپنے ابو کا ذکر کرنا چاہتی ہوں (جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں) ان کی خواہش تھی کہ میں لکھنا نہ چھوڑوں، ابتداء میں میں نے اپنے ہزبینڈ کے نام سے لکھا لیکن پھر ابو کے نام سے لکھنا شروع کیا کیونکہ یہ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے نام سے لکھوں، وہ کہتے تھے کہ میری بیٹی میرے نام کو زندہ رکھے گی، اللہ تعالیٰ مجھے اپنے ابو کی امیدوں پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

جی تو قارئین آپ سوچ رہی ہوں گی کہ یہ محترمہ تو اپنے ایک دن کی روداد سنانے کی بجائے ماضی کے اوراق کھنگال آئیں تو جناب میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں آ گئی ہوں تو اب اتنی جلدی جانے والی نہیں، یہاں میں آپ سب سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں اور میرا اپنے بارے میں لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اگر آپ میں کوئی صلاحیت ہو تو پلیز اسے یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں میں یہ کر پاؤں گی یا نہیں، ضائع مت کریں اور جو وقت آپ کو میسر ہو اس سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ

ایسا نہ ہو کہ جب آپ کچھ کرنا چاہیں تو آپ کے پاس نہ وقت ہو اور نہ موافق حالات۔

جی تو اب آپ آیئے میرے ساتھ میرے گھر میں، میرے ساتھ آج کا دن ہم اکٹھے گزارتے ہیں۔

صبح پانچ بجے میری آنکھ الارم نمبر ایک سے کھلتی ہے، موبائل پر ٹائم دیکھ کر میں دوبارہ الارم نمبر دو کی آواز تک سو جاتی ہوں، آپ حیران ہو رہی ہوں گی کہ ایک اور دو کا کیا چکر ہے، ایک دفعہ اٹھ کر دوبارہ سونا میرے پسندیدہ کاموں میں سے ایک ہے، البتہ حامد (میرے ہزبینڈ) میری اس عادت سے الرجک ہیں، اب انہیں کیا پتہ اس میں کتنا مزا ہے، رات کو دیر سے سوتی ہوں تو اس لئے بھی صبح نیند عروج پر ہوتی ہے، جی تو جب الارم نمبر دو بجتا ہے تو اسے بند کر کے ابھی غنودگی میں ہی ہوتی ہوں کہ تیسرے الارم کی آواز سن کر ایک دم الرٹ ہو جاتی ہوں، یہ تیسرا الارم میرے ہزبینڈ کی آواز ہے، اٹھ کر سب سے پہلے فجر کی نماز پڑھتی ہوں پھر میں اور حامد واک کرنے جاتے ہیں، وہاں سے آ کر میں کچن میں اور حامد لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتے ہیں، چونکہ صبح کے وقت تینوں باپ بیٹوں کے چہروں پر ''ہلنا منع ہے'' کا سائن بورڈ آویزاں ہوتا ہے اس لئے میری کچن سے کمرے تک خوب پریڈ ہوتی ہے بچوں کو ناشتہ کروا کر لنچ باکس بیگ میں ڈال کر انہیں تیار کرتی ہوں، ساڑھے سات تک بچے اور ان کے بابا جانی آفس اور سکول چلے جاتے ہیں تو یکدم جیسے خاموشی سی چھا جاتی ہے، ان کے جانے کے بعد میں کچن میں آتی ہوں اپنا اور چچا چچی جان (ساس، سسر) کا ناشتہ بناتی ہوں، ناشتہ کرنے کے بعد میں کمرے میں آتی ہوں، آج کل ورزش کا شوق چڑھا ہوا ہے وہ کرتی ہوں پھر

کچن میں آ کر کچن سمیٹتی ہوں اگر کپڑے دھونے ہوں تو ساتھ ہی مشین بھی لگا لیتی ہوں، اتنے میں کام والی آنٹی آ جاتی ہیں، ان کے ساتھ مل کر صفائی کرواتی ہوں، ان کے جانے کے بعد سبزی لے کر چچی جان کے پاس بیٹھ جاتی ہوں، ساتھ ساتھ ہم باتیں کرتی ہیں اور ساتھ ہی سبزی بھی بن جاتی ہے، پھر کھانا بناتی ہوں تقریباً ایک بجے تک کھانا بنا کر چچا جان کو دے کر فارغ ہو جاتی ہوں، ایک سے دو بجے تک چھوٹے موٹے کوئی کام ہوں وہ کرنے کے ساتھ ساتھ کہانیوں اور کرداروں کو بھی سوچتی رہتی ہوں، سوچنے کی بہت شوقین ہوں اس لئے فارغ وقت میں یہی مشغلہ ہے، ساتھ ساتھ موبائل پر فیس بک پر تانکا جھانکی تو سارا دن چلتی ہی رہتی ہے، دو سے سوا دو تک اسید اور طہٰ سکول سے آ جاتے ہیں تو میں اپنے شہزادوں کے نخرے اٹھانے میں مصروف ہو جاتی ہوں۔

انہیں چینج کروا کر کھانا کھلا کر نماز پڑھتی ہوں، تین سے چار تک بچوں کا کارٹون دیکھنے کا ٹائم ہوتا ہے، یہ ایک گھنٹہ میں فارغ ہوتی ہوں اگر رات کو دیر تک جاگی ہوئی ہوں تو سو جاتی ہوں ورنہ کوئی اور کام کر لیتی ہوں، حامد لنچ ساتھ ہی لے جاتے ہیں چنانچہ ان کے آنے سے پہلے میں بھی دوپہر کا کھانا کھا لیتی ہوں، چار بجے حامد آفس سے آ جاتے ہیں، تھوڑی دیر ان سے گپ شپ کرتی ہوں پھر بچوں کو پڑھانے کا ٹائم ہو جاتا ہے، دونوں بیٹوں کو خود ہی پڑھاتی ہوں، تقریباً سات بجے تک پڑھتے ہیں، ساتھ ہی شام کی چائے بھی پی لی جاتی ہے اس کے بعد بچوں کے صبح کے لئے یونیفارم اور دیگر کپڑے وغیرہ استری کرتی ہوں، پھر رات کا کھانا بنا کر کچن سمیٹ کر جب فارغ ہوتی ہوں تو نو بج چکے ہوتے ہیں، ہمارے گھر میں سب جلدی سو جاتے ہیں ماسوائے میرے، بچوں کو سلا کر نماز پڑھ کر دس بجے تک میں بالکل فارغ ہو جاتی ہوں، ہر سو خاموشی چھا جاتی ہے، رات دس سے صبح پانچ تک یہ ٹائم میرا ہوتا ہے، اس میں مجھے سونا بھی ہوتا ہے اور کچھ لمحے اپنے ساتھ بھی گزارنے ہوتے ہیں، اب میں اپنا لیپ ٹاپ کھولتی ہوں، تھوڑی دیر فیس بک پہ وقت گزار کر اب اپنی منی لائبریری کھولتی ہوں۔

(حامد نے میرے کتابوں والے فولڈر کا نام منی لائبریری رکھا ہوا ہے) میں نے انٹرنیٹ سے بے شمار کتابیں، ڈائجسٹ وغیرہ ڈاؤن لوڈ کر رکھے ہیں اور بھی جو اچھی اور نئی چیز مل جائے فوراً ڈاؤن لوڈ کر لیتی ہوں، یہ اور بات کہ پڑھنے کا ٹائم کم ہی ملتا ہے، لیکن انہیں دیکھ دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہتی ہوں اور حامد کا شکریہ ادا کرتی رہتی ہوں کہ جن کے تعاون نے میرے لکھنے اور پڑھنے کے شوق کو زندگی کے جھمیلوں میں گم نہیں ہونے دیا بلکہ زندہ رہنے دیا، اس کے علاوہ اچھا میوزک سننے کی بے حد شوقین ہوں یہ شوق بھی پورا اسی وقت کرتی ہوں اور جو بھی تھوڑا بہت لکھتی ہوں وہ رات میں ہی لکھتی ہوں، عموماً بارہ سے ایک بجے تک سو جاتی ہوں کیونکہ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے، اس لئے ایک چھوٹا سا افسانہ بھی کئی کئی دن ادھورا پڑا رہتا ہے اور تسلسل ٹوٹ سا جاتا ہے لیکن جب موڈ ہو تو پھر ایک ہی رات میں پورا کر لیتی ہوں۔

آخر میں ادارہ حنا اور قارئین کا بے حد شکریہ جو میری مختصر سی تحریروں پر بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، آپ سب کی محبتیں میرا قیمتی سرمایہ ہے، آج آپ سے ڈھیر ساری باتیں کر لیں، خوش رہیں اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆☆☆

فوزیہ احسان

سونیا رحمان کے سان و گمان میں بھی کہیں یہ بات نہیں تھی کہ زندگی میں بھی اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے، سونیا رحمان جیسی مضبوط کردار لڑکی جس کے ارادوں کی پختگی سے پورا خاندان آگاہ تھا جو اپنی بہنوں اور بھائیوں کے لیے جتنی رحم دل اور مخلص تھی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی اس کی اچھائی اور صلہ رحمی کا پورا زمانہ معترف تھا اس کی خوبیوں اور اس کی قابلیت کو ہمیشہ سراہا گیا تھا۔

سونیا رحمان خاندان کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، حسین تھی پہننے اوڑھنے کا سلیقہ رکھتی تھی زندگی کو بہت رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے گزارنے والی سونیا رحمان یوں حالات کا شکار ہو سکتی تھی کون ایسا سوچ سکتا تھا اور کون ایسا چاہ سکتا تھا۔

سب اس کی صلاحیتوں کے قدر دان تھے سب اپنی بیٹیوں کو سونیا رحمان کی تقلید کرنے کی تلقین کرتے تھے سونیا رحمان ایک مثال تھی روشنی کا ایسا مینار جو سب کو روشنی بانٹ رہا تھا۔

سویرا رحمان، اجالا رحمان، سونیا رحمان اور

صوبیہ رحمان اپنی بیوہ ماں کی چار بیٹیاں تھیں وہی مڈل کلاس گھرانوں والی مخصوص تنگدستی، زندگی بہت مشکل نہ تھی مگر اس گھرانے کی ہمت سے زیادہ تو نہیں تھی، اوپر تلے کی لڑکیاں تھیں سویرا بڑی جبکہ سونیا اس سے چھوٹی تھی بڑی دونوں بہنوں نے میٹرک سے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی تھی سویرا اور سونیا ساتویں اور آٹھویں میں تھیں جب رحمان کا انتقال ہوا تھا گھر اپنا بنا ہوا تھا رحمان کا کچھ بینک بیلنس تھا جس سے ایک ڈیڑھ سال تک گھر کا خرچ چلتا رہا۔

سویرا کی ماموں کے بیٹے سے بچپن کی منگنی تھی جیسے ہی سویرا نے میٹرک کیا ماموں نے سادگی سے نعمان اور سویرا کا نکاح کروا دیا اور سویرا کو رخصت کروا کر اپنے گھر لے گئے، عابدہ بیگم نے سکھ کی سانس لی۔

سونیا رحمان نے اپنے سب نازک جذبات اور خواہشات کو تھپک تھپک کر سلا دیا فسٹ ائیر سے ہی سونیا نے اپنے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے کمزور کندھوں پر اٹھا لیں سودا سلف، بجلی و گیس کے بل کی ادائیگی، شام میں لوگوں کے گھروں میں پڑھانے جانا، کالج سے چھٹیاں کر کے لوگوں کے کپڑے سلائی کرنا، وہ اپنی ماں کی تابعدار بیٹی تھی اپنی بہنوں سے بہت پیار کرتی تھی بساط بھر ان کی خواہش پوری کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی صوبیہ اور اجالا بھی بہت قناعت پسند تھیں بے جا خواہشیں پالنا یا حرص و طمع میں مبتلا ہونا ان کی فطرت میں شامل ہی نہیں تھا۔

سونیا نے کمیٹی ڈال لی تھی جب تک سونیا نے ایف اے کیا تب تک شومئی قسمت اس کی کمیٹی بھی نکل آئی سونیا بے تحاشا خوش ہوئی احساس تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

سونیا نے ایک لاکھ کا فرنیچر بنوا کر (جس میں بنچیں، کرسیاں اور ایک میز اور کچھ دوسری ضرورت کی چیزیں) گھر کے ایک کمرے میں اکیڈمی کھول لی تھی، اس نے بے تحاشا محنت کی تھی پرائیویٹ بی اے کیا، بی ایڈ کیا، اکیڈمی کی ابتدا اس نے ابتدائی کلاسز سے کی تھی پھر آہستہ آہستہ بڑی کلاسز کے بچے بھی اکیڈمی میں آنے لگے تھے گھر کے حالات بدل رہے تھے عابدہ اپنی بیٹی پر فخر محسوس کرتی تھیں۔

سونیا نے انگلش لینگویج کا کورس کیا کمپیوٹر کورسز کیے، سونیا رحمان کی اکیڈمی شہر کا جانا مانا ٹیوشن سنٹر بن گیا تھا، قابل ٹیچرز سونیا رحمان کے ہاں پڑھانے آتی تھیں۔

سونیا رحمان کی زندگی میں محبت کی یا مرد کی جگہ کہیں نہیں تھی اور سونیا رحمان کی زندگی اتنی مصروف گزر رہی تھی کہ وہ نام نہاد عشق عاشقی کے چکروں میں پڑی ہی نہیں تھی اور ایسی خرافات میں وہ پڑنا چاہتی بھی نہیں تھی، اس نے اپنے اندر نرمی اور حلاوت و ملائمت کو چھپا کر اپنے اوپر سختی اور مضبوطی کا خول چڑھا لیا تھا، اس کی ذات کے اندر جھانکنا کسی مرد کے بس کی بات نہیں تھی سونیا رحمان نے اپنی ذات کے اردگرد ایسی فصلیں کھڑی کر لی تھیں کہ ان کو پاٹنا ناممکنات میں سے تھا۔

اکیڈمی میں قابل اعتماد ٹیچرز تھیں اللہ نے اپنی رحمتوں سے ایک ایک کر کے سارے مسئلے حل کر دیئے تھے سونیا کی ان تھک محنتوں اور ریاضتوں کا صلہ مل رہا تھا جس اکیڈمی کو کامیاب بنانے کے لئے سونیا رحمان نے دن رات لگن اور دلجمعی سے کام لیا تھا وہاں سے بھی خدا نے اس کی کاوشوں کے بدلے بے پایاں نواز دیا تھا سونیا لاکھوں روپیہ کمانے لگی۔

صوفیہ کا بہت اچھی جگہ رشتے طے پا گیا تھا

دو ماہ کے اندر اندر اس کی شادی کردی گئی، عابدہ کا سر فخر سے تن گیا پورا خاندان سونیا کی تعریفوں میں رطب اللسان تھا ہر آنکھ میں ستائش تھی ہر زبان سے شہد ٹپک رہا تھا سونیا رحمان کی ذمہ داری اور نیکی کی مثالیں دی جانے لگیں، اس نے صحیح معنوں میں بیٹی ہونے کا حق ادا کردیا تھا بیٹا بن کر دکھایا تھا سارا بوجھ اٹھالیا تھا۔

سونیا رحمان نے ایم اے انگلش کے لئے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا یہیں اس کی ملاقات عاشر رضوی سے ہوئی تھی وہ فائنل ائیر میں تھا آتے جاتے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی تھی عاشر اسے سلام کرتا تو وہ بھی جواباً سلام کرلیتی تھی۔

یونیورسٹی میں اور بھی کچھ لڑکوں نے سونیا رحمان سے ہیلو ہائے سے آگے بات بڑھانے کی کوشش کی تھی مگر سونیا رحمان کا دوٹوک اور خشک رویہ دیکھ کر اپنی جگہ چپکے رہ گئے۔

مگر عاشر رضوی کو وہ بے حد پسند آگئی تھی سادہ طبیعت مگر کٹھوری سی خوبصورت طرحدار مگر بے نیازسی اپنے اطراف کے ہلے گلے اور سٹائل و فیشن سے قطعی بے خبر، اپنی دنیا میں گم پُراعتماد مضبوط لڑکی۔

☆☆☆

امی نے سونیا کو بتایا تھا کہ ماموں کے توسط سے اجالا کا بھی رشتہ آیا ہے سونیا بہت خوش تھی۔

”امی جی آپ ماموں کے ساتھ مل کر ان لوگوں سے مل لیں اور ماموں جی سے ساری معلومات بھی کروالیں، میں بھی اپنے طور پر پتہ کرواؤں گی کہ لڑکا کیسا ہے خاندان کیسا ہے باقی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں سب ٹھیک ہی ہوگا۔“

سونیا ہمیشہ اپنی ماں کو ایک ماں کی طرح طفل تسلیاں دیتی تھی۔

”جی بیٹا! میں بھائی سے مل کر تفصیلی بات کرتی ہوں۔“ عابدہ، سونیا کی پہلے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر ایک تو وہ مانتی ہی نہیں تھی دوسرا سارا گھر اس کی کمائی سے ہی چلتا تھا اس حقیقت سے لاکھ نظریں چراتیں مگر عابدہ بخوبی آگاہ تھی کہ یہی حقیقت ہے بھلے تلخ ہی سہی۔

☆☆☆

اجالا کی بھی شادی ہوگئی ماموں نے بہت ساتھ دیا تھا ایک بار پھر پورے خاندان والوں کی زبان سونیا کی بڑائی کی تعریفیں کرتے ہوئے سوکھ رہی تھی اس کے ایثار کی داد دی جارہی تھی اس کی صلہ رحمی کو دل و جان سے سراہا جارہا تھا، سونیا رحمان سے خاندان کی لڑکیاں تو لڑکیاں، لڑکے بھی خار کھانے لگے تھے دل میں سونیا رحمان کے لئے کدورت رکھنے لگے تھے کیونکہ ہر گھر میں نکھٹو اور فارغ رہنے والوں کو سونیا کی مثال دی جاتی تھی ہر جگہ سونیا رحمان کے چرچے تھے۔

کچھ وقت اور سرکا سونیا امتحانات کے بعد آج کل پورا وقت اکیڈمی کو دے رہی تھی۔

ایک دن عاشر رضوی نے سونیا کی کلاس فیلو لڑکی سے اس کا نمبر لے کر کال کی تھی سونیا حیران ہوئی عاشر رضوی اپنے ماں باپ کے ساتھ آنا چاہ رہا تھا سونیا نے عاشر کی بات عابدہ سے کروادی سونیا اب شادی کرنا چاہتی تھی اب وہ اپنی ساری ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھا چکی تھی، اگر امی اور ماموں کو عاشر اور اس کا خاندان پسند آجاتے تو سونیا کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

ماموں نے کہا تھا کہ سونیا کی شادی کے بعد وہ عابدہ کو اپنے گھر لے جائیں گے گھر رینٹ پر اٹھادیں گے۔

ضروری چھان پھٹک اور رسمی کارروائیوں کے بعد عاشر اور سونیا کی منگنی ہوگئی تھی عاشر بہت

خوش تھا سونیا بھی اپنی جگہ مطمئن تھی عاشر میں اس کے کوئی اخلاقی برائی نہیں دیکھی تھی خاندان بھی اچھا تھا۔

عاشر کبھی کبھی سونیا کو فون کر لیتا تھا وہ بھی کچھ سوچ کر بات کرتی تھی، کہ ان دونوں کے درمیان مستقبل میں ایک پاکیزہ و مقدس رشتہ طے ہونے والا تھا جس کی شروعات منگنی جیسے بندھن میں بندھ کر ہو چکی تھی وہ کوئی جواز کیسے تلاش کرتی بات کرنے سے انکار کرنے کا۔

زندگی پرسکون ہوگئی تھی سارے مسائل حل ہو گئے تھے مگر کبھی کبھی ہوتا ہے نا ایسا کہ ہمارا ہونا جہاں بہت ... سے لوگوں کی ذات کے لئے سکون ہوتا ہے مسیحائی و رہنمائی ہوتا ہے وہی ہمارا ہنر ہماری قابلیت دوسروں کے لئے راہیں کھول دیتا ہے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے وہی ہمارا ہنر، ہماری قابلیت ہماری قسمت اور مقدر سے مات کھا جاتے ہیں اور ہم الٹی بساط کو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

عاشر رضوی اٹھتے بیٹھتے اپنے گھر میں سونیا رحمان کی پارسائی کے گن گاتا سونیا کے سلیقے اطوار سے وہ بہت متاثر تھا وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت انسان مانتا تھا عاشر کا چھوٹا بھائی ناظر لڑکیوں کے معاملے میں بہت بڑا کھلاڑی تھا حد سے زیادہ کھلنڈر اور فارغ رہنے والا لڑکا، عاشر کی زبانی کسی انجانی و بے گانی لڑکی کی اتنی تعریفیں اس کے اندر جلن پیدا کرنے لگیں ابھی وہ گھر آئی نہیں تو یہ حال ہے جب بھابی بن کر گھر آ جائے گی تب تو بھائی ایسے دیوانے ہو جائیں گے کہ سب بھول جائیں گے۔

ناظر نے ایک دن موقع دیکھ کر عاشر کے سیل فون سے سونیا رحمان کا نمبر نکال لیا اور اسے کال میسج کرنے شروع کر دیئے مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی مجال ہے کوئی کال پک کی ہو یا کسی میسج کا رپلائی کیا ہو، یا یہ تک پوچھا ہو کہ آپ کون ہو، ناظر دو ہفتوں سے مسلسل اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا مگر مجال ہے کہ اسے رتی برابر بھی آگے سے کوئی مثبت رسپانس ملا ہو۔

پھر جب وہ اس کھیل سے اکتانے ہی لگا تھا کہ وہ ہو گیا جس کی امید ناظر کو قطعی نہیں ہوا کچھ یوں کہ ایک رات اس نے دو تین ایسے میسج سونیا رحمان کو بھیجے جس سے مقابل لڑکی بھڑک اٹھے اور سونیا رحمان بھی بھڑک اٹھی تھی اس نے یہی پر غلطی کی ایسی غلطی جو آنے والے دنوں میں اس کی خطا بن کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور اس سے سب خوشیاں چھین لی گئیں۔

سونیا نے انتہائی طیش کے عالم میں کال کی تھی ناظر کو خوب لعن طعن کی تھی اس کا لہجہ ترش تھا اور الفاظ بہت سخت تھے وہ بولتی رہی ناظر سنتا رہا خاموش رہا۔

''دیکھیں میں نے آپ کو کوئی میسج نہیں کیا۔'' ناظر ٹھنڈے ٹھار لہجے میں انکاری ہوا اس کا مقصد سونیا کو مزید اشتعال دلانا تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' سونیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لڑکا سامنے ہو تو اس کا سر ہی پھاڑ ڈالے۔

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو کوئی میسج نہیں کیا، آپ جھوٹ بول رہی ہو۔'' وہ اسے ... رہا تھا اس کے تلملانے سے حظ اٹھا رہا تھا سونیا تپ گئی اور ایسی غلطی کی کہ.....؟

سونیا رحمان نے ناظر کے سارے میسج اسے واپس سینڈ کر کے ایک بار پھر اس کی بے عزتی کی اسے خوب برا بھلا کہا اور سیل فون بند کر دیا۔

دوسری طرف ناظر اپنی ان بکس میں سونیا

رحمان کے در کو میسج پڑھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا پھر وہ ہنسا اور پھر ہنستا چلا گیا۔

☆☆☆

عاشر رضوی نے سونیا رحمان سے اپنی منگنی توڑ دی تھی سارے خاندان میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں وہی خاندان جو سونیا رحمان کی شان میں قصیدے پڑھتے نہیں تھکتے تھے اب ان کی نظروں میں تمسخر تھا اور ہونٹوں پر طنز کے کانٹے اُگ آئے تھے جو سونیا رحمان کو لہولہان کرتے رہتے تھے عاشر کے گھر والوں نے کہا تھا کہ ہم مجبور ہیں عاشر سونیا سے شادی نہیں کرنا چاہتا، سونیا شدید صدمے کی کیفیت میں تھی، وہ عجیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

''عاشر تم نے خود اپنی چاہ سے مجھ سے رشتہ طے کیا اور خود ہی سارے فیصلے کر لئے بغیر کسی وجہ کے رشتہ توڑ دیا کیوں آخر، مجھے وجہ بتاؤ۔'' ایک دن وہ پھٹ پڑی فون کر بیٹھی جبکہ وہ بات خود سے بھی نہیں کر رہی تھی۔

''تم سے رشتہ جوڑنے کی ... تھی کہ مجھے لگا تم منفرد اور مضبوط کردار لڑکی ہو مگر یہ میری خام خیالی تھی، تم انتہائی گری ہوئی لڑکی ہو میرے ہی چھوٹے بھائی کے ساتھ، اُف، کیسے میں اٹھتے بیٹھتے گھر میں سونیا رحمان کے گن گاتا تھا اب گھن آتی ہے مجھے تم سے، کیسے کرتا تم سے شادی، جبکہ میرے بھائی کے ساتھ تمہارا کیسا تعلق ہے، یہ تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔'' عاشر کیا کہہ رہا تھا سونیا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی چند ماہ پہلے چاہنے والا مرد بدگمان ہو چکا تھا حقارت سے بات کر رہا تھا سونیا نے کوئی صفائی کوئی وضاحت نہیں دی تھی بس گم صم دوبارہ وہی میسج پڑھ رہی تھی جو ناظر نے اسے اور اس نے دوبارہ ناظر کو کیے تھے اور اب وہی عاشر نے اسے بھیجے تھے۔

بات سونیا رحمان کی سمجھ میں آ چکی تھی مگر وہ اپنی اور اپنے کردار کی صفائی دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہی تھی اور وہ صفائیاں دینا بھی نہیں چاہتی تھی۔

''اوہ میرے خدا میری ذرا سی خطا میری عمر بھر کی نیکیاں کھا گئی۔'' سونیا رحمان جو کبھی روئی نہ تھی آج صحن کے بیچوں بیچ ٹکڑے ٹکڑے پھوٹ پھوٹ کر رو دی روتی رہی پھر صحن کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

''میری معمولی سی بھول نے میری ساری جوانی کی نیک نامیوں کو نگل لیا میرا کردار میرا ماضی صاف شفاف آئینے کی مانند ہے اور عاشر نے میرے کردار پر انگلی اٹھائی مجھ سے حقارت بھرے انداز میں بات کی، میں ساری زندگی کی کمائی، میرا ایثار، میرا خلوص ذرا سی نادانی نے چاٹ لیا۔'' سونیا رحمان جیسی مضبوط لڑکی دھاڑیں مار مار کر روتی رہی کرلاتی رہی۔

''میری بچی میری جان دنیا عاشر پر تو ختم نہیں ہو گی اللہ پر بھروسہ رکھ میرے بیٹے میری لاڈلی کو بہت اچھا بر ملے گا بہت نیک ہے میری سونیاں۔'' عابدہ نے اسے یوں بلک بلک روتے دیکھا تو لپک کر پاس آئیں۔

''میں عاشر کے لئے نہیں رو رہی اور میں شادی کے لئے بھی نہیں رو رہی میں تو اپنی بھول پر رو رہی ہوں جس نے مجھے لاجواب کر دیا تھی داماں بے آسرا کر دیا میں ثابت نہیں کر سکی اپنی بے گناہی۔'' عابدہ کو وہ کہنا چاہتی تھی مگر صرف سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

نایاب جیلانی

دوسری قسط کا خلاصہ

پلوشہ امام فرید کی چاہ میں پھپھو کے گھر تک چلی آتی ہے جہاں پلوشہ اسے بتاتی ہیں کہ امام اپنے آفیشل ٹور پر گیا ہے۔

اسامہ کو منگورہ کے آس پاس کے علاقے سے ایک مجسمہ ملتا ہے، اسامہ اس خوشی میں پل پر سے گزرتے ہوئے اس کا ٹکراؤ مورے کی بیٹی عشیہ سے ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اسامہ کے ہاتھ سے وہ تاریخی مجسمہ اور عشیہ کے ہاتھ سے دوائیوں کا نسخہ دریا میں گر جاتا ہے۔

احسان منزل میں نشرہ کی ایک بار پھر شامت آئی جب تائی نے فروٹ چوری کا الزام نشرہ پر لگایا اور مار پیٹ کی، ولید یہ تمام مناظر دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور پھر تمام بات سن کر وہ تائی کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتا ہے جہاں تائی صائمہ کا بیٹا نومی دوستوں کے ساتھ بیٹھا فروٹ کھا رہا ہوتا ہے۔

ولید دوستی کا نشان بناتا نشرہ کی طرف دیکھتا ہے، نشرہ کو تشکر بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے وہ مسکرا دیتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

تیسری قسط

اس نے زندگی میں ایسی گھبراہٹ کا مزہ نہیں چکا تھا۔
دل کے اندر عجیب سی لہریں اٹھ رہی تھیں، یہ لہریں گھبراہٹ کی تھیں؟ اضطراب کی تھیں، بے چینی کی تھیں؟ ان لہروں کی لذت کا عشیہ کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا، وہ کیسا لطف محسوس کر رہی تھی؟ یا کسی لذت اندر اتر رہی تھی۔
بس ایک احساس رگ و جاں کو مسرور کر رہا تھا، اس احساس کا نام اسے سمجھ نہیں آیا تھا، دراصل اس کے وجود پہ جو کیفیات اتری تھیں ان کا ذائقہ اس کے لئے قطعاً نا آشنا تھا، وہ بے خود ضرور تھی، اس دل نشین احساس کی وجہ سے خود کو تتلی کے پر سے بھی زیادہ ہلکا محسوس کر رہی تھی تاہم اتنی انجان بھی ہو گی؟ یہ اندازہ اسے ابھی ابھی ہوا تھا، وہ اپنی ہر کیفیت پہ روٹھی سی ہو رہی تھی، بس یوں لگ رہا تھا، اس کا بایاں پہلو اچانک خالی ہو گیا۔
یہ واردات اچانک ہوئی تھی اور عشیہ اس پہلے پہلے ''تجربے'' کے اثر میں شدید گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔
اس وقت منگورہ پہ رات اتر رہی تھی۔
آج چاند کی چودہویں تاریخ تھی اور گزشتہ رات شب برات تھی، منگورہ کی نیم سیاہ پہاڑیوں میں کہیں کہیں جگنو سا چمکتا تھا، جو پل بھر میں معدوم ہو جاتا، جیسے کوئی منچلا پھلجڑی سے شغل فرما رہا تھا، جب وہ بے خودی کے عالم میں منگورہ کا آخری پل عبور کر رہی تھی تب اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا، وہ کسی جنونی کیفیت میں چل رہی تھی جو اسے اتنی بھی خبر نہیں ہو سکی تھی کہ منگورہ کی آبادی دور بہت دور رہ چکی ہے۔
وہ آخری پل کے کنارے پہ کھڑی تھی، منگورہ کی آبادی یہاں ختم ہو جاتی تھی، آگے تاریکی اور گھور اندھیرا تھا اور آواز بس دریا کے شور کی تھی، عشیہ کا دل خوف کے عالم میں کپکپا کر رہ گیا۔
اس اجنبی نے عشیہ پہ پہلی ملاقات میں کیسا اسم پھونک دیا تھا جو وہ اپنی سدھ بدھ بھلائے حواسوں میں نہیں تھی اور اتنی غائب دماغی بے خود اور انجان ہو چکی تھی جو اسے آبادی سے بہت دور چلے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔
فی الوقت تو اسے دوائیوں والا نسخہ بھی بھول چکا تھا، مورے کا خوف بھی بھول چکا تھا، یاد تھا تو بس اس قدر کہ وہ اپنے تین منزلہ مکان تک پہنچ کر پھر بڑی بے خودی کے عالم میں دوبارہ انہی رستوں پہ اندھا دھند بھاگی تھی جہاں اسامہ جہانگیر نامی اجنبی سے سخت قسم کا تصادم ہوا تھا۔
وہ اتنی بے خودی کے عالم میں تھی جو اس پل کے پار اتر کر سناٹوں کے گھیرے میں چلی آئی۔
اور اب عشیہ کے اندر ہراس اور خوف کے علاوہ دوسرا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا، وہ مہیب اندھیرے میں بھی اندازہ کر سکتی تھی کہ یہ ''فضا گھٹ'' کا پر فضا مقام تھا۔
وہی ''فضا گھٹ'' جہاں سفید ماربل کا ایک حسین ''ہٹ'' موجود تھا، جس کے دائیں طرف قدرتی آبشار اترتی تھی جس کا ٹھنڈا شفاف پانی ''ہٹ'' کے باغیچے سے گزرتا تھا، یہ حسین ''ہٹ'' اپنے مالک کی پرسنالٹی جیسا بارعب اور شاندار تھا۔

عشیہ عموماً سیاہ جیپ میں اس ہٹ کے مالک کو دیکھتی رہی تھی، وہ بہت خوبصورت، باوقار، شاندار شخصیت کا مالک تھا، اپنے حلیے اور وضع قطع سے بہت الگ اور منفرد لگتا، گو کہ وہ پہاڑی مرد تھا پھر بھی یہاں کا رہائشی لگتا نہیں تھا، بڑے شہروں اور ترقی یافتہ بڑے ملکوں کا پروردہ تھا، سو ظاہری حلیے سے بھی بہت ماڈرن اور لبرل لگتا۔

عشیہ مبہوت سی اس ''ہٹ'' کے پار اترتی آبشار کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

گو کہ قدرتی مناظر کی یہاں کمی نہیں تھی پھر بھی ہر منظر کا سحر لمحہ بھر کے لئے فریز ضرور کر دیتا تھا۔

یہاں سے کچھ فاصلے پہ پولیس چیک پوسٹ ضرور تھی تاہم کسی سواری کا ملنا ناممکن سے کم نہیں تھا، وہ مین روڈ تک پیادہ پا بھی چلی جاتی تب بھی واپس اپنے گھر جانے میں گھنٹہ بھر در کارتا اور اتنی دیر سے گھر جانے کا مطلب تھا مورے کا غصہ سہنا اور عتاب کا شکار ہونا، اوپر سے دوائیوں والا نسخہ بھی ندی میں گرا چکی تھی، اس کی ماں بڑی سخت قسم کی عورت تھی، انتہائی غصہ ور، کچھ بدمزاج اور بے حد سرد و سپاٹ، ذرا سی غلطی پہ اتنی جوان اولاد کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتی تھی، سو عشیہ کا مورے سے خوف کھانا تو بنتا تھا۔

اور اس وقت کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ پولیس سے مدد نہ لیتی، کیونکہ سڑک بھی بیریئر سے باک تھی، بیریئر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ''فضا گھٹ'' تھا جو اس وقت نیم اندھیرے کی ملمع سازی کا شکار تھا۔

نیم گھٹ اور فضا گھٹ کا بڑا دلچسپ سنگم تھا، یہ ایک پر فضا پارک تھا جو دریائے سوات کے کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔

عشیہ بہت دفعہ بیام کے ہمراہ اور اکیلی اس کے راستوں اور سیڑھیوں پہ چلتی اور چڑھتی تھی، لیکن اس وقت بہت اندھیرا تھا اور دریا کا شور سروں میں سنا جاتا تھا اور ایک تیز ہوا بھی چلتی تھی جس سے لطف اندوز ہونے کا فی الحال نہ مناسب وقت تھا اور نہ موقع۔

اور ابھی وہ پولیس چوکی تک جانے کا رسک لینے والی تھی جب ہٹ کے داخلی پھولدار بیلوں سے ڈھکے ڈور فریم سے کوئی تیزی سے باہر نکلتا دکھائی دیا تھا۔

عشیہ بہت دور سے بھی آنے والے کو پہچان گئی تھی، وہ اس ہٹ کا وہی مغرور مالک تھا، عشیہ لمحہ بھر کے لئے تھم سی گئی۔

وہ نیلی جینز پہ سیاہ جیکٹ پہنے ہوئے تھا، جوگرز شاید سفید تھے، وہ پتھروں پہ بڑی مشاقی سے چل رہا تھا، عشیہ کو اس کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی، وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی تھی، پھر بھی آگے بڑھتا وہ مغرور آدمی لمحہ بھر کے لئے رک گیا، مہیب خاموشی میں اسے کسی کی پر خوف سانسوں کی آواز نے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اپنی تیز سماعتوں سے کسی کی سرسراہٹ نما آواز کو سنتا رہا۔

پھر اس نے گردن موڑ کر اندھیرے میں دیکھا، پل کے آخری کنارے پہ ایک سہما ہوا ہیولا موجود تھا، اس کے ہٹ سے چند فرلانگ دور، آخر کس اجنبی کی ایسی جرأت تھی جو اس کے ہٹ کی

چہار جانب یا اطراف میں رات کے مہیب سناٹوں میں دکھائی دیتا؟ کیا کوئی چور اچکا یا ڈکیٹ تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لئے تھم سا گیا، سفید پیشانی پہ ناگوار لکیریں ابھر آئی تھیں، اس نے لب بھینچ کر ہیولے کی طرف سفر کرنا شروع کیا، وہ تیسرے ہی لمحے ہیولے کے بالمقابل موجود تھا، اسے اتنا قریب دیکھ کر عشیہ کی چیخ نکل گئی تھی، وہ جو جارحانہ انداز میں ہیولے پہ حملہ آور ہونے کے قریب تھا نسوانی چیخ کی آواز سن کر رک گیا تھا، لیکن یہ رکنا لمحاتی تھا، دوسرے ہی پل اس نے نسوانی ہیولے کی گردن دبوچ لی۔

وہ سمجھ گیا تھا، ڈکیٹ مرد نہیں، ایک عورت تھی، ایسے علاقوں میں چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والی عورتیں اور تیز طرار اسمگلر عورتیں ضرور دکھائی دیتی تھیں، کچھ عورتیں ڈرائی فروٹس اسمگل کرتی تھیں، کچھ لکڑی اسمگل کرواتی تھیں، کچھ چرس اور ہیروئن کا کام کرواتیں اور کچھ پیشہ ور طوائفیں بھی رات کی تاریکی میں ٹکرا جاتی تھیں، اب اندازہ یہ لگانا تھا، سامنے موجود عورت اسمگلر تھی یا کال گرل؟

''چھوڑو مجھے۔'' عشیہ کا تکلیف کے مارے دم گھٹ رہا تھا، آہنی ہاتھ کا دباؤ یکدم بڑھ گیا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے دہاڑ کر پوچھا۔

''میں عشیہ ہوں، چھوڑو مجھے، ہائے جان لو گے کیا؟'' عشیہ گھٹی گھٹی آواز میں بمشکل چیخی تھی۔

''کون عشیہ؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ پھر سے دہاڑا، عشیہ کا سانس رکنے لگا تھا، پھر بھی وہ تیز گام پہ سوار چیخی۔

''میں انجانے میں چلی آئی، اب واپس جانا بڑا دشوار ہے، مجھے کوئی سواری نہیں مل سکتی۔'' تکلیف کی شدت سے عشیہ رونے لگی تھی، اوپر سے خوف کے مارے جان نکل رہی تھی، نجانے یہ آدمی اس کا کیا حشر کرتا؟

''کہاں سے آئی ہو؟'' مقابل کھڑے جوان کا لہجہ پہلے کی طرح کھردرا نہیں تھا، اسے سہمی ہوئی لڑکی کے لہجے میں ہراس محسوس ہو گیا تھا، یقیناً وہ رستہ بھٹک کر آ گئی تھی۔

''منورہ سے۔'' عشیہ نے روتے ہوئے بتایا، مقابل کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا، وہ گھوم کر ایک دفعہ پھر سامنے آیا، جیکٹ کی پاکٹ سے ٹارچ نکال کر آن کی تھی، پھر اس نے روتی ہوئی عشیہ کے چہرے پہ روشنی کو پھیلایا، آنسوؤں کے قطروں نے اس کے چہرے کو گیلا کر رکھا تھا، وہ بہت سہمی ہوئی خوفزدہ لگ رہی تھی، اس نے بڑے غور سے دیکھا تھا۔

''منورہ سے تم پیدل یہاں آ گئی؟'' سامنے کھڑے جوان کو گویا یقین نہیں آیا۔

''ہاں، اپنی دھن میں مگن مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔'' عشیہ نے اپنی لاپرواہی اور غائب دماغی کا اعتراف کر لیا۔

''اچھا۔'' یکایک مقابل کو خاصی دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

''کیسی دھن میں مگن تھی؟'' اس نے خاصی دلفریبی سے سوال کیا تھا، گویا جواب جاننا اس کے لئے بہت ضروری تھا۔

''وہ...... میں، اس اجنبی۔'' عشیہ بولتے بولتے ایک دم ٹھٹک کر رک گئی تھی، آخر وہ اس کو یہ

سب کیوں بتانے لگی تھی؟ دماغ کے الرٹ کرنے پہ وہ فوراً ٹھٹک کر خاموش ہوگئی، اسے بے دھیانی میں کچھ الٹا نہیں بولنا تھا۔

''تم کچھ بتا رہی تھیں؟'' عشیہ کے خاموش ہوتے ہی اس نے دوبارہ سوال کیا، عشیہ گھبرا کر جلدی سے بولی۔

''مم مجھے تمہاری فیور چاہیے۔'' عشیہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا، پھر اسے خیال آیا، وہ یہی الفاظ بولنا چاہتی تھی۔

''کیسی فیور؟'' وہ حیران ہوا، اجنبی لڑکی کا اچانک ٹکرانا، پھر منگورہ سے بھٹک کر آنا اور اب دھڑلے سے فیور مانگنا؟

''مجھے میرے گھر تک پہنچا دو۔'' عشیہ نے جیسے روتے ہوئے التجا کی تھی، بس پیر پکڑنے کی کسر رہ گئی تھی، اس نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا، گو کہ وہ اتنی آسانی سے کسی کی ماننا نہیں تھا پھر بھی جانے کیوں؟

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ ڈھلان اتر رہا تھا، عشیہ کی جیسے جان میں جان آئی تھی، وہ بے ساختہ اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی ڈھلان اترنے لگی، کچھ ہی دیر میں وہ اپنی جیپ نکال لایا تھا، کیا وہ ہر اجنبی کے لئے جیپ نکال لاتا تھا؟ جیپ جب ہموار رستے پہ آئی تب عشیہ کو اچانک اس کا نام پوچھنے کا خیال آیا۔

''تمہارا نام پوچھ سکتی ہوں؟'' عشیہ نے جھجک کر پوچھا، وہ کبھی بھی پہلی ملاقات میں کسی اجنبی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی، اب بھی صرف معلومات کے لئے پوچھ رہی تھی ورنہ بے تکلفی کا عنصر نمایاں نہیں تھا۔

''ضرور۔'' وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسکرایا، ظالم کی بڑی قاتلانہ مسکراہٹ تھی، عشیہ کو قائل ہونا ہی پڑا۔

''تو پھر بتا دو۔'' عشیہ سنجیدگی سے گویا ہوئی، شاید اپنی تسلی چاہتی تھی، ویسے اس اجنبی سے اسے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''شاہوار بنو۔'' اس کی مسکراہٹ میں بڑا طوفانی قسم کا انکشاف تھا، عشیہ کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹ پڑیں، اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ برآمد ہوئی تھی، وہ سیٹ سے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس کی طرف مڑی تھی، جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ عشیہ کے گھر کی دیوار کے سامنے رکی، اس کا منہ خوف سے کھل گیا تھا جیسے یقین نہ آیا ہو کہ وہ آئی کس کے ساتھ ہے۔

''مجھے اتار دو۔'' وہ ابھی تک چلا رہی تھی، اس کا ردعمل بڑا جارحانہ قسم کا تھا، شاہوار بنو الجھ کر رہ گیا، بجائے کوئی تشکرانہ جملہ بولنے کے مدد لینے والی لڑکی اس بری طرح سے شاہوار بنو کا نام سن کر چلائی تھی کہ اسے اپنے نام پہ غور و فکر کرنا پڑ گیا تھا، حالانکہ اس کا نام کہیں سے بھی عجیب نہیں تھا، عجیب یا باعث تکلیف تو یہ تھا کہ وہ بنو خاندان کا ایسا فرد تھا جس کے ساتھ آنے یا اس کی مدد چاہنے پہ عشیہ کو اس کی ماں سزا کے طور پر قتل بھی کر سکتی تھی، لیکن اس حقیقت سے شاہوار بنو واقف نہیں تھا، اس کی حیرانگی تو بنتی تھی۔

☆☆☆

دیامر کے خطے کو اگر تاریخی تناظر سے دیکھا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح نظر آتی ہے کہ اس خطے میں شامل علاقے جہاں اپنی الگ الگ سیاسی اور سماجی روایات کے علمبردار رہے تھے وہاں مجموعی طور پر ان کی تاریخ اس خطے سے وابستہ رہی تھی جسے ماضی میں ''دردستان'' کے نام سے پکارا جاتا رہا تھا۔

دردستان میں ''درد'' کی ایسی ایسی داستانیں رقم تھیں کہ کوئی بھی قلم دردستان کی کسی داستان کو لکھنے کی جسارت نہیں کر سکا تھا، اس خطے میں محبت اپنے روایتی انداز میں پروان چڑھتی تھی اور روایتی انداز میں ہی زمین بوس ہو جاتی، اس خطے میں محبت کا سورج عموماً طلوع ضرور ہوتا تھا تاہم قبل از وقت ہی غروب کر دیا جاتا تھا، یعنی اس علاقے کے عاشقوں کو محبت کم ہی راس آیا کرتی تھی۔

یہاں کے قبائل اپنی خود داری اور خود رائی کی بدولت اکثر آزاد رہے تھے، تعلیمی سے تانگیر تک دریائے سندھ کی دونوں جانب بے شمار ایسے قبائل آباد تھے جنہوں نے کبھی کسی کی حکمرانی قبول نہیں کی تھی یہاں تک کہ انگریزی دور حکومت میں بھی ان کی آزاد حیثیت کو برقرار رکھا گیا تھا۔

قیام پاکستان کے وقت اگرچہ یہ خطہ ڈوگرہ حکمرانوں کی عملداری میں تھا مگر اس کے باوجود یہاں کے قبائل اپنے اندرونی معاملات اور اختلافات باہمی افہام و تفہیم سے حل کرنے میں آزاد اور خود مختار تھے۔

سونیل بر کبیر خان شین نسل کے بٹو قبیلے کی بڑی طرح دار، آزاد خیال اور خود مختار بیٹی تھی، اپنے ہر قول و فعل میں آزاد اور خود مختار تھی، کسی کو نیل بر کے فیصلے سے اختلاف رکھنے کی جرأت نہیں تھی۔

وہ سردار کبیر خان بٹو اور اس کے خاندان پہ اپنی مرضی سے حکومت کرتی تھی، کیونکہ وہ سردار بٹو کی من چاہی محبوبہ سے واحد اولاد تھی، سو اکثر نیل بر کی سرکشی پہ سردار بٹو چشم پوشی اختیار کر لیتے تھے، یعنی اس دنیا میں کوئی ایسا وجود بھی موجود تھا جو سردار بٹو کو انگلی اٹھا کر خاموش کرنے کی جرأت کر سکتا تھا اور سردار بٹو بے بسی سے دیکھتے رہ جاتے۔

جیسے اس وقت آریائی نسل کے سیاہ مشکی گھوڑے پہ سوار نیل بر کو جاتا دیکھ کر بے بسی سے اندر باہر ٹہل رہے تھے، یہ پریشان کے اضطراب کی طرف واضح اشارہ کرتی تھی۔

ان کا معتمد خاص جہاندار ان کی بے چینی کو ہر زاویے سے نوٹ کر رہا تھا، کچھ ہی دیر بعد جہاندار ان کے مقابل آ کھڑا ہوا، وہ سردار کی پریشانی کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، سردار بٹو اسے دیکھ کر بے ساختہ چونکے، پھر انہوں نے اپنی گرم شال کو کندھے پہ جمایا اور ایک ہاتھ سے اشارہ کیا، وہ سمجھ کر ان کے اور قریب آ گیا تھا۔

''نیل بر کبھی کبھار بہت آزماتی ہے، اپنی ضد سے ہٹتی نہیں، سردار بٹو کی اولاد جو ہوئی، سمجھ نہیں آتا اسے روکوں تو کیسے؟ چاہے اس کے بازار تک گھوڑے پہ جائے گی، ہر سوال کرتی نگاہ کی نیل بر کو پرواہ نہیں، لیکن مجھے تو پرواہ ہے، سمجھ میں نہیں آتا، کروں کیا؟ زیادہ سختی کی تو امریکہ بھاگنے کی

کرے گی جو کہ مجھے گوارا نہیں۔'' عمر بھر سے حکم سنانے والا اتنا بے بس تھا کہ حد نہیں، جہاندار سے ان کی بے بسی دیکھی نہیں گئی تھی، سچ تو یہ تھا، وہ نیل بر سے محبت کے معاملے میں ساری سرداری بھول کر صرف ایک محبت کرنے والے، فرمائشیں پوری کرنے والے باپ بن جاتے تھے اور خود کو بے بسی کی انتہا پر بھی سمجھتے تھے۔

''صندیر کو پہلے ہی نیل بر کی آزادی پر اعتراض ہے، وہ کئی دفعہ شکایت نامہ سنا چکا ہے۔'' سردار بٹو ابھی تک بے قراری سے ٹہل رہے تھے، ان کی آنکھوں میں بے چینی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

''بی بی جان بھی ناراض ہوتی ہیں۔'' انہوں نے پیشانی مسل کر اپنی ماں کا حوالہ دیا، جنہیں نیل بر کی خود مختاریوں پہ اعتراض تو بہت تھا پھر بھی مصلحتاً خاموش ہو جاتی تھیں۔

''نیل بر کو دیکھ کر حمت اور سباخانہ بھی من مانی کریں گی جو کہ مجھے گوارا نہیں۔'' وہ چلتے چلتے لمحہ بھر کے لئے رکے، اک نگاہ جہاندار پہ ڈالی، وہ اس نگاہ کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھتا تھا، سردار اب خاموش تھے اور جہاندار سے مشورہ چاہ رہے تھے، یہ ان کا مخصوص اسٹائل ہوا کرتا تھا، جہاندار نے سمجھ کر لب کشائی کی۔

''میں سنبھال لیتا ہوں۔'' اس کے دو لفظوں میں کمال کا ٹھاٹھیں مارتا سکون تھا، سردار بٹو نے ایک بھوں اچکا کر جہاندار کو دیکھا۔

''واقعی؟'' ان کی آنکھ کا سوال بڑا آسان تھا، جہاندار سمجھ گیا۔

''یقیناً۔'' اس نے اطمینان سے سردار بٹو کو بھی اطمینان دلایا تھا، وہ لمحوں میں پرسکون ہو گئے تھے، جیسے انہیں جہاندار کی صلاحیتوں پہ پورا بھروسہ تھا۔

''اسے چاپاس نہیں جانا۔'' وہ انگلی اٹھا کر تنبیہ کر رہے تھے۔

''نہیں جائے گی۔'' جہاندار مسکرا دیا۔

''مجھے یقین ہے۔'' سردار کے چہرے پہ سکون پھیل گیا تھا۔

''پھر کیا ارادے ہیں؟'' اب وہ اگلا لائحہ عمل پوچھ رہے تھے۔

''نیل بر ابھی تک بیال میں ہے، بٹو محل کے آس پاس، یقیناً حمت کو ساتھ لے جانے کے لئے، میں دیکھتا ہوں۔'' جہاندار نے انہیں اطمینان دلایا اور آگے بڑھ گیا، اس کا رخ انیملو فارمیسی کی طرف تھا، کچھ دیر بعد وہ آتا دکھائی دیا، وہ اس وقت بیال کے وسیع سبزہ زار سے گزر رہا تھا، سورج کے طلوع ہونے کے باوجود بادلوں سے ڈھکے آسمان نے ہر طرف ملگجا اندھیرا تان رکھا تھا، مطلع ابر آلود ہونے کے باعث شاہ خاور بھی بادلوں کی گود میں اونگھ رہا تھا۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا، دل و دماغ میں عجیب سا طوفان اٹھ رہا تھا، نیل بر کے مقابل آنا اتنا سہل کبھی نہیں تھا پھر بھی ہر دفعہ سردار بٹو اس کو آزمائش کے لئے نیل بر کے سامنے بھیج دیتے تھے۔

وہ جانتا تھا، نیل بر بلا کی ضدی، ہٹ دھرم اور خود سر ہے، جب وہ باپ اور تایا زاد بھائیوں کو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی تو پھر جہاندار کی اوقات کیا تھی؟

اس کے باوجود سردار بٹو بڑے یقین کے ساتھ اسے نیل بر کے پاس بھیج دیتے، جیسے جہاندار

کبھی نا کام لوٹنے والا نہیں تھا، کسی بھی طرح وہ نیل بر کو نہ صرف ہینڈل کر لیتا تھا بلکہ اپنی بات بھی زبردستی منوا لیتا، اس وقت بھی وہ بڑے یقین کے ساتھ بوٹ محل کے وسیع و عریض سبزہ زار میں پہنچ گیا۔

مخملی گھاس پہ سیاہ مشکی آریائی نسل کا گھوڑا چہل قدمی فرما رہا تا، نیل بر سامنے کہیں نہیں تھی، یقیناً وہ حمت کے پاس تھی، جہاندار کچھ سوچتا ہوا آگے بڑھا، پھر اس نے جیب سے ایک سرنج اور انجیکشن نکالا، دوسرے ہی لمحے مشکی سیاہ رنگ کے گھوڑے کی پشت میں سرنج کھبا کر وہ اندر کی طرف بڑھ آیا تھا۔

سامنے سے نیل بر آتی دکھائی دے رہی تھی، ویسی ہی نوبہار، مغرور اور حسین، سیاہ جینز اور جیکٹ میں کوئی مغربی نمونہ لگ رہی تھی، سردار کو اس کے باہر نکلنے اور چالاس کے بازاروں میں گھومنے پر ٹھیک ہی تحفظات تھے، وہ بہت ساری آنکھوں میں رنگ رنگ کے سوال اتار سکتی تھی۔

جہاندار کو دیکھ کر وہ رکی نہیں تھی جب جہاندار اس کے سامنے آ گیا تو تب نیل بر کو مجبوراً رکنا پڑا، کیونکہ وہ رستہ بلاک کیے کھڑا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نیل بر نے عادتاً نخوت سے پوچھا، چالاس جانے میں اور اپنے من پسند گھوڑے پہ سواری کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر بھی اسے گوارا نہیں تھی، جب وہ موڈ بنا لیتی تھی تو کم ہی کسی اور کی سنتی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' جہاندار نے اس کا برہم انداز نظر انداز کر کے ملائمت سے پوچھا۔

''تم سے مطلب؟'' وہ تڑخ کر بولی۔

''معلومات کے لئے پوچھ رہا ہوں۔'' جہاندار کو نہ چاہ کر بھی مسکرانا پڑا۔

''عادتاً یا اخلاقاً؟'' اس نے بڑے انداز میں کہا تھا، جہاندار کو چکر سا آ گیا۔

''نہ عادتاً نہ اخلاقاً۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''تو پھر؟'' نیل بر نے ناک بھوں چڑھائی تھی، وہ اب لمحہ بھر کے لئے بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔

''یہ میرے فرائض میں شامل ہے۔'' جہاندار نے نرمی سے جتلایا، وہ بار بار کلائی موڑ کر گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے بڑا ہی مصروف ہو، نیل بر کو ایسے لوگوں سے بڑی چڑ تھی جو جان بوجھ کر خود کو مصروف ظاہر کرتے تھے۔

''یوں سمجھ لو، تم بھی میری پرائیویٹ نوکری کا حصہ ہو۔'' وہ جان کر گفتگو کو طول دے رہا تھا، نیل بر کی آنکھوں میں غصہ ابھر آیا، کیونکہ اس نے ایک مرتبہ پھر کلائی موڑ کر رسٹ واچ کو دیکھا تھا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' اس نے بھنا کر کہا۔

''نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' جہاندار معصوم بنا۔

''تم میری ڈیوٹی کا حصہ ہو۔'' وہ جان کر اسے سلگا رہا تھا۔

''ہونہہ۔'' نیل بر پھنکاری۔

''اب بتا دو، کہاں کی تیاری ہے؟'' وہ بات کو گھما کر اصل سوال کی طرف لے آیا، نیل بر نے

تیکھے چتونوں سے اسے گھورا، اس کی مستقل مزاجی نیل بر کی دردسری بنتی جارہی تھی۔

''چالاس۔'' خلاف توقع نیل بر نے دانت پیس کر ہی سہی، پھر بھی بتا ہی دیا تھا، جہاندار کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل سے گئے تھے۔

''کیا جیپ نکالوں؟'' اس نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' نیل بر نے شان بے نیازی سے کہا، وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا، جیسے سوچ رہا تھا جیپ پہ نہیں تو کسی سواری پہ چالاس تک جایا جائے گا؟

''میں جیک پہ جاؤں گی۔'' نیل بر کا انداز سابقہ نخوت لئے ہوئے تھا، غالباً جیک سے مراد وہی آریائی نسل کا سیاہ مشکی گھوڑا تھا۔

''لیکن جیک کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' جہاندار نے بڑے سرسری انداز میں کہا تھا، نیل بر اس کی توقع کے عین مطابق بری طرح سے چونکی۔

''جیک کی طبیعت کو کیا ہوا؟ ابھی تو وہ فٹ تھا۔'' اس نے تیکھے انداز میں جہاندار کو گھورا۔

''بیمار ہوتے ہوئے سال نہیں لگتے، ایک پل میں بیماری حملہ آور ہوسکتی ہے۔'' جہاندار کا انداز ناصحانہ تھا۔

''لیکن جیک کو ہوا کیا؟'' نیل بر کی جیسے جان پہ بن آئی تھی، وہ بے قراری سے باہر نکل آئی، جہاندار بھی اس کے پیچھے تھا، وہ بہت تیز چل رہی تھی، بلکہ دوڑ رہی تھی، جہاندار کو بھی ساتھ دینا پڑا تھا۔

''کہا نا، چالاس جانے کا پروگرام کینسل فرما دیں جیک ابھی آپ کے شاہانہ وجود کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔'' اس کی سنجیدہ آواز نیل بر کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور نیل بر حواس باختہ سی لان میں بے ہوش گرے جیک کو دیکھنے لگی، اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں، جیسے جیک کا اچانک بے ہوش ہونا اسے شاکڈ کر رہا تھا، جیک کو آخر ہوا کیا تھا؟ کچھ دیر پہلے نیل بر اسے تندرست چھوڑ کر اندر گئی تھی، جب واپس آئی تو اس کا لاڈلا جیک بے ہوش پڑا تھا، نیل بر کے حواس معطل ہوگئے۔

''جیک کو کیا ہوا؟'' وہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے بے یقینی سے بولی، اس کا چہرہ صدمے کی شدت سے تمتما رہا تھا۔

''شاید کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے، آج کل موسم بھی تو برسات کا ہے نا۔'' جہاندار نے اسکی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو، جیک کچھ ہی دنوں میں صحت یاب ہو جائے گا۔'' اس کا انداز بھرپور تسلی دینے والا تھا، نیل بر کی گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی۔

''کچھ دنوں میں؟ کچھ گھنٹوں میں کیوں نہیں؟ مجھے آج ہی چالاس جانا ہے۔''

''یہ تو ممکن نہیں، تم کسی اور دن کا پروگرام رکھو، جیک تو سفر کے قابل نہیں۔'' اس نے تاسف کا اظہار کیا تھا، پھر جیک کو لگام پکڑ کر کسی اور نوکر کو آواز دی، کچھ ہی دیر میں جیک کو اٹھا کر اصطبل لے جایا گیا تھا، جہاں ویٹرنری ڈاکٹر نے اس کا علاج شروع کر دیا، جہاندار کو ''بلائیں'' ٹالنے کا سلیقہ تھا،

جو کام کوئی اور نہیں کر سکتا تھا وہ اس کے سر آ جاتا، نیل بر دکھی سی واپس پلٹ رہی تھی، اس کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔

اس کا پہلے سے بنایا گیا پروگرام جب بھی چوپٹ ہوتا وہ اسی طرح بددل اور بدمزاج ہو جاتی تھی۔

اس وقت نیل بر کو غصے میں واپس جاتے دیکھ کر بارہ دری کی اونچائی پہ کھڑے سردار بٹو کے سر سے بوجھ اتر گیا تھا، جو کام ان کی محبت اور نرماہٹ نہیں کر سکتی تھی وہی کام جہاندار کی ''ذہانت'' کر دیتی تھی، انہیں اپنے معتمد خاص پہ فخر محسوس ہوا تھا، کیونکہ جہاندار ایک ایسی طاقت ور مشین تھا جو خطرے اور ہر مشکل میں پہلے سے الارم بجا کر الرٹ کر دیتا تھا اور ہر مصیبت میں ڈھال بن جاتا تھا، ان کا بھروسہ جہاندار پہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ہیام کے تین منزلہ مکان کے باہر گہری رات کے سناٹے اتر آئے تھے۔

تین منزلہ مکان کے باہر اس پار تک پھیلے وسیع تالابوں میں سفید کنول کے سینکڑوں پیالے تیرتے تھے، یہ تالاب چھوٹی موٹی سی کم رواں پانی والی جھیلیں تھیں۔

جھیل کے کنارے وسیع گھیر والا گھنا درخت ''برنا'' کلیوں پہ اترتا تھا اور اس کی دلفریب خوشبو مسافروں کو رستہ بھلا دیتی تھی، وہ ایک زرد سنہرے بادل کی طرح امڈ کر آتا تھا اور قریب سے دیکھنے پر اس کا رنگ ایک آگ کے الاؤ کی طرح دہکتا تھا۔

جانے ''برنا'' کی خوشبو سے راہبن، رستہ بھول گئی تھی؟

ابھی تک تو اسے واپس آ جانا چاہیے تھا، کیونکہ یہاں کے اوقات کار کے مطابق اس وقت تمام دوکانیں بند ہو چکی تھیں، جب دوکانیں بند تھیں تو عشیہ بازار کیا کر رہی تھی؟

عمکیہ کے دل کو پتنگے لگے ہوئے تھے، جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے، کیونکہ مورے کی ایک آنکھ دروازے پہ لگی تھی اور دوسری آنکھ گھڑیال پہ جمی تھی اور ان کے چہرے پہ پھیلے تاثر انتہائی خطرناک تھے۔

عمکیہ کی چھوٹی بہن ایسی غلطیوں کا کئی دفعہ ارتکاب کر چکی تھی اور ہر دفعہ مورے کے ہاتھوں اس کی ہڈیاں پچوم بنی تھیں۔

اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی، معاملہ اب بھی کچھ الگ نہیں تھا، عشیہ ہمیشہ کی طرح کسی نہ کسی گڑبڑ کا شکار ہو چکی تھی۔

اسے گھر سے نکلے ہوئے قریب دو گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا اور اسی حساب سے مورے نے کوئی اٹھارہ مرتبہ عشیہ کا پوچھا تھا، ہر دفعہ عمکیہ کو نگاہ چرانا ہی پڑتی تھی، وہ ماں کی سوال کرتی زہریلی، کٹیلی نگاہ کا سامنا کرنے سے قاصر تھی، کیونکہ ان کی نگاہوں میں غصے کے ساتھ ساتھ عجیب سا شک بھی کوندے کی طرح لپک رہا ہوتا تھا۔

عشیہ کو اپنی ماں کے مزاج سے اچھی طرح آگاہی تھی پھر بھی ہر دفعہ کوئی نہ کوئی غلطی اٹھائے گھر آ جاتی، ہیام کے لاہور جانے کے بعد اکثر بیرونی معملات اور کام عشیہ کے ذمے تھے، لیکن

اس سے بھی بہت پہلے سے بجلی، ٹیلیفون، کے بلوں سے لے کر سودا سلف لانے کی ذمہ داری عشیہ کے سر پہ تھی، گو کہ وہ اپنی ذمہ داری اچھی طرح نبھا رہی تھی پھر بھی مہینے میں دو تین مرتبہ اس کی مورے سے درگت ضرور بنتی تھی، جیسے اس وقت عمکیہ کو یقین تھا کہ عشیہ آج مورے سے بچ نہیں پائے گی۔

گھڑی کی آگے بڑھتی سوئیاں اس کا ہراس بھی بڑھا رہی تھیں اوپر سے مورے کا شدید غصہ گھورتی نگاہیں اور تلخ ترین الفاظ، عمکیہ کے کانوں سے دھواں سا نکلنے لگا تھا۔

''لکھوا لو مجھ سے، نہیں آنے والی۔'' مورے نے بالآخر اندر کا ابال باہر نکال دیا تھا، عمکیہ نے افسردہ سی نظر ماں پہ ڈالی تھی، اس کی ماں خاص طور پر بیٹیوں کے لئے کسی بھی قسم کے الفاظ بولنے سے گریز نہیں کرتی تھیں۔

''مجھے اس سے بھی اچھی امید نہیں رہی، بھیجو کہیں، جاتی کہیں ہے، اس کا دماغ ہی ٹھکانے پہ نہیں، جانے کون دماغ پہ حاوی اور سوچوں پہ سوار رہتا ہے۔'' مورے غصے کے عالم میں لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آتش دان میں پھینک رہی تھیں، اپنے تئیں وہ لکڑیوں پہ اپنا غصہ اتار رہی تھیں، عمکیہ انہیں روک بھی نہیں سکی، یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ آتش دان کوئلوں سے بھر گیا ہے، مزید کوئلوں کی گنجائش نہیں تھی اور کل کے لئے مزید لکڑیوں کے ٹکڑے بھی ختم ہونے کے امکانات تھے، لکڑیاں ختم ہو جاتیں تب بھی عشیہ کی خدمات حاصل کیے بغیر مزید لکڑیاں نہیں مل سکتی تھیں، وہ ہی تھی جو آرے پہ بھاؤ تاؤ کر کے سستی لکڑیاں خرید لاتی، ورنہ سرما کا موسم یہاں قلفی جما کر رکھ دیتا تھا، دہکتے کوئلوں کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

''ہر گلی بازار میں آنکھ مٹکا کرنے کھڑی ہو جاتی ہے، ورنہ اتنے سے کام میں گھنٹے نہیں لگتے، شروع سے بے حیا تھی۔'' مورے کی زبان کا تلخ گراف گرنے کی بجائے دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا، عمکیہ کے دل میں تیر سا کھبا، مورے اپنے الفاظ کی سنگینی سے قطعاً انجان رہتی تھیں۔

''اگر ایسی گنوں میں باکمال ہوتی تو عنیہ کی ساس تمہارا رشتہ نہ لاتی، اسی کو بیاہ کر لے جاتی، زریاب سے بات تو عشیہ کی طے تھی۔'' مورے لکڑیوں کا ڈھیر دہکتے الاؤ میں پھینک کر آگ بگولہ ہوئیں۔

''مجھے یقین ہے، زریاب کو اس کے کالے کرتوتوں کی سن گن مل گئی ہوگی، تبھی تو عشیہ کو ٹھکرا کر اس نے تمہارا نام لیا ہے۔'' وہ غیض بھرے لہجے میں بولتی چلی گئی تھیں۔

''عشیہ نے کون سا چکلہ کھول رکھا تھا، مورے آپ بھی نا۔'' عمکیہ سرخ چہرے کے ساتھ زیر لب بڑبڑائی، وہ تو ابھی تک زریاب کی طرف سے ملنے والے پیغام پہ شاکڈ تھی اور چھوٹی بہن سے نگاہ چرائی پھر رہی تھی، اوپر سے مورے کے الفاظ عمکیہ کو صاف مجرم بنا رہے تھے، جیسے اس سارے معاملے میں قصور عمکیہ کا ہو، حالانکہ زریاب کی خواہش نے عمکیہ کو اپنی ہی نگاہ میں چور بنا دیا تھا۔

''آخر کس غلیظ خون کا بیج تھی، بالآخر اپنا ''گند'' جتلا دیا نا۔'' مورے کا زہریلا لہجہ بلا کا پرتپش تھا۔

''گندے باپ کی گندی اولاد، آہ تھو، نجانے کس کے ساتھ منہ کالا کرتی پھر رہی ہے، ارے ملاؤ ہیام کو کال، میں بتاؤں اسے عشیہ کے کارنامے، باپ بھائی سر پہ نہیں تو شتر بے مہار پھرتی ہے، رات کی تاریکی میں عزت دار لڑکیاں بازاروں میں نہیں گھومتیں۔'' وہ چلاتی ہوئی عمکیہ سے مخاطب تھیں، ان کی فرمائش نے اسے ''ہلا'' کر رکھ دیا تھا، وہ ہیام کو کیا بتانے کا ارادہ رکھتی تھیں؟ اس کی جیسے جان نکل گئی۔

''سنا نہیں عروضہ! ہیام کو کال کرو۔'' عمکیہ سے نگاہ ہٹا کر انہوں نے ڈائجسٹ میں گم عروضہ سے دہاڑ کر کہا تھا، عروضہ کے ہاتھ سے رسالہ گر پڑا، وہ ہونق سی مورے کو دیکھنے لگی تھی، جیسے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''مورے! ہیام کو کیا بتانا ہے؟ وہ مصروف ہوگا، ویسے بھی اتنی دور تو بیٹھا ہے، اسے کیوں پریشان کرنا چاہتی ہیں؟ عشیہ بس آتی ہی ہوگی۔'' عمکیہ کو معاملہ سنبھالا بڑا دشوار لگا تھا، اوپر سے عشیہ پہ بے انتہا غصہ بھی آیا تھا، وہ اپنے پچھلے ریکارڈ پہ قائم تھی، ابھی بھی وقت پہ نہیں پہنچ سکی تھی۔

''نہیں آئے گی، پوری رذیل ہے، اب تک بھاگ چکی ہوگی۔'' مورے اپنے منفی خیالات کی انتہا پہ موجود تھیں۔

''اللہ نہ کرے۔'' عمکیہ دہل کر رہ گئی۔

''جا، عروضہ! بالکونی میں دیکھ، کیا اب بھی آرہی ہے یا نہیں؟'' وہ بے قراری سے چیخی تھیں، اندر سے چاہے جتنی بھی مضطرب ہوتیں اپنے الفاظ سے ظاہر نہیں کرتی تھیں۔

عروضہ ماں کا حکم تقریباً ایک سو اٹھارویں مرتبہ سن کر کسلتی ہوئی اٹھی تھی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی، جب بھی کہانی کلائمکس پہ ہوتی، مورے بیچ میں کود کر مزہ کرکرا کر دیتی تھیں۔

وہ اتنی دفعہ اوپر نیچے کی اس پریڈ سے تنگ آچکی تھی، عشیہ کو دل ہی دل میں کوستی وہ بالکونی میں آکھڑی ہوئی تھی، یہاں آکر برفیلی ہواؤں نے ایسا استقبال کیا کہ عروضہ تھرتھرا کر رہ گئی تھی، عشیہ پہ اور بھی غصہ آیا۔

''مورے ٹھیک ہی کہتی ہیں، جانے کن عاشقوں سے ملتی ہے، ورنہ اتنے گھنٹوں میں دوائیاں تو بھی کی جاتی ہیں جب تک میں یہ خرید کر لاتی ہے۔'' وہ زہر خندسی بڑبڑاتی رہ گئی تھی، عشیہ سے اس کے تعلقات کبھی مثالی نہیں رہے تھے، دونوں میں بچپن سے ٹھنی رہتی تھی، سو اب بھی عروضہ کو عشیہ پہ شدید تاؤ آرہا تھا۔

وہ اس پہ لعنت ڈال کر واپس پلٹنے ہی والی تھی جب ایک نئی نکور جیپ کو اپنے گھر کی دیوار کے پاس رکتا دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں، عروضہ اتنی دور سے بھی جیپ سے نکلتی عشیہ کو دیکھ سکتی تھی، لیکن اس کی نگاہیں عشیہ کو نہیں، ڈرائیونگ سیٹ پہ موجود اس شاندار سے شاہوار بخت کو چھو رہی تھیں، جس کے بخت اور جس کی پرسنالٹی پہ پورے منگورہ کی لڑکیاں مرتی تھیں اور خود عروضہ کا بھلا کیا حال ہوتا تھا؟ وہ اس کے تصورات کی بلندی پہ کھڑا تھا۔

نانگاپربت کی اونچائیوں جیسا، ویسا ہی بلند، برفیلا اور کٹھن ترین، اس کے خیالی پیکر سے بڑھ

کر عالیشان، اس کے سنہرے خوابوں کا شہزادہ، ایسی معطر ہوا جیسے چھونا بھی قیامت تھا، جس کا پاس سے گزرنا بھی قیامت تھا، عروضہ کے اندر تک آگ سی دہک گئی تھی، نانگا پربت کے پہلو کا گلیشیئر جیسے خود چل کر مجسم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، برف کو برف سے ٹکرانا تھا اور پاش پاش ہو جانا تھا؟ عروضہ لمحوں میں سرتاپا فریز ہوگئی تھی، اس کے آس پاس برف کی ٹھنڈک اتر گئی، دل کی دھڑکنوں میں کیسا بھونچال آیا تھا؟ اس نے بائیں پہلو پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ ٹھنڈی یخ آنکھوں سے سامنے کے منظر کو دیکھا، اس کے خوابوں کا نگہبان بھلا عشیہ کے پہلو میں کیوں کھڑا تھا؟ اس کے دل کا دربان بھلا عشیہ کے برابر کیوں کھڑا تھا؟ اس تو یہاں ہونا چاہیے تھا، پھر وہ وہاں اتنی دور کیوں موجود تھا؟ اگر وہ گھر تک آ ہی چکا تھا تو دل کی حدود میں داخل ہونے، اندر آنے، ہمیشہ کے لئے ٹھہرنے میں کیا قباحت تھی؟ اسے آگے بڑھنے سے کون روک رہا تھا؟ کیا عشیہ؟ وہ ہل سی گئی تھی، وہ بڑے مضطرب انداز میں سامنے دیکھ رہی تھی، وہ بڑی بے قرار ہو رہی تھی، کیونکہ شاہوار بنو عشیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، یہ مسکراہٹ تو عروضہ کے لئے ہونا چاہیے تھی، پھر عشیہ کے لئے کیوں؟ وہ جیسے سرد ہواؤں سے متوحش سی پوچھ رہی تھی۔

☆☆☆

اسے فن گندھارا کا قدیم شاہکار ندی میں گرا دینے کا جتنا صدمہ ہونا چاہیے تھا اتنا ہوا نہیں، وہ خود بھی اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھا۔

گو کہ اس کی ساری تپسیا بیکار گئی تھی اس کے باوجود اسامہ جہانگیر کو گندھارا پہ ریسرچ مکمل کر کے آگے رپورٹ بھیجنی تھی، سو وہ آج کی دودھیا سویر میں گندھارا کی تاریخ لکھنے بیٹھ گیا تھا۔

ہوٹل ''روز گل'' میں باغیچے کی پرنم معطر فضا میں گندھارا کی تاریخ لکھنا بڑا انوکھا تجربہ تھا، وہ بدھ تاریخ دانوں کی ہسٹری چھانتا تو ان کے مطابق ٹیکسلا مہاتما بدھ کی زندگی میں گندھارا کا صدر مقام تھا، سرحد کے ایک حصے کا نام گندھارا تا، بدھ ازم یہاں تیسری صدی قبل از مسیح میں آیا، یہ چھوٹا سا علاقہ اپنی شاندار تہذیب اور پرامن ثقافت کے اثرات روس کے دریا آمو تک لے جاتا تھا اور چین کے سرحدی علاقوں میں بھی اس کے آثار ملتے تھے۔

آتش پرست ایرانی، یونانی اور بدھ اسے اپنا مقدس وطن سمجھتے تھے، فن مجسمہ سازی میں گندھارا کی الگ پہچان تھی، گندھارا کے مجسمے یونانی اثرات میں گندھے ہوئے تھے، سننے میں آتا تھا پہلے مہاتما بدھ کا مجسمہ نہیں بنایا جاتا تھا اور اس کی پرستش کا رواج بھی نہیں تھا۔

مہاتما بدھ کے مجسمے اس لئے تراشے جاتے تھے تاکہ خوبصورتی اور امن کا احساس ہو نہ کہ کراہیت کا، گندھارا کا مہاتما بدھ دراصل یونانی دیوتا اپالو کی کاپی تھا۔

بقول فاہیان کے جب گندھارا کے ملک کی حدود نظر آئیں تو وہاں بدھ کی یادیں تھیں جہاں بدھ نے پچھلے جنم میں ایک ساتھی انسان کے لئے اپنی آنکھوں کی قربانی دے دی تھی پھر یہیں پر چاندی اور سونے سے مرصع ایک پگوڈا تعمیر کیا گیا، اس مقام سے مشرق کی جانب سات روز کے سفر کے بعد تا کشیلا کا ملک تھا جس کا چینی زبان میں معنی تھا ''سر قلم کرنا'' جب بدھ ایک پچھلے جنم میں بدھستوا کے روپ میں تھا تو اس نے یہاں پر اپنے ساتھی انسان کی خاطر اپنا سر قلم کر دیا تھا،

یعنی بدھ تھا یا مدر ٹریسا؟

اسامہ کا دماغ پک گیا، ہاتھ لکھتے لکھتے اکڑ گئے تھے، اس نے قلم اٹھا کر میز پہ پٹخا، کاغذ سمیٹے اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

گو کہ تاریخ میں اس کی زندگی دھڑکتی تھی، وہ تاریخ میں سانس لیتا تھا، پھر بھی آج تاریخ چھانتے ذہنی یکسوئی میسر نہیں تھی۔

دھیان کا پنچھی بھٹک بھٹک کر ندی کے اس پل تک پہنچ جاتا، جہاں ایک اجنبی حسینہ سے زور دار تصادم کے بعد اس کا بیگ ندی میں جا گرا تھا، اس بیگ میں فن گندھارا کا قدیم نمونہ تھا جو اسامہ سے ہمیشہ کے لئے کھو گیا، وہ عظیم نقصان سے دوچار ہونے کے باوجود مطمئن تھا، جیسے اتنا بڑا خسارہ اٹھانے کے بعد کچھ نہ کچھ حاصل تو ہوا تھا، یہ کچھ نہ کچھ کیا تھا؟ فی الحال اس کی کھوج ضروری تھی، وہ لمحہ بھر کے لئے گندھارا کی تاریخ کو بہت پیچھے چھوڑ آیا۔

گو کہ وہ ایک آرکیالوجسٹ تھا، اسے قدیم چیزوں کا علم، زمانہ سلف کی دستکاری و عمارات وغیرہ تاریخی باتوں کے علم میں کمال حاصل تھا، اس نے آرکیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی، قریہ قریہ گھومنا اس کا جنون تھا اور نوکری کا ایک حصہ بھی۔

وہ اپنے کام میں بڑا پرسکون اور پرجوش رہتا تھا، ہر نئے علاقے میں اس کے لئے دلچسپی کی بہت سی چیزیں تھیں، وہ ہر دفعہ ایک نئی ''دریافت'' کے تجربے سے گزرتا تھا۔

جیسا کہ اس نے کچھ دن پہلے مانکیالا کا عظیم سٹوپا دیکھا تھا کوئی دو ہزار سال پرانا، ایسی چیزوں کو دیکھ کر اس کے اندر تجسس کئی شعلوں میں ابھرتا تھا، کھوج کی ایک بھاپ اس کے دل جیسے انجن میں ابھرتی تھی، پھر یہ انجن پوری طاقت سے اسٹارٹ ہو جاتا تھا، کچھ ہی دیر میں نئی دریافتوں کی یہ ٹرین سبک خرامی سے چل پڑتی، مانکیالا کے سٹوپا نے اسامہ کو ایسے ہی بے چین کیا تھا جیسے عشیہ سے ہونے والی اچانک ملاقات نے، وہ عشیہ سے اچانک تصادم کی طرح کبھی کبھی کھیتوں میں ابھرتا تو اسامہ کا دل بھی ابھر کر باہر کی طرف لپکتا، جیسے سٹوپا کے قریب جانا چاہتا ہو، اسے چھونا اور کھوجنا چاہتا ہو، جیسے عشیہ کے قریب جانا چاہتا ہو، اسے جاننا اور حفظ کرنا چاہتا ہو۔

مانکیالا کا سٹوپا اور عشیہ برابر برابر دکھائی دیتے تھے، دونوں ہی اسامہ جہانگیر کی ذاتی ''دریافت'' تھے، دونوں کو دیکھ کر اس کے اندر تجسس اور بے چینی ابھرتی تھی، وہ دونوں کو ہی جاننے کے لئے سرگرداں تھا، کبھی کبھی وہ خود کو دو ہزار برس پرانی مخلوق سمجھنے لگتا، کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ سٹوپا کی تعمیر میں اس کا بھی ہاتھ ہے، وہ دو ہزار سال پرانی تاریخ کا حصہ بن جاتا، جب سٹوپا تعمیر کیا جا رہا تھا، وہ اس سٹوپا کے معماروں میں شامل تھا، کیچڑ گارے سے اٹے کپڑے پہنے، ہاتھ میں تیسی یا ایسا ہی کوئی اوزار تھامے، کسی آرکیٹیکٹ سے گفتگو کرتا، جو اس سٹوپا کے حجم اور پھیلاؤ کو دیکھ کر میٹریل بتا رہا تھا، کتنا مصالحہ لگے گا اور کتنا خرچہ درکار ہوگا؟ کب تک اس سٹوپا کی تعمیر مکمل ہو گئی۔

اسے سٹوپا کے اردگرد آج بھی وہ سینکڑوں مجسمہ ساز دکھائی دیتے جنہوں نے مجسمے تراش کر عبادت گاہوں میں سجائے تھے۔

اگر آج وہ لوگ اس آرکیالوجسٹ کو دیکھ لیتے تو مارے صدمے کے چل گزرتے، نیلی جینز پہ پی کیپ، کوٹ اور گلوز ہاتھوں پہ چڑھائے وہ دو ہزار برس پرانے معماروں کے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔

جیسے وہ اس اجنبی لڑکی کے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں تھا اور اجنبی لڑکی اس کے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں تھی، خیال کا پنچھی پھر سے اوزگل کی عمارت سے اڑتا ہوا ندی کے اس پل تک پہنچ جاتا تھا جہاں وہ روتی دھوتی، گھبرائی لڑکی اس نسخے کے لئے رو رہی تھی جس پر اس کی ماں کے لئے دوائیوں کے نام درج تھے۔

اسامہ جہانگیر کو ستوپا کے اندر لٹکے جالوں، پتھروں میں اگی گھاس، ہوا کے ساتھ جھولتی اور بے چین ہوتی دکھائی دے رہی تھی، مٹی کے اس ڈھیر میں قابل توجہ کچھ بھی نہیں تھا، نہ پیتل کے مجسمے نہ رنگ نہ پھول، نہ بدھ زائرین کے گروہ۔

جیسے کسی پھیکے منظر میں یہ عشیہ نامی روتی لڑکی کو کہیں نہیں تھی، اسامہ کو اپنی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی، وہ بے قرار سا اٹھ کھڑا ہوا، اس کی بے تاب نگاہیں اردگرد کچھ تلاش رہی تھیں، کچھ ایسا جو اس کی بے چینی کو دور کر دے۔

اس وقت ہوٹل اوزگل کی عمارت پہ بادل سجدہ ریز تھے، نیلا غبار دور تلک سایہ فگن تھا، خیال کے پنچھی ابھی بھی عمارت کے اوپر اڑ رہے تھے، ندی کے اس پل پہ ابھی بھی ایک کہانی محو سفر تھی، پل کے نیچے نیلے پانیوں پہ کوئی نئی ابھرتی داستان تیر رہی تھی۔

اسے کسی کے گرتے آنسو مضطرب کر رہے تھے، وہ بے قرار سا چلنے لگا، اسے نہیں خبر تھی کہ وہ کہاں جا رہا تھا؟ پھر بھی رکنا مشکل تھا اور چلنا بھی دشوار تر، وہ بنا سمت کا تعین کیے آگے بڑھ رہا تھا، بڑھتا چلا جا رہا تھا، اسے نیلے پانیوں پہ تیرتا وہ نسخہ بے قرار کر رہا تھا، جسے شوریدہ لہریں نجانے کس سمت بہا کر لے گئی تھیں۔

اسامہ کو وہ نسخہ دوبارہ نہیں مل سکتا تھا لیکن وہ اس نسخے کے مطابق دوائی ضرور لا سکتا تھا، اس نے عشیہ سے وعدہ جو کیا تھا، عشیہ کو اس کی ظالم ماں کے عتاب سے بچانے کے لئے وہ کسی میڈیکل سٹور تک رسائی چاہتا تھا اور اس کے لئے اسامہ کو ''اوزگل'' کی مدد درکار تھی۔

☆☆☆

آج دھوپ جی بھر کے دور تلک پھیلی تھی۔

ورنہ پچھلے کئی دنوں سے دھند کی دبیز چادر نے روزمرہ کے کئی کام ٹھپ کر رکھے تھے، گرم لحاف اور گرم کمرے سے نکلنے کو طبیعت امادہ نہیں ہوتی تھی، ہاتھ پیر ٹھنڈ سے اکڑ کر سن ہو جاتے تھے، مزاج بھی کسلمندی کا شکار رہتا۔

شانزے کو ویسے بھی سردی ضرورت سے زیادہ لگتی تھی، ان دنوں تو اس پہ سستی کا موسم اتر چکا تھا، کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔

اور وہ اپنے دل کے مزاج اور طبیعت کے ہر رنگ سے واقفیت رکھتی تھی۔

اس ساری ''کنڈیشنز'' کا تعلق کہیں نہ کہیں سے امام فرید شاہ سے جا ملتا تھا۔

وہ کیلنڈر پہ نگاہ جماتی اور گھنٹوں وہیں کھڑی رہتی، گو کہ امام کو آؤٹ آف اسٹیشن گئے ہوئے آج صرف دوسرا دن تھا پھر بھی شانزے مہروز کو لگتا تھا جیسے کئی سال اور کئی قرنیں گزر چکی ہیں۔

اور وقت ایسا بے رحم تھا جو گزرتا نہیں تھا، کچھوے کی اس چال پہ ہزار غصہ ہونے کے باوجود وہ قطعی طور پر بے بس تھی، کبھی کبھی دل کرتا تھا گھڑی کی سوئیوں کو الٹا پھیر دے، یا کوئی ایسا وظیفہ پڑھے جو امام کو لمحوں میں کھینچ کر واپس لے آئے، یا پھر کسی ساحرہ سے امام کو باندھنے کے لئے سحر سیکھ لے، آج کل اس کا دل ایسی ہی انہونی خواہشوں کو پال رہا تھا، کبھی کبھی اپنی بے بسی پہ اسے رونا آ جاتا، کبھی اپنی بے قراری پہ ہنسی آتی، کیا امام بھی ایسی بے چینی دل میں محسوس کرتا تھا، شانزے کا دل چاہتا کوئی ایسا آلہ دریافت کرے جو امام کے دل کی ہر کیفیت اور ہر موسم سے دور بیٹھے بھی اسے آگاہ کرتا رہے، گو کہ یہ سب خیالی باتیں تھیں پھر بھی وہ وقتی طور پر بہل ضرور جاتی تھی۔

اتنے دنوں سے دھند کے خوف کی وجہ سے وہ کمرہ بند کیے امام کے خیالوں میں گم رہی تھی، ان خیالوں میں شگاف تب پڑا تھا جب ممی نے اسے اچانک مژدہ جاں فزا سنایا، وہ خوشی کے مارے بے حال ہو گئی تھی، ممی کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ تھا، جس کی مہریں بتاتی تھیں یہ کوئی سرکاری نامہ ہے، شانزے لمحوں میں سمجھ گئی تھی، یہ اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر آیا تھا، اسے مقامی کالج میں بطور لیکچرار اپائنٹ کر لیا گیا تھا، یہ شانزے کے لئے ایک بڑی کامیابی تھی، وہ خوشی کے مارے بے حال ہو گئی۔

اسے کومے کو خوشخبری بھی سنانا تھی، لیکن وہ میٹھی چیز کے بغیر دوسرے پورشن میں جانا گناہ سمجھتی تھی، سو فنافٹ رس ملائی بنانے کے لئے کچن میں آ گئی۔

آج بہت دنوں بعد کچن کو رونق بخشی تھی، ممی اس کا جمود ٹوٹنے پر بہت خوش دکھائی دی تھیں، اتنے دنوں سے اکلوتی بیٹی کو بوریت کا شکار دیکھ رہی تھیں، اس نئی خبر نے شانزے کے اندر تھرل سا بھر دیا تھا، وہ بڑی ترنگ میں رس ملائی بنا رہی تھی، آدھے گھنٹے بعد سویٹ ڈش تیار تھی، اس نے ڈونگہ فریج میں رکھا اور ممی کے یاد دلانے پر بولی۔

''میں ابھی یہ کام بھی نمٹا آتی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر اپنا شولڈر بیگ اٹھایا، کریڈٹ کارڈ اور رقم کا ڈھیر پرس میں ڈالا اور کومے کی طرف چلی آئی، وہ اسے ڈونگہ اٹھائے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔

''حلیم لائی ہو یا چکن؟ کبھی کبھی دعائیں ایسے بھی قبول ہو جاتی ہیں، کاش کچھ اور بھی مانگ لیتی۔'' کومے پالک کے ڈھیر سے نبرد آزما تھی، پلوشہ نے اس کے ذمے پالک پکانا لگایا تھا، آج کل وہ اسے خانساماں بنانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں اور کومے تھی سدا کی کام چور، کچن سے اس کی جان جاتی تھی، کوکنگ سے اسے سخت الرجی تھی، سو اس وقت پالک کے ڈھیر کو ہٹا کر شانزے کے ہاتھ میں موجود ڈونگے کی طرف لپکی تھی۔

''خوشبو تو نہاری کی ہے۔'' کومے ناک سکیڑ کر بے تابی سے بولی تھی، اس کے غلط قیافے پر شانزے نے بھوں اچکا کر کہا۔

''اپنی آنکھوں کے ساتھ حس شامہ کا بھی علاج کرواؤ، خاصا افاقہ ہو گا۔'' اس نے گھور کر کومے کی طرف دیکھا۔

''یہ رس ملائی ہے، نہاری نہیں۔'' کومے کی امیدوں پہ پانی پھیر کر شانزے مزے سے مسکرائی تھی، کومے کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا، وہ ایک مرتبہ پھر مرے مرے انداز میں چھری اور کٹر اٹھا کر پالک کاٹنے لگی تھی، چہرے پہ خاصے برہم تاثرات تھے۔

''کس خوشی میں لائی ہو؟'' کومے نے بیزاری سے پوچھا، کاش رس ملائی کی جگہ کوئی سالن ہوتا، کم از کم لنچ کی مشقت سے تو بچ جاتی، پالک بنانا اور کاٹنا بڑا وقت طلب کام تھا، وہ ناک تک بیزار تھی۔

''مابدولت نوکری یافتہ ہو گئے۔'' شانزے نے تجسس کری ایٹ کرنے کی بجائے سیدھا سیدھا بتا دیا تھا، کومے کے ہاتھ سے چھری گر گئی تھی، اس نے بے یقینی سے شانزے کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔''

''ہاں۔'' وہ کھلکھلائی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا، تم امام اور ہمان بھائی کی طرح مصروف نہیں ہو سکتی، میں یہ صدمہ کیسے برداشت کروں؟'' اس نے حواس باختہ ہو کر بے تابی سے کہا تھا، شانزے اس کی کیفیت سمجھتی تھی، وہ شروع سے تنہائی کی ڈسی ہوئی تھی، یہ تو شانزے کا آسرا تھا جو کومے کے دن بھی گزر جاتے تھے، ورنہ وہ تو بھائیوں کی مصروفیات سے گوڈے گوڈے عاجز تھی۔

''غم نہ دکھاؤ، میں تمہارے بھائیوں کی طرح جاب کو پیاری نہیں ہو جاؤں گی۔'' شانزے نے اسے تسلی دی۔

''لیکن تم جاب کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں ضرورت کیا ہے؟ محض بوریت سے بچنے کے لئے؟ خواہ مخواہ کسی حق دار کا حق مارو گی۔'' کومے نے لگے ہاتھوں اس کی دھلائی بھی کی تھی۔

''بوریت سے نہیں، تمہارے بھائی کی بے رخی سے بچنے کے لئے۔'' شانزے بھی جلا کر بولی تھی، کومے خواہ مخواہ ہی گڑبڑا گئی۔

''اب ایسا بھی میرا بھائی سنگ دل نہیں۔'' اسے صفائی کے لئے کوئی خاص جملہ میسر نہیں تھا، اس لئے آئیں بائیں کر کے رہ گئی تھی، شانزے نے اسے گھور کر دیکھا۔

''اتنا نرم دل بھی نہیں۔''

''میرے منہ پہ تو نہ کہو۔'' کومے تلملائی۔

''نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا، وہ بدلنے والا نہیں۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی یاسیت اتر آئی تھی۔

''امید پہ دنیا قائم ہے۔'' کومے نے جیسے شانزے کو پچکارا تھا، وہ ایک مرتبہ پھر بری طرح گھور کر رہ گئی، کومے نے اٹھ کر پالک کے پتے سمیٹے تھے، ڈنڈیاں اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالیں، کٹی ہوئی پالک کو کوکر میں چڑھایا تھا پھر اسے بنے سنورے دیکھ کر ٹھٹک گئی، پہلے اسے لش پش دیکھ کر خیال نہیں آیا تھا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' اسے اچنبھا سا ہوا۔

''شاپنگ کے لئے جا رہی ہوں، جوائننگ میں بس ایک ہفتہ موجود ہے، ممی نے کہا تھا کچھ نئے پرنٹ خرید لوں۔'' شانزے نے وجہ بتائی تھی۔

''تمہیں کچھ چاہیے تو نہیں؟'' اب وہ جلدی میں پوچھ رہی تھی، کومے کو اپنے دو چار ارجنٹ کام یاد آ گئے تھے، شانزے نے حامی بھر لی تھی، کیونکہ شانزے ہی اکثر کومے کی بھی شاپنگ وغیرہ کرتی تھی۔

پھر جب شانزے مال میں دو گھنٹے خوار ہو کر باہر نکلی تب اچانک دھوپ کی چادر لپٹ گئی تھی، جانے کہاں سے سرمئی بادل امڈ آئے تھے، پھر لمحوں میں بوندیں بھی گرنے لگیں۔

شانزے باقی ماندہ شاپنگ کا خیال ترک کر کے جلدی جلدی کومے کی چیزیں خرید رہی تھی، کچھ کتابیں، کچھ گروسری، پھر بیکری میں گھس گئی تھی، کافی سارے کوکیز، سوئیس، چپس اور نمکو پیک کروا کر جیسے ہی شانزے نے والٹ ہاتھ میں پکڑا، شاپر اٹھائے اور باہر نکلنے لگی تھی تو اچانک اندر آتے ایک لمبے وجود سے بری طرح سے ٹکرا گئی، غلطی نجانے کس کی تھی تاہم آنے والے لمبے تڑنگے جوان نے خواہ مخواہ شانزے پہ چڑھائی کر دی، حالانکہ شاپرز اور والٹ تو شانزے کا گرا تھا جسے اٹھا کر اس لڑکے نے شانزے کو تھمایا، تین شاپر اور ایک والٹ، لیکن عجلت میں شانزے نے دیکھا ہی نہیں، تین شاپر تو تھے مگر والٹ نہیں تھا، اوپر سے اس لڑکے کی چبھتی نظریں شانزے کے کانوں میں لٹکی بالیوں پہ جمی ہوئی تھیں، اسے اچانک سامنے کھڑے لڑکے کی آنکھوں سے وحشت سی ہوئی تھی، اس نے گھبرا کر شاپرز دبوچے تو احساس ہوا، اس کا سنہرا والٹ کہیں نہیں تھا، شانزے کا دل دھک سے رہ گیا، اس نے بڑی ہوشیاری سے اس لڑکے کو والٹ پچھلی پاکٹ میں گھساتے دیکھ لیا تھا، حالانکہ اس لڑکے نے بڑے محتاط اور ہوشیار انداز میں اپنا کام کیا تھا، شانزے کی بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

''میرا والٹ دو۔'' شانزے نے غصے کے مارے تیز لہجے میں کہا، عموماً وہ خاصی نرم مزاج تھی، بہت بلند آواز میں نہیں بولتی تھی، لیکن اس وقت چلا رہی تھی، اس لڑکے کی دیدہ دلیری کے کیا کہنے تھے، وہ اسے چلاتا دیکھ کر بری طرح سے دہاڑا۔

''مجھ پہ الزام لگاتی ہو؟ کیا پاگل ہو۔'' اس لڑکے کے نتھنے پھول گئے تھے، شانزے کی آنکھیں کھل گئیں۔

''تمہاری پاکٹ میں میرا والٹ ہے، میں پاگل نہیں، نہ الزام لگا رہی ہوں۔'' شانزے نے چیخ کر کہا۔

''پاگل نہیں تو اندھی ضرور ہو، میری پاکٹ میں میرا اپنا والٹ ہے۔'' اس نے چبا چبا کر جتایا تھا، پھر پاکٹ سے اپنا چرمی والٹ نکال کر دکھایا، جو ہو بہو شانزے کے والٹ جیسا تھا، وہ بھونچکی رہ گئی۔

''اب بتاؤ، یہ والٹ کس کا ہوا۔'' اس نے مغرورانہ انداز میں پوچھا، شانزے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''اس بیکری پہ میں اکثر آتا ہوں، یہاں کے لوگ مجھے جانتے ہیں، چاہو تو گارنٹی لے لو۔''

اس نے بیکری کے مالک کو آواز دے کر اپنی صفائی پیش کروائی تھی، شانزے کچھ اور بھی شرمندہ ہو گئی، کیا پتا اسے غلط فہمی ہو، پھر بھی شانزے کا والٹ کہاں گیا تھا؟ اس نے مزید بحث میں بے عزتی محسوس کی تھی، سو ''ایکسکیوزمی'' بولتی باہر نکل گئی، حالانکہ اس کا دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا، اس کی گنہ گار آنکھوں نے خود اس لڑکے کو والٹ چھپاتے دیکھا تھا پھر بھی، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی، گو کہ والٹ میں اب بھی بھاری رقم موجود تھی، پھر بھی اس نے والٹ پہ لعنت ڈالی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی پارکنگ تک آئی، اسی پل کوئی سایہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا، شانزے نے گردن موڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی تھی، کسی نے اس کی کنپٹی پر پسٹول رکھ دیا تھا، شانزے کی جیسے جان نکل گئی۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھا جب فون کی گھنٹی کا ناگوار شور سماعتوں میں اترا، اس نے بیزاری سے تکیہ کانوں پہ رکھا تھا، ایک تو اس کی سماعتیں بڑی تیز تھیں، اس کی جگہ ہمان ہوتا تو ڈھول کی آواز پہ بھی نہ اٹھتا، وہ ایسی ہی ڈھیٹ نیند لیتا تھا چاہے کچھ بھی ہو جاتا، اٹھنا اس نے اپنے وقت پہ ہوتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک تو فون کے بند ہونے کا انتظار کرتا رہا، گرم لحاف سے نکلنے کو دل نہیں کر رہا تھا، پھر اس اجنبی جگہ نیند بھی بہت کم آتی تھی، ویسے بھی وہ رات کو بڑی دیر سے سویا تھا، کچی نیند سے اٹھنا بھی خاصا محال تھا، پھر بھی امام نے ہمت کر ہی لی، جیسے ہی وہ ٹی وی لاؤنج میں پہنچا تب تک فون کی منحوس گھنٹی بند ہو چکی تھی، امام کو بے طرح غصہ آیا تھا، وہ دانت کچکچا کر فون کو گھورتا ہوا قریبی کاؤچ پہ نیم دراز ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد پھر سے فون کی گھنٹی بجی، امام نے سستی سے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا، دوسری طرف نجانے کون تھا، امام ماتھے پہ بل ڈالے خاموشی کے ساتھ دوسری طرف کی بات سنتا رہا، اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بڑھتا جا رہا تھا۔

''وہاٹ؟'' کچھ ہی دیر میں وہ شدت سے دہاڑا تھا یوں کہ سرکاری بنگلے کے در و دیوار ہل کر رہ گئے تھے۔

''اتنے بہادر ہو تو پہلے اپنا تعارف کروا دو۔'' رات کی تاریکی میں اس کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی، حالانکہ اس نے لہجے کو کنٹرول میں رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی، پھر بھی وہ غصیلی آواز کو روکنے کی سعی نہیں کر سکا تھا، اس کے ٹھنڈے لہجے کا برفیلا پن دوسری طرف موجود شخصیت کو باور کروا چکا تھا کہ ''سیاحت پاکستان'' کے اس آفیسر سے بات کس انداز میں کرنا پڑے گی؟ اور یہ بھی کہ وہ عام سرکاری آفسروں سے بہت مختلف تھا، جو آج سے پہلے اس سرکاری بنگلے میں قیام کر چکے تھے۔

''تعارف کا مرحلہ بھی آ جائے گا، ایسی بے تابی کیوں؟'' ایئر پیس سے پر مغرور آواز ابھری تھی، امام کی گرفت ریسیور پر سخت ہو گئی تھی، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''میرا وقت اتنا بیکار نہیں ہے۔'' امام نے سخت لہجے میں جتا دیا۔

''وقت تو میرا بھی بیکار نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے مسکراتی آواز ابھری تھی۔
''لیکن مجھ سے زیادہ قیمتی بھی نہیں۔'' امام اب بھی تلخ ہی تھا۔
''دل بہلانے کو خیال اچھا ہے۔'' اس کا انداز جلتی پہ تیل ڈالنے والا تھا، امام نے خاصے ضبط کا مظاہرہ کیا، وہ تب تک کوئی ٹھوس ایکشن نہیں لے سکتا تھا، جب تک اسے معلوم نہ ہو جاتا کہ دوسری طرف ہے کون؟
''کہو، کال کیوں کی؟'' امام نے گفتگو کو اسی موڑ پر مختصر کر دیا تھا، وہ اس اجنبی سے بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا، وہ بھی اس صورت میں جب امام کو خبر نہیں تھی کہ دوسری طرف لائن پہ ہے کون ہے؟ عین ممکن تھا، ائیربیس کے پار علاقے کا کوئی سردار ہوتا، سو امام کو محتاط ہونا ہی پڑا، ابھی تو وہ سروے کے لئے آیا تھا، ایک دو ہفتے تک جب چارج لینے مستقل یہاں آتا تو ایک لمبا عرصہ اسے یہاں قیام کرنا تھا، سو ان سرداروں سے بنا کر رکھنی ضروری تھی۔
''فون پر ساری باتیں تو نہیں ہو سکتیں۔'' مسکراتی ہوئی آواز پھر سے ائیربیس کے سوراخوں سے ابھری۔
''تو پھر؟'' امام چونکا، گو کہ وہ اس کا مدعا سمجھ رہا تھا پھر بھی اس کے منہ سے سننا ضروری تھا۔
''تو پھر یہ کہ ملنا تو ضروری ہے نا؟'' انداز میں معنی خیزیت واضح تھی۔
''اتنا بھی نہیں۔'' امام نے دوٹوک انکار کر دیا۔
''کیوں؟'' دوسری طرف بے تابی نظر آئی۔
''میں اس کیوں کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ اس کا پابند ہوں۔'' امام کا لہجہ بلا کا روکھا اور سرد ہو گیا۔
''ضرورت تم خود محسوس کرو گے۔'' اس نے چیلنجنگ انداز میں کہا تھا، جیسے اسے امام کا دوٹوک انکار برا لگا تھا، اس کے انداز میں ناگواریت واضح تھی۔
''یہ تو ممکن نہیں۔'' امام نے اس کی خوش فہمی دور کرنا چاہی۔
''دعوے غلط بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔'' اس نے امام کو ڈروا دیا تھا، وہ پہلی مرتبہ سنجیدگی سے مسکرایا۔
''امام کے دعوے غلط نہیں ثابت ہوتے۔'' امام پر اعتماد تھا۔
''وقت سے پہلے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں امام کو کیا جتا رہا تھا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھ گیا۔
''اس تمام گفتگو میں مجھے یہی بات ڈھنگ کی لگی۔'' امام کا لہجہ طنزیہ تھا۔
''ابھی تو ابتدا ہے آگے دیکھنا ہوتا کیا ہے؟'' اس کا طنز وہ با آسانی سمجھ گیا، سو بدلہ اتارنا بھی ضروری تھا۔
''میں ہر طرح کے حالات فیز کر سکتا ہوں۔'' امام نے اس کو منہ توڑ جواب دیا۔
''یہ تو میں جان گیا ہوں۔'' اس نے بھی جتلا کر کہا۔

''کیسے؟'' امام چونکا۔

''جگرے والے ہو تبھی یہاں ہو۔'' اس نے معنی خیزیت کی انتہا کر دی تھی۔

''کیوں؟ یہ علاقہ غیر ہے؟ سرکار کے کنٹرول سے باہر ہے؟'' امام نے معصومیت سے پوچھا۔

''ممنوعہ تو ضرور ہے، کوئی سمجھے نہ سمجھے۔'' دوسری طرف سے ترنت جواب آیا۔

''ممنوعہ؟'' امام پھر سے ٹھٹکا۔

''ہاں..... نا۔''

''کیوں سے؟'' اسے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی، پھر بھی اس کے منہ سے اگلوانا چاہتا تھا۔

''جہاں سے سروے کا ارادہ ہے۔'' بالآخر اس نے فون کرنے کی وجہ بتا دی تھی، امام کی پیشانی پہ بے ساختہ بل پڑ گئے، اس کا یقین بالکل نہیں تھا، فون کرنے والا اس کی توقع کے عین مطابق ہنو قبیلے کا فرد تھا۔

''میں اپنی ڈیوٹی پہ ہوں۔'' امام کو جتلانا ہی پڑا۔

''چھوٹی موٹی بے ایمانی تو بنتی ہے۔'' وہ اسے اکسا رہا تھا، دوسرے معنوں میں آفر کر رہا تھا یا ''دانہ'' پھینک رہا تھا۔

''آئم سوری مجھے ''حلال'' کھانے کی عادت ہے۔'' امام نے ٹکا سا جواب دے کر اس کا منہ بند کروانا چاہا، لیکن دوسری طرف بھی کوئی کایاں انسان تھا، بلا کا تیز طرار، حاضر دماغ، سو ترنت بولا۔

''حرام کا سواد بھی برا نہیں۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا، امام کو جی بھر کے تاؤ آیا، اسے فی الحال جان چھڑوانا مشکل لگ رہا تھا۔

''اگر تم چاہو تو؟'' اس نے پھر سے امام کو اکسایا۔

''تمہاری باتوں کا مفہوم کیا ہے؟'' امام نے لب بھینچ کر پوچھا، باہر گھٹا گھور تاریکی تھی، باہر کی تاریکی اب اندر بھی آ رہی تھی، وہ خود کو تاریکی میں محسوس کر رہا تھا، ایسی تاریکی جو امام کے گرد دائرہ بنا رہی تھی، وہ تاریکی کے حصار میں تھا، اس حصار کا توڑ چاہتا تھا۔

''کام کی بات کا خیال بہت دیر سے آیا؟'' خاصے اچنبھے سے کہا گیا۔

''آ تو گیا نا، اب جلدی سے بولو۔'' امام کی نگاہیں گھڑیال پر تھیں اور اسے گھسیٹ روم کی طرف کھٹکے کی آواز بھی آ رہی تھی، نجانے کون جاگا تھا؟ قاسم عاشر یا وقاص؟ وہ جلدی سے بات سمیٹ کر فون بند کرنا چاہتا تھا، کیونکہ قاسم اگر جاگ جاتا تو اس کی تفتیش بھگتنا آسان نہیں تھا، اس نے پہلی فرصت میں امام کو ٹرانسفر کروانے کا مشورہ دینا تھا جو کہ امام کو منظور نہیں تھا، کیونکہ بات وہیں پہ آ جاتی تھی، ایک دفعہ فیصلہ کر کے وہ ہٹتا نہیں تھا، یہ اس کی بڑی پرانی عادت تھی۔

''جس علاقے کا تم نے سروے کرنا ہے، وہ زمین ہماری ہے، تو تم یہ ارادہ بدل دو۔'' کچھ دیر بعد وہ کام کی بات پہ آ چکا تھا وہی اصل بات جس کا امام کو انتظار تھا، اس نے گہرا سانس کھینچ کر لمحہ بھر کے لئے بھی سوچے بغیر جواب دیا۔

''اب تم تا یک سے مت ہو۔'' اس نے غصے میں کہا۔
''اچھا تو کیا کروں؟'' امام کا انداز مصالحانہ تھا، گو کہ وہ قاسم کے غصے کا سبب سمجھتا تھا تاہم فی الحال اس موضوع پہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''پہلے تو یہ بتاؤ فون کس کا آیا تھا۔'' وہ بھی قاسم تھا، امام کا دوست، پہلی فرصت میں ہی اس کے پیچھے پہ ہاتھ رکھا تھا، امام اندر ہی اندر تلملایا۔
''گھر سے تھا۔'' اس نے بڑی سنجیدہ شکل بنائی تھی۔
''جھوٹ۔'' قاسم کو یقین نہ آیا۔
''سچ کہہ رہا ہوں۔'' امام نے دانت پیس لئے تھے، ایک تو یہ سورے جیسا دوست بھی نا۔
''سچ بولتے ہوئے نگاہ کا چرانا ضروری نہیں۔'' قاسم نے اس کا جھوٹ مہارت سے پکڑ لیا، اسے گہرا سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑنے ہی پڑے تھے۔
''کون دھمکی دے رہا تھا؟'' اس نے تنک کر پوچھا۔
''کسی کی مجال ہے جو مجھے دھمکی دے۔'' امام نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، وہ قاسم کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''جس کی مجال تھی اس نے دھمکی دی، بولو وہ تھا کون؟'' قاسم کی سنجیدگی قابل دید تھی۔
''اسی علاقے کا بندہ تھا۔'' امام نے سرسری سا بتایا۔
''بندے کا کوئی نام بھی تھا؟'' وہ چڑ گیا۔
''ہوگا بھلا سا۔'' اس نے سابقہ لہجے میں کہا۔
''امام!'' قاسم نے کشن اٹھا لیا تھا، امام کو سیدھا ہونا پڑا، ورنہ قاسم کے تیور خاصے خطرناک تھے۔
''آئی تھنک صندیر خان تھا۔'' بالآخر کوئی چارہ کار نہ پا کر اس نے اگل ہی دیا، قاسم کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔
''کون صندیر خان؟''
''بھتیجا ہے اس کا، اولاد نرینہ تو ہے نہیں، پھر کوئی بھانجا، بھتیجا ہی ہوگا۔'' امام کا انداز پرسوچ تھا۔
''کس کا بھتیجا؟'' قاسم کا دل کسی انہونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا، اس نے بے تابی سے پوچھا۔
''سردار کبیر ہوتُو کا بھتیجا۔'' بالآخر امام نے دھماکہ کر دیا تھا، قاسم مارے حیرت کے اچھل پڑا، اس کی آنکھوں میں اچانک وحشت سی پگھل کر قطرہ قطرہ ٹپکنے لگی تھی، اسے آنے والے خطرات کی آہٹیں سنائی دینے لگیں جو پہلے سے اس کی لاشعور میں تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ)

وہ کبھی ملے وہ کہیں ملیں
سحرش بانو

PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

اس نے اپنے سامنے کھڑے شخص کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی اس کی آنکھوں میں پھیلنے والی دھند نے اس کی اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا، اس کی آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تن گئی تھی، ویسی ہی دھند جیسی اس کی زندگی پر چھا چکی تھی اور جس نے اس کی زندگی میں موجود ہر چیز کو نگلنا شروع کر دیا تھا، اس کی خوشی کو، اس کی ہر امید کو، اس کی آنکھوں میں موجود خوابوں کو، اس کے مستقبل کو اور.....اور سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں نظر آتی اور وجود سے چھلکتی محبت کو، اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے وہاں سے غائب ہو جانے کی دعا مانگی تھی، اس وقت وہاں کھڑے ہو کر وہ یہی کر سکتی تھی، چند سیکنڈز بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ہر چیز ویسے ہی تھی اس کی بے بسی تھی، اپنی جگہ پہ تھی، سامنے کھڑے مرد کی آنکھوں سے چھلکتی بیگانگی، اجنبیت اور..... اور نفرت تھی، مگر یہ وہ بیگانگی، اجنبیت یا نفرت نہیں تھی جو اسے تکلیف دے رہی تھی، یہ اس شخص کے چہرے اس کی آنکھوں اور اس کے پورے وجود سے چھلکتی، بے اعتباری تھی جس نے اسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔

Un trustworthy

decisive is better than death

کچھ لفظ سچے ہوتے ہیں مگر ان کی سچائی بہت غلط وقت پر ظاہر ہوتی ہے، اس نے ساری ہمتیں پھر سے جوڑ کر سامنے کھڑے مرد کو دیکھنے کی کوشش کی تھی، کوئی رحم، کوئی ترس ذرا سی ہمدردی، اس کی کوشش ناکام گئی تھی، گنجائش کہیں نہیں تھی نہ وہ دینے کو تیار تھا، وہ سامنے کھڑے شخص نے کوئی وضاحت کوئی صفائی نہیں مانگی تھی، وہ یہ چیز وہاں دینے بھی نہیں آئی تھی، مگر سامنے

مکمل ناول

کھڑے شخص کے تیور، وہ نہ مدد مانگ سکی تھی نہ وضاحت دے سکی تھی اور اس کی خاموشی سامنے کھڑے شخص کو ہر الزام کے سچ ہونے کا یقین دلا رہی تھی، مگر یہ چیز اب معنی نہیں رکھتی تھی، جہاں بے اعتباری آ جائے وہاں بھروسہ قائم نہیں رہتا اور جہاں بھروسہ قائم نہ رہے وہاں رشتے نہیں جوڑے جا سکتے، سامنے کھڑے مرد نے بے تاثر لہجے میں اسے جتایا تھا، اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔

''ایک وقت ہوتا ہے جب خدانخواستہ آپ سے غلط کام بھی ہو جائے تب بھی آپ بچ جاتے ہیں، آپ کی پکڑ نہیں ہوتی آپ کو معافی دے دی جاتی ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جو آپ کا وقت ہوتا ہے، یہ وہ وقت ہوتا ہے جو شکر کا وقت ہوتا ہے، ایک وقت ہوتا ہے جب آپ کے کیے اچھے کام کا رزلٹ بھی اچھا نہیں آتا آپ کے سیدھے پڑتے قدم بھی الٹے گنے جانے لگتے ہیں، یہ وہ وقت ہوتا ہے جو آپ کا وقت نہیں ہوتا، یہ وہ وقت ہوتا ہے جو صبر کا وقت ہوتا ہے، اس کے قدم واپسی کے لیے اٹھنے لگے تھے، واپسی جو ہمیشہ تکلیف بھی تھی جس کے واپسی کے لیے اٹھتے قدموں سے دھول لپٹی تھی اور جس کی آنسو بھری آنکھوں کے آگے گہری دھند تنی تھی۔''

☆☆☆

اس نے بہت آہستگی کے ساتھ ہینڈل گھمایا تھا، کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر کمرے کے وسط میں زمین پہ بیٹھی عورت پہ پڑی تھی، اس کے قدم ایک ثانیے کو ٹھٹکے تھے، پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی تھی، وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس عورت کے قریب آ کھڑا ہوا، وہ عورت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی، آہٹ پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا، وہ بنا دیکھے بھی بتا سکتا تھا وہ رو رہی تھی جس جگہ یہ وہ عورت تھی اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ اس وقت یہی کر رہا تھا، اس نے ایک بار پھر گہری سانس بھری اور ذہن میں ایک بار پھر وہ سب دہرایا جو اسے سامنے بیٹھی عورت سے کہنا تھا اور جسے وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے دل میں دہرا رہا تھا، اس نے بہت دھیمی آواز میں سامنے بیٹھی عورت کا نام لیا تھا، اس نے سر نہیں اٹھایا وہ اس کی پکار پہ متوجہ نہیں ہوئی تھی اس چیز نے اسے تکلیف دی، دوسری بار اس نے ذرا بلند آواز میں اسے پکارا تھا، عورت نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا اور وہ......وہ اپنی جگہ پہ جم گیا تھا، یہ اس عورت کے چہرے پہ پھیلی اذیت، تکلیف اور آنسو تھے جس نے اسے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، سامنے بیٹھی عورت کے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ خاموش کھڑا تھا، وہ خاموش تھا اور اسے لگ رہا تھا وہ صدیوں کچھ بول نہیں سکے گا، اسے بھول گیا وہ کہاں کھڑا ہے اسے بھول گیا وہ کیا کہنے آیا تھا، پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ جو الفاظ جوڑ رہا تھا وہ بولنے میں اسے ڈیڑھ منٹ نہیں لگا تھا، وہ کسی انکشاف کے زیر اثر کھڑا تھا اور انکشاف ایسا جان لیوا تھا کہ جس نے اسے ساکت کر دیا تھا۔

''جب کسی عورت کے آنسو کسی مرد کو تکلیف دینے لگیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' اس کے کانوں میں اپنے باپ کی آواز گونجی تھی۔

''سمپل اس مرد کو اس عورت سے محبت ہو گئی ہے۔'' اسے اپنا بے فکرا لہجہ یاد آیا تھا اور اسے اپنا آپ ہارتا محسوس ہوا۔

''آپ سب سے اوپر والی سیڑھی پہ کھڑے ہوں آپ کو لگے آپ جیت چکے ہیں اور پھر اچانک سے آپ کو دھکا لگے اور آپ اس اوپر والی سیڑھی سے نیچے زمین پہ منہ کے بل گرا دیے

جائیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔" اس کے ذہن میں دانش عزیز کے الفاظ گونجے تھے، کاش دانش عزیز اس وقت ہاں موجود ہوتا تو وہ اسے بتاتا کہ سب سے اوپر والی سیڑھی سے گرنا اور منہ کے بل گرنا کیسا ہوتا ہے، اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی، سامنے بیٹھی عورت ابھی بھی رو رہی تھی، زارو قطار رو رہی تھی اور اس کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی، اس کی بے بسی بڑھتی جا رہی تھی، اس کا نقصان بڑھتا جا رہا تھا اور وہ خاموش کھڑا تھا، وہ کچھ کہنے کچھ سننے کے قابل نہیں رہا تھا۔

کیا یوں پر پھیلے اپنے اس شاندار اور محل نما گھر کے سب سے چھوٹے اور تاریک کمرے میں کھڑے اس پر انکشاف ہوا تھا اس عورت سے محبت کا جسے وہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس انکشاف نے اسے پتھر کا کر دیا تھا۔

☆☆☆

مغرب کی اذان ہو رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تھی، وضو کر کے نماز ادا کر کے وہ سیدھی کچن میں چلی آئی تھی، کالج سے آنے کے بعد وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ بنا کھانا کھائے سو گئی تھی اور اب زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔

"کیا پکایا ہے آج؟" کولر سے پانی نکالتے اس نے ثمن سے پوچھا تھا۔

"مٹر قیمہ، چکن پلاؤ اور کسٹرڈ۔" ثمن نے بنا مڑے جواب دیا تھا، پانی منہ کی طرف لے جاتا اس کا ہاتھ راستے میں ہی رکا تھا، اتنا اہتمام اور وہ بھی ان کے گھر جہاں ایک دن کا سالن بھی دو تین دن آرام سے چل جاتا تھا، ایک لمحے کو اسے حیرت ہوئی تھی اگلے لمحے اسے اس اہتمام کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔

"تو آ گیا انہیں خیال کے ان کا کوئی گھر

بھی ہے؟'' گاس سلیب پہ دھرتے اس نے سر جھٹکا۔

''ابو کی کال آئی تھی بتا رہے تھے کہ ان کے ساتھ کچھ دوست بھی ہوں گے کھانے پہ اہتمام ہونا چاہیے۔'' ثمن نے آٹا نکالتے دھیمی آواز میں بتایا تھا۔

''اچھا اور انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس اہتمام کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''بری بات بیٹا ایسے نہیں کہتے باپ ہیں وہ تمہارے۔'' اس کی ماں نے اندر آتے اسے ٹوکا تھا۔

''انہوں نے کب یہ احساس دلایا امی کہ وہ ہمارے باپ ہیں، صرف پیدا کر دینا کافی نہیں ہوتا باپ کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں جو انہوں نے کبھی پوری نہیں کیں۔'' اپنے لئے چاول نکالتے اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا، اپنی ماں کا باپ کے حق میں بولنا اسے یونہی غصہ دلا دیتا تھا۔

''وہ جیسے بھی ہیں امن تمہارے باپ ہیں اور آئندہ میں نہ سنوں تمہیں ان کے بارے میں ایسے بات کرتے۔'' اس کی ماں نے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا وہ خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

وہ امن تھی امن علی، اپنے ماں باپ کی چھوٹی بیٹی، اس سے بڑی ثمن تھی، اس کے ماں باپ کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا، اس کا باپ احسان علی اپنے ماں باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، چھوٹا تھا تو لاڈلا بھی تھا، ماں باپ اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہ پانچ سال کا تھا جب باپ نے بڑی چاؤ سے اسکول میں داخلہ دلوایا، یہ چیز پورے خاندان کے لئے باعث حیرت تھی کہ ان کے پورے خاندان میں آج تک کسی نے اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، خود اس کے اپنے دونوں بڑے بھائی نان پکوڑے اور چنا چاٹ کا ٹھیلہ لگاتے تھے، باپ نے ساری عمر چوکیداری کرتے گزاری تھی، صبح صبح صاحب کو اپنے بچوں کو سکول لے جاتے دیکھتا تو دل میں خواہش ابھرتی کہ میں بھی ایسے ہی انگلی پکڑ کر اپنے بچوں کو سکول لے کے جاؤں، بڑے دونوں کی باری حالات اور جیب اجازت نہیں دیتے تھے، سو مجبوراً انہیں چنا چاٹ اور نان چھولے کی ریڑھی لگا کر دی اب احسان علی کی باری دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ بیٹے کو پڑھانا ہے، افسر بنانا ہے، یہی خواب اس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں بھر دیا اور ماں نے اپنے دوسرے چاروں بچوں کی آنکھوں میں۔

''تیرا ویر احسان پڑھ لکھ کر وڈا افسر بنے گا۔'' ماں اپنی بیٹیوں سے کہتی۔

''ہمارا احسان بہت بڑا افسر بنے گا۔'' بہنیں فخر سے آس پڑوس والی سہیلیوں کو جتاتی۔

صبح سکول بھیجنے کا وقت ہوتا تو سارا گھر اس کے اردگرد اکٹھا ہو جاتا، ماں ہزاروں دعائیں پڑھ کے پھونکتیں، باپ فخر سے انگلی تھامے سکول چھوڑنے جاتا، احسان علی نے میٹرک پاس کیا تو باپ نے ہمت واستطاعت سے بڑھ کر پورے خاندان میں لڈو بانٹے، کہہ سن کر کلرک بھرتی کروایا، ماں باپ سجدہ شکر ادا کرتے نہ تھکتے، بھائیوں کے سینے فخر سے چوڑے ہو گئے، بہنیں ہر وقت خیر کی دعائیں پڑھتی اس کی لمبی عمر اور کامیابیوں کی دعائیں مانگتی نہ تھکتی، خاندان برادری میں جہاں جہاں جس جس گھر میں بیٹیاں تھیں وہاں وہاں احسان علی کے رشتے کی آس لگا لی گئی، اماں ابا کو لگتا اب مشکل دور گزر گیا اور اچھا

وقت آ پہنچا ہے، احسان علی خود بھی بڑی بڑی باتیں کرتا، بڑے بڑے خواب دیکھتا اور انہیں بھی دکھاتا، پر نجانے کب کیسے جوئے کی لت لگی اور اپنے ساتھ ساتھ ان سب کے خواب بھی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیئے اس نے، ماں کی التجائیں باپ کا واویلا، بھائیوں کی خفگی، بھابیوں کے طعنے اور بہنوں کا رونا کوئی بھی اسے واپس نہیں لا سکا، وہ کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا اور جب تک باہر رہتا گھر والے کلمہ شکر ادا کرتے رہتے گھر واپس آتا تو گھر کو گھر نہیں رہنے دیتا تھا، جہنم بنا دیتا تھا، وہ بدل چکا تھا اور اتنا بدل چکا تھا کہ انہیں وہ احسان علی لگتا ہی نہیں تھا، وقت اور زندگی آگے بڑھے تو ابا بیچارہ ناکام اور تشنہ آرزوئیں لئے قبر میں جالیٹے بھائیوں نے اپنے اپنے گھر الگ کر لئے بہنیں مہینوں پلٹ کے نہ دیکھتیں تھیں، گھر میں اماں اور احسان علی ہی رہ گئے تھے تب انہیں کسی نے مشورہ دیا، احسان علی کی شادی کا اور شادی ہوتے ہی سدھر جانے والوں کی ایسی مثالیں دی کہ اماں کو ہر مسئلے کا حل احسان علی کی شادی میں نظر آنے لگا، خاندان برادری والوں نے تو سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگائے۔

آس پڑوس اور جان پہچان والوں نے بھی صاف اور کورا جواب منہ پہ دے مارا، تب کہیں ماں کی تلاش بسیار کے بعد اماں کو ملی رافعہ، یتیم اور مسکین اور مامی کے ظلم و ستم کا شکار انتہائی غریب اور بیچاری سی دبو قسم کی رافعہ، ماموں، مامی نے سر پہ پڑے بوجھ کو اتارنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا، یوں رافعہ رحیم رافعہ احسان علی بن کر آ گئی تھی، پہلے مامی اور ان کے بچوں کے کام کر کے اور جھڑکیاں کھا کر زندگی گزر رہی تھی، اب احسان علی اور اس کی ماں کے، رافعہ صابر بھی تھی اور شاکر بھی، لڑنا حق لینا اسے ساری زندگی نہیں آیا ہاں محنت کرنا اسے آتا تھا اور اپنا یہ ہنر وہ ساری زندگی آزماتی رہی تھی، بڑی بیٹی ثمن ہو بہو ماں کی کاپی تھی، ویسے ہی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اور خاموشی سے جیے جانا امن اس کے الٹ تھی، وہ لڑنے اور اپنا حق چھین لینے پہ یقین رکھتی تھی۔

''جب تک آپ خود اپنے حالات بدلنے کی کوشش نہیں کرتے دنیا کی کوئی طاقت کوئی قانون کوئی شخص آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔'' ثمن کی اکثر باتوں کے جواب وہ انہی قسم کے الفاظ سے دیتی تھی، ثمن بس خاموشی سے سر ہلا جاتی تھی۔

''امن تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں گے؟''

وہ کتاب کھولے پڑھنے میں مصروف تھی جب اس کی ماں نے اندر آ کے پوچھا تھا اسے آج ہی ٹیوشن فیس ملی تھی اور اس کے پاس پیسے موجود تھے مگر اسے پتہ تھا اس کی ماں وہ پیسے اپنے لئے نہیں مانگ رہی وہ پیسے اس کے باپ کو چاہیے ہوں گے اور وہ کم از کم اپنی محنت کی کمائی اپنے باپ کو جوئے میں ہرانے کے لئے نہیں دے سکتی تھی۔

''نہیں امی میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' ماں سے نظریں چرا کر وہ بولی۔

''اچھا تو پھر میں ساتھ والی کوثر سے پتہ کرتی ہوں۔'' اس کی ماں نے کچھ مایوسی سے کہتے قدم باہر کی طرف بڑھائے تھے۔

''امی آپ ادھار مانگنے جائیں گی اور وہ بھی اس وقت؟'' اس نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا تھا، اس کی ماں نے زندگی میں کبھی کسی سے ادھار نہیں مانگا تھا، آج وہ شوہر کے لئے یہ بھی کرنے کو تیار تھی۔

''کیا کروں بیٹا مجبوری ہے تمہارے ابو کو صبح پنڈی جانا ہے، انہیں ضرورت ہے پیسوں

کی۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''انہوں نے تو کبھی آپ کی ضرورتوں کے بارے میں نہیں سوچا، کہ وہ کب کیسے اور کس طرح پوری ہونگی پھر آپ کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔'' اس کا دل چاہا وہ اپنی ماں سے یہ سب کہے مگر وہ یہ سب کہہ کر اپنی ماں کا دل برا نہیں کرنا چاہ رہی تھی، سو خاموشی سے پیسے نکال کر انہیں دے دیے تھے۔

''تم خود کیا کرو گی تمہیں بھی ضرورت ہو گی۔'' اس کی ماں نے فکرمندی سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

''میں کرلوں گی کچھ نہ کچھ آپ ابھی تو لے جائیں یہ۔'' اس نے اپنی ماں کو تسلی دی تھی۔

☆☆☆

''شکر ہے یار ٹیسٹ توقع سے بھی زیادہ اچھا ہو گیا۔'' کلاس روم میں سے باہر آکر اقصیٰ نے اطمینان بھری سانس لے کر کہا تھا، تو وہ تینوں بھی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھیں۔

''اچھا چھوڑو ٹیسٹ ویسٹ کو چلو پہلے کچھ کھا لیتے ہیں بھوک کے مارے مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا۔'' رابعہ نے کینٹین کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

''تم لوگ جاؤ مجھے لائبریری میں ذرا کام ہے اور کوئی خاص قسم کی بھوک بھی نہیں ہے۔'' اس نے ہلکے سے مسکراتے رابعہ سے رجسٹر لیتے کہا تھا۔

''اف تو یہ امن کسی مٹی کی بنی ہو تم، تم دیکھا ہے تم نے اور تم کہہ رہی ہو تمہیں بھوک نہیں لگ رہی صبح کیا کھا کر آئی تھی۔'' مریم کی بات پر وہ ذرا سی مسکرائی تھی وہ مر کر بھی اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ صبح کل رات کی روٹی قہوے میں ڈبو کر کھا کر آئی ہے اور اب بھوک کے مارے اسے وہاں کھڑے ہونے میں بھی دشواری ہو رہی ہے اور یہ بھی کہ اس کی جیب میں فی الحال اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ ایک سموسہ تک خرید کر کھا سکے، وہ انہیں یہ سب نہیں بتا سکتی تھی، بھرم وہ واحد چیز تھی جسے وہ اپنی عزیز ترین دوستوں کے سامنے بھی کھونا منظور نہیں تھا۔

دوستوں سے بہانہ کر کے وہ لائبریری آگئی تھی اور جس وقت وہ گھر پہنچی نقاہت اور بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا، وہ بے دم سی چارپائی پہ گر گئی تھی۔

''امی کہاں ہیں؟'' اس نے کچھ دیر بعد ساتھ والی چارپائی پہ بیٹھی دادی سے پوچھا تھا، ثمن نہا رہی تھی۔

''مجھے کیا پتہ مجھے کہاں ہے تمہاری ماں، صبح کی نکلی نجانے کہاں گھرے اڑا رہی ہے، ناں کوئی خوف ہے نہ شرم، معلوم ہے ناں کون پوچھنے والا ہے۔''

''شرم آنی چاہیے آپ کو ان کے بارے میں ایسے بات کرتے۔'' اپنے باپ کی ماں کے کہے الفاظ نے اس کے دماغ کو سیکنڈ میں گھما دیا تھا۔

''یہ انہی کی دن رات کی جانے والی محنت ہے جس کی وجہ سے آپ کو دو وقت کی روٹی مل رہی ہے، ورنہ آپ کی اپنی اولاد نے آپ کے ساتھ کیا کیا ہے یہ آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔''

''غلط بات ہے امن بڑوں سے ایسے بات نہیں کرتے۔'' شام میں اس کی ماں نے دادی کے واویلا کرنے پہ کہا تھا۔

''بڑوں کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا امی کہ وہ چھوٹوں کے بارے میں ایسے بات کریں، انہیں احساس تک نہیں ہے آپ اس گھر کے لئے ہم سب کے لئے اتنی محنت کرتی ہیں، الٹا وہ آپ پر

الزام لگا رہی تھیں، جب کہ وہ خود اور ان کا بیٹا بوجھ بنے بیٹھے ہیں آپ پر۔''

''امن باپ ہے تمہارا وہ شخص۔'' اس کی ماں کی آواز تیز ہی تھی۔

''امی مجھے یاد ہے کہ وہ شخص میرا باپ ہے مگر یہ بات انہیں یاد نہیں کہ ان کی کوئی اولاد بھی ہے، صرف باپ ہونا کافی نہیں ہوتا، باپ کے کچھ فرض بھی ہوتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں نبھائے، کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں اٹھائیں، لوگوں کے باپ ان کے لئے فخر کا باعث ہوتے ہیں جب کہ ہمارا باپ ہمارے لئے شرمندگی کا باعث ہیں، آپ جانتی ہیں لوگ ہمیں کس حوالے سے یاد کرتے ہیں؟ احسان علی جواری کی بیٹیاں، یہ ہے وہ حوالہ جس سے لوگ ہمیں یاد کرتے ہیں، خاندان میں محلے میں جان پہچان کے لوگ ہمیں ترحم، ترس، طنز اور تمسخر سے کیوں دیکھتے ہیں کیوں یاد کرتے ہیں صرف اس شخص کی وجہ سے جسے آپ میرا باپ کہتی ہیں، حوالے بدلنا ہمارے بس میں نہیں ہے امی اور اگر ہوتی ناں تو میں کم از کم جواری احسان علی کی بیٹی نہ کہلاتی۔'' اس کی آواز کی نمی نے اس کی ماں کو بھی گم سم کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس بار اس کا باپ پورے ایک ہفتے بعد گھر واپس آیا تھا، وہ پنڈی اپنے بڑے بھائی کے گھر گیا تھا اور واپسی پہ بے حد خوش تھا، زندگی میں پہلی بار وہ گھر میں کچھ کھانے پینے کا سامان اور پھل وغیرہ لایا تھا، زندگی میں پہلی بار ہی وہ بنا کسی شور شرابے اور غصے کے گھر میں داخل ہوا تھا، انہوں نے پہلی بار ہی اپنے باپ کو اس قدر خوش اور ہنستے مسکراتے دیکھا تھا اور امن کو یقین نہیں آیا تھا جب اس کے باپ نے ان دونوں کو پاس بلا کر کچھ پیسے دیئے تھے کہ وہ کچھ کپڑے وغیرہ لے لیں، ان کا باپ خوش تھا اور انہیں اس کی خوشی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، لیکن پھر کچھ دیر بعد ہی اس ساری مہربانی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔

''امی آپ رو رہی ہیں؟'' کتاب بند کر کے اس نے ایکدم سے اپنی ماں سے پوچھا تھا، مڑ چھیلتے اس کی ماں کے ہاتھ ایک لمحے کو رکے تھے۔

''نہیں تو۔'' اس کی ماں نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

''نہیں امی آپ رو رہی تھیں، بتائیں مجھے کیا بات ہے انہوں نے کچھ کہا ہے آپ کو؟'' وہ موڑھے سے اٹھ کر ماں کے پاس چلی آئی تھی۔

''بولیں ناں امی۔'' اس نے اپنی ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تھا۔

''تمہارے ابو نے ثمن کا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی ماں نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

''ثمن کا رشتہ، کس کے ساتھ؟'' باہر آتی ثمن پہ نظر جماتے اس نے حیرت بھری آواز میں پوچھا تھا۔

''وسیم کے ساتھ۔''

''کیا؟'' اپنی ماں کی بات پہ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

''تایا ابا کے وسیم کے ساتھ؟''

''ہاں۔'' پاس آتی ثمن کا رنگ تیزی سے سفید ہوا تھا۔

''اور اپنی بیس سال کی بیٹی کا رشتہ چالیس سال کے اور چار بچوں کے باپ سے طے کرتے انہیں ذرا سا بھی خوف خدا نہیں آیا اور انہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اس طرح سے ہمارے

بارے میں فیصلہ کرتے پھریں۔"

"وہ کہتا ہے تم لوگ اولاد ہو اس کی اس حق ہے کہ تمہارے بارے میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا۔" اس کی ماں نے روتے ہوئے اس کے باپ کے الفاظ دوہرائے تھے، ثمن بے یقین کھڑی تھی۔

"بیٹیاں ہیں امی بھیڑ بکریاں نہیں ہیں کہ وہ جب چاہیں جہاں چاہیں ہمارا سودا کر دیں۔"

"ہم کر بھی کیا سکتے ہیں امن؟" اس کی ماں نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا تھا کہ بتایا تھا۔

"بہت کچھ کر سکتے ہیں امی کم از کم ثمن کی شادی وہاں ہونے سے روک سکتے ہیں۔"

"وہ کہتا ہے اگر ثمن نے انکار کیا تو وہ مجھے طلاق دے دے گا۔"

"وہ ایسا کچھ نہیں کریں گے امی آپ نے ان کا اور ان کی ماں کا بوجھ بھی اٹھایا ہوا ہے۔" اس نے طنز سے سر جھٹکا تھا۔

"اور اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو پھر؟"

"میں اپنی وجہ سے اس عمر میں اپنی ماں کو طلاق نہیں دلوا سکتی امن۔" ثمن بے ساختہ کہتی ہوئی آگے بڑھی۔

"انسان کے نصیب لکھنے کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے ثمن، اپنی مخلوق کے متعلق وہ خود فیصلے کرتا ہے۔" اس نے ثمن کا ہاتھ تسلی بھرے انداز میں تھپتھپایا تھا۔

"ہاں اللہ نے اپنی ساری مخلوق کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے مگر اس ساری مخلوق میں عورت نامی مخلوق کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار اس نے مرد کے ہاتھ میں دے دیا ہے، وہ جب چاہے جیسے چاہے فیصلہ کرے، عورت کو اس فیصلے پر سر جھکانا پڑتا ہے امن نہ جھکائے تو پھر اسے کہیں اماں نہیں ملتی، مجھے بھی جھکانا پڑے گا ہنس کر یا رو کر یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔"

☆☆☆

"آپ پھپھو سے کہیں ناں نعمان وہ اپنے بھائی کو روکیں ثمن کی زندگی تباہ کرنے سے۔" امن کی التجا پر نعمان نے تسلی بھرے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"میں بات کروں گا امی سے امن۔" اس کا لہجہ نرم اور تسلی بھرا تھا۔

"وہ ماموں کو سمجھائیں گی، بس تم...... تم پریشان مت ہوا کرو۔" نعمان کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا، نعمان اسی کی طرف متوجہ تھا، اس کی آنکھوں میں امن کے لئے نرمی تھی، تسلی تھی روشنی تھی اور......اور شاید محبت بھی تھی۔

"کیونکہ جب تم پریشان ہوتی ہو پھر مجھے اس دنیا کی کوئی بھی شے اچھی نہیں لگتی۔" وہ آہستگی سے مسکرائی تھی۔

نعمان خاور اس کی دوسرے نمبر والی پھپھو کا اکلوتا بیٹا تھا، اکلوتا تھا تو لاڈلا بھی تھا، اس کی یہ والی پھپھو اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت زیادہ خوشحال تھیں، شوہر کئی سال دوبئی اور سعودی عرب لگا کے آئے تھے اور وہاں سے لائے گئے سرمائے سے یہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا، گھر میں پیسہ تھا، آسائشات تھیں، سہولیات اور آسانیاں تھیں، پھپھو صاحبہ کا دماغ ساتویں آسمان پہ نہ رہتا تو کیا ہوتا؟ غریب بہن بھائیوں کو وہ ذرا کم ہی لفٹ کرواتی تھیں اور احسان علی کے گھر کی طرف تو وہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی، مگر یہ نعمان تھا جس کی وجہ سے وہ مجبور ہو جایا کرتی تھیں، نعمان ان کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا، جس کی شادی وہ آسٹریلیا میں مقیم نند کی بیٹی سے

کرنا چاہتی تھیں مگر ان کا بیٹا نعمان خوبصورت پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ ساتھ احمق اور بیوقوف بھی تھا ورنہ خوبصورت پڑھی لکھی، ویل سیٹلڈ ڈیلیلی انور کے بجائے امن احسان علی کا انتخاب بھی نہیں کرتا۔

ٹھیک ہے امن ان کے بھائی کی بیٹی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بھائی کی بیٹی کو ساری عمر کے لئے سر پہ لاد لیں، وہ اور ان کے شوہر ایک طرف تھے اور نعمان ایک طرف گھر میں کئی دن تک بحث و مباحثہ، لڑائی اور چیخ پکار ہوتی رہی بالآخر نعمان کی خودکشی کی دھمکی نے انہیں امن احسان علی کا رشتہ مانگنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اکیلی ہی گئی تھی رشتہ مانگنے اور انہیں ایک فیصد سے [illegible] جتنی بھی امید نہیں تھی کہ انہیں انکار ہو جائے گا اور وہ بھی امن احسان علی کی طرف سے، پتہ ہوتا تو کب کی آ جاتیں، وہ خوشی خوشی گھر لوٹیں تھیں اور نعمان تک امن کا انکار پہنچایا تھا، انہیں لگ رہا تھا جان چھوٹ گئی ہے، مگر نعمان اتنی جلدی پیچھے ہٹنے والوں میں سے کب تھا وہ اگلے روز امن کے کالج چلا آیا تھا۔

''آپ یہاں؟'' وہ اسے دیکھ کر حیران تھی۔

''مجھے بات کرنی ہے تم سے۔''

''کون سی بات؟''

''یہاں نہیں ہو سکتی۔''

''یہ بات آپ کو پہلے سے پتہ ہونی چاہیے تھی۔''

''تم [illegible] ساتھ چلو۔''

''کیوں؟''

''میں بتا چکا ہوں مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے امن۔'' نعمان کا لہجہ دھیما تھا۔

''آپ شاید جانتے نہیں میں کالج سے سیدھا گھر جاتی ہوں راستے میں رکنا یا ادھر ادھر جانا نہ میری عادت ہے نہ مجھے اس کی اجازت ہے۔''

''میں کوئی غیر نہیں ہوں امن۔'' وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''ہاں مگر اپنے بھی نہیں ہیں۔'' وہ خاصے تیز قدم اٹھا رہی تھی۔

''اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو ایسے ہی سہی، مگر میں اپنا بنانا چاہتا ہوں، میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔'' موڑ مڑتے وہ ایک پل کو رکی تھی۔

''مگر مجھے اپنے باپ کے خاندان میں شادی نہیں کرنی۔'' اس کا لہجہ بہت ٹھوس تھا۔

''پاگلوں جیسی باتیں مت کرو امن، میں بہت خوش رکھوں گا تمہیں۔'' نعمان خاور کا لہجہ بہت میٹھا تھا۔

''یہ تب ہو گا جب میں آپ سے شادی کروں گی جب کہ میں پھپھو کو بھی کہہ چکی ہوں اور آپ سے بھی کہہ رہی ہوں مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ قطعی انداز میں کہتی آگے بڑھی تھی جب نعمان نے ایکدم سامنے آتے اسے آگے بڑھنے سے روکا تھا۔

''لیکن مجھے تم سے ہی شادی کرنی ہے۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔

''جاننا چاہتی ہوں کیوں؟''

''کیونکہ میں محبت کرتا ہوں تم......''

''میں دنیا کی ہر چیز کو چھوڑ سکتا ہوں امن تمہیں نہیں کم از کم یہ ایک چیز میرے اختیار کی نہیں ہے۔'' اس کے کہے یہ چند الفاظ اسے اپنی جگہ پہ ساکت کر چکے تھے۔

☆☆☆

نعمان اور پھپھو کے سمجھانے اور اس کی ماں کی التجاؤں کے باوجود اس کا باپ اپنے فیصلے

سے نہیں بنتا تھا، اس نے ثمن کا نکاح طے کر دیا تھا، جس دن ثمن وسیم کے ساتھ رخصت ہوئی تھی اسے لگتا تھا ان کے گھر کوئی ماتم ہو گیا ہے، اس کے باپ کی ماں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ پنڈی چلی گئی تھی جب کہ اس کا باپ بھی کہیں چلا گیا تھا، گھر میں صرف وہ دونوں ماں بیٹی ہی رہ گئی تھیں، وہ دونوں ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر روتی اور ایک دوسرے کو تسلی دیتی تھیں۔

''کچھ چیزیں پہلے سے طے ہوتی ہیں امن انہیں نہ بدلا جا سکتا ہے نہ ان سے چھپا جا سکتا ہے ان کے ساتھ بس سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے، نصیب اٹل چیز ہے اس سے فرار ممکن نہیں ہوتا، تدبیریں اور کوششیں وہاں تک ہی چلتی ہیں جہاں تک انسان کا بس چلتا ہے اور انسان کا بس بھی بس خود پہ ہی چلتا ہے کہ وہ چاہے تو صبر کر لے چاہے تو سمجھوتہ۔'' وہ ساری رات ثمن کی کہی باتیں دوہراتی اور روتی رہی تھی۔

☆☆☆

ثمن کی شادی کو ایک ماہ ہو گیا تھا اور اس ایک ماہ نے اس کی ماں کو بہت حد تک بدل دیا تھا وہ بہت خاموش اور چپ چپ رہنے لگیں تھیں، امن کالج سے آنے کے بعد زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزارتی تھی، وہ کالج کی آس پڑوس کی، خاندان والوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے ان کا جی بہلانے کی کوشش کرتی تھی، وہ کام کرتے ہوئے انہیں بھی ساتھ مصروف رکھتی تھی۔

اپنی ماں کی اداس صورت دیکھ کر اس کا دل کٹ کٹ جاتا اور باپ کے خلاف دل میں موجود زہر مزید بڑھنے لگتا۔

ثمن کی شادی کو چھ ماہ ہو گئے تھے ان گزرے چھ ماہ میں وہ دو بار لاہور آئی تھی، وہ خوش ہے؟ یہ سوال انہوں نے نہیں کیا تھا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی اور ویسے بھی جن سوالوں کے جواب پہلے سے معلوم ہوں انہیں کرنے کا جواز اور فائدہ بھی کیا تھا۔

امن سیکنڈ ایئر کے پیپر دینے کے بعد اب گھر پہ ہی ہوتی تھی، اس کا زیادہ وقت اپنی ماں کے ساتھ ہی گزرتا تھا گھر کا سارا کام اس نے سنبھال لیا تھا وہ اپنی ماں کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

''تم مجھے بالکل ناکارہ کر دو گی امن، مجھے بے کار بیٹھنے کی عادت ہو گئی تو پھر تمہاری شادی کے بعد کتنا مسئلہ ہو جائے گا تم خود سوچو۔'' اس کی ماں اسے چھیڑتی۔

''مجھے شادی نہیں کرنی امی، مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔''

''ایسے نہیں کہتے امن، میری خواہش ہے تم بہت جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ۔''

''اور اگر میرا شوہر بھی آپ کے شوہر جیسا ہوا تو؟'' وہ اپنی ماں کو شرارت بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''اللہ نہ کرے امن۔'' اس کی ماں نے دہل کر اسے دیکھا تھا۔

''نعمان بہت اچھا ہے۔''

''ہر مرد پہلے بہت اچھا ہوتا ہے امی پھر وہ بدل جاتا ہے۔''

''ہر مرد نہیں بدلتا امن۔''

''ہر مرد بدل جاتا ہے امی، بس ہر ایک کے بدلنے کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔'' اس کا انداز یقین بھرا تھا، اس کی ماں ہلکے سے مسکرائی۔

''بدلنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا امن۔''

''مرد کے لئے مشکل بھی نہیں ہوتا امی، کیونکہ اسے بدلنے کے لئے کسی بہانے کسی توجیہ کی ضرورت نہیں ہوتی، مرد بدلنے پہ آئے تو کوئی

مجبوری کوئی ہو جو اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتی، مرد رشتے نبھاتا ضرور ہے مگر اپنے اصولوں کی بنیاد پہ، اس کے اپنے ضابطے ہوتے ہیں، اپنے قاعدے اور اپنے قانون، آپ اسے روک نہیں سکتے آپ اسے باندھ نہیں سکتے۔"

"اوروں کا مجھے پتہ نہیں امن لیکن کم از کم نعمان کے بارے میں مجھے یقین ہے وہ کبھی نہیں بدلے گا، وہ ہمیشہ تمہارا ساتھ دے گا ساری دنیا بھی تمہارے خلاف کھڑی ہو جائے تب بھی وہ تمہارے ساتھ کھڑا ہوگا بے شک تم آزما لینا۔" اس کی ماں مسکراتے لہجے میں کہہ رہی تھیں، اس کی ماں کا لہجہ اتنا یقین بھرا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔

☆☆☆

"زیرو تھری زیرو ٹو۔" بتا کر کے اس نے نمبر ملایا اور دوسری طرف رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا، اس کے سامنے بیٹھا شخص بنا پلک جھپکے اس کے چہرے پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا، اس نے عدیل شوکت کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرایا تھا، سامنے بیٹھے شخص کو اس کی اطمینان بھری مسکراہٹ پہ حیرت ہوئی تھی اور اس کا اضطراب اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا تھا، سامنے بیٹھے شخص کی اضطراری انداز میں چلتی انگلیاں اس کی مسکراہٹ میں اضافہ کر رہی تھیں، بائیں طرف بیٹھے عدیل شوکت کو اس کے اطمینان اور مسکراہٹ پہ رشک آیا تھا۔

"شہالے عباس ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے عجیب شخص ہے کم از کم میں نے بھی شہالے عباس جیسا شخص آج تک نہیں دیکھا اور مجھے یقین ہے اور میری دعا ہے میرا واسطہ کبھی شہالے عباس جیسے شخص سے دوبارہ نہ پڑے۔"

عدیل شوکت کو بے اختیار ہارون کیانی کے الفاظ یاد آئے تھے خود اسے بھی ان الفاظ کی صداقت پر ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا، شہالے عباس کے ساتھ کام کرتے اسے دو سال ہو گئے تھے اور ان گزشتہ دو سالوں میں عدیل شوکت کو ایسا کوئی دن یاد نہیں تھا جب شہالے عباس نے اسے حیران نہ کیا ہو اور شہالے عباس کے ساتھ دو سال کام کرنے کے بعد بھی وہ اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی رائے قائم کرنے میں ناکام رہا تھا۔

"شہالے عباس کیسا انسان ہے؟" یہ سوال اگر کبھی اس سے پوچھا جاتا تو وہ خود کو جواب دینے سے ایسے ہی معذور پاتا جیسے کوئی ایسا شخص جو کبھی شہالے عباس سے ملا ہی نہ ہو۔

"شہالے عباس کے متعلق آپ کبھی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔" ایک بار ان کے ایک سینئر آفیسر نے نجی محفل میں شہالے کی غیر موجودگی میں دانت پیس کر یہ تبصرہ کیا تھا، وہ جونیئرز کے لئے ہی نہیں اپنے سینئرز کے لئے بھی کبھی کوئی بھی پرابلم بہت آسانی سے کھڑی کر سکتا تھا، اس لئے تھانے کے ایک معمولی سپاہی سے لے کر ڈی آئی جی تک سب ہی اس سے بنا کر رکھنے میں عافیت جانتے تھے، تو وجہ اس کا ایس پی ہونا نہیں باپ کا بیوروکریٹ ہونا بھی تھا، پنجاب کے چند بڑے بیوروکریٹس میں شامل ایک نام دلاور عباس کا بھی تھا، جب کہ دلاور عباس کے بڑے بھائی خاور عباس ریٹائرڈ چیف جسٹس تھے اور چھوٹے بھائی یاور عباس کا شمار موجودہ حکومت کے چند چلتے پھرتے وزراء میں ہوتا تھا، شہالے عباس کے بھائی ژالے عباس کا شمار پاکستان کے چند ینگ اور امیر ترین انڈسٹریلسٹ میں ہوتا تھا، پیسہ اور اختیارات شہالے عباس کے لئے نئی چیز نہیں

تھے، انہیں کب کہاں اور کس طرح خرچ کرنا ہے یہ چیز اس نے بہت پہلے سیکھ لی تھی، کچھ لوگ وقت کے ساتھ چلتے ہیں کچھ وقت کو ہاتھ میں لے کے چلتے ہیں شہالے عباس کا شمار دوسری طرح کے لوگوں میں ہوتا تھا۔

''اپنے فیصلے اپنے ہاتھ میں رکھو زندگی میں کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔'' ایک بار اس کے ٹیچر نے اسے نصیحت کی تھی اور اپنی اٹھائیس سالہ زندگی میں یہ وہ واحد بات تھی جس پہ اس نے ہمیشہ عمل کیا تھا ورنہ وہ مان کر نہیں منوا کر چلنے والا شخص تھا اور اس کی یہ عادت کبھی کبھی اس کے باپ کو بھی مشکل میں ڈال دیتی تھی، اس کا باپ اس پہ رعب ڈالتا، ڈانٹتا، بحث اور غصہ کرتا اور اینڈ میں اسے مجبوراً شہالے کی بات ماننی پڑتی، وہ جو کہتا تھا وہ کرتا تھا اور جو کرتا تھا اسے نبھاتا تھا۔

اس کا باپ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ شہالے جیسا بیٹا ہو تو باپ ہمیشہ فخر کرتا ہے مگر ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتا ہے کہ اس کا کوئی دوسرا بیٹا ایسا نہ ہو، وہ شروع سے ہی اپنے ماں باپ کے لئے کوئی آسان قسم کا بچہ نہیں تھا، حالانکہ وہ کوئی بہت زیادہ شرارتی یا بگڑا ہوا بچہ نہیں تھا، نہ ہی اپنے بڑے بیٹے اور چھوٹی بیٹی کی طرح انہیں اس کی پڑھائی وغیرہ پہ بہت زیادہ توجہ دینی پڑی تھی وہ شروع سے ہی پڑھائی میں آؤٹ کلاس رہا تھا، انہیں کبھی بھی اسے پڑھنے کے لئے فورس کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی، بلکہ پڑھائی ہی کیا انہیں اسے اپنے دوسرے روٹین کے کام کرنے کے لئے کبھی ایک سے دوسری بار کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی وہ ہمیشہ اپنا ہر کام وقت پہ کرنے کا عادی تھا اس کی کبھی سکول سے اکیڈمی سے دوستوں وغیرہ کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی تھی، اس کے باوجود شہالے ان کے لئے بہت مشکل قسم کا بچہ تھا، وہ ضد نہیں کرتا تھا مگر اسے اپنی بات منوانے کے ایک سو ایک طریقے آتے تھے۔

وہ دونوں بہت بزی رہتے تھے اس کا باپ اگر پنجاب کی بیوروکریسی میں ایک نام رکھتا تھا تو اس کی ماں بھی پاکستان کی چند بڑی اور مشہور ترین ڈریس ڈائزینرز میں شمار ہوتی تھیں اور اپنی کلاس کے دوسرے ماں باپ کی طرح ان دونوں کے پاس بھی اپنے بچوں کے لئے کم کم ہی ٹائم نکلتا تھا مگر شہالے عباس کو اپنے ماں اور باپ دونوں کا وقت اور توجہ دونوں ہی چاہیے ہوتی تھی، کئی بار اس کی وجہ سے اس کے باپ کو اپنی میٹنگز ادھوری چھوڑ کر آنی پڑی تھیں اور اس کی ماں کو اپنے کئی ایونٹس ملتوی کرنے پڑتے تھے۔

بچوں کا حق ہوتا ہے ماں باپ کی توجہ پر ان کے پیار پر اور ان کے وقت پر۔

''وہ اکثر ایسی بات کر کے انہیں خاموش کروا دیا کرتا تھا۔''

''اور ماں باپ کا بھی حق ہوتا ہے بچوں پر کہ وہ انہیں غلط چیزوں پر ٹوکیں۔'' اس کا باپ اسے گھورتا۔

''ہاں لیکن غلط چیزوں پر، جب آپ اپنا حق مانگتے ہیں تب آپ غلط نہیں ہوتے۔'' اس کا باپ اپنے پندرہ سالہ بیٹے کی بات پہ چپ ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

''فیصل کیانی کی کال آئی تھی مجھے۔'' دلاور عباس کی بات نے میز کے گرد موجود تین لوگوں میں سے دو کو انتہائی حیران ہونے پر مجبور کر دیا تھا، جب کے میز پہ موجود تیسرا فرد انتہائی حالت سکون میں تھا اور اس کا یہ سکون دلاور عباس کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔

''کیوں؟ کس لئے؟'' رخشندہ عباس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا تھا، ژالے بھی سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''وہ ملنے کے لئے آنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے شہالے کے چہرے پر نگاہ جما کر بتایا تھا، جو بہت اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا، اس خبر سے اسے ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے اس کے چہرے سے تو کم از کم یہی چیز ظاہر ہو رہی تھی، ان کی اس بات نے رخشندہ عباس اور ژالے عباس کی حیرت کو دو چند کر دیا تھا، کیونکہ اس شہر میں اگر کسی کو وہ واقعی میں اپنا حریف سمجھتے تھے تو وہ فیصل کیانی ہی تھا، دونوں فیملز ایک دوسرے کے بارے میں کھل کر بیان دینے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع مس نہیں کرتے تھے، بقول مصطفیٰ حیدر کے دلاور عباس اور فیصل کیانی نے پورے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے اور اب فیصل کیانی کا ان کے گھر آنا انہیں حیرت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔

''آپ سے ملنے کے لئے؟'' رخشندہ عباس نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے پوچھا تھا۔

''نہیں مجھ سے ملنے کے لئے۔'' خالی کپ ٹیبل پہ رکھتے شہالے نے بہت سکون بھری آواز میں بتایا تھا، ان تینوں نے ہی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''کیوں؟'' دلاور عباس نے نیوز پیپر سائیڈ پہ رکھا۔

''وہ ڈیل کرنا چاہتا تھا مجھ سے میں نے گھر بلا لیا۔'' بائیں آنکھ دبا کر اس نے باپ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اٹھ گیا تھا۔

''شہالے عباس کو سمجھنا کم از کم ان کے بس کی بات نہیں ہے۔'' انہوں نے ہزار بار کا کیا اعتراف ایک بار پھر دہرایا تھا۔

☆☆☆

اولیول کرنے کے بعد وہ عذیر فاروقی کے ساتھ اسلام آباد آ گیا تھا، عذیر فاروقی اس کی سب سے چھوٹی خالہ کا بیٹا اور اس کا بچپن کا سب سے بہترین دوست تھا، وہ چھٹیاں اسلام آباد اپنی گرینڈ مدر کے پاس گزارنے آئے تھے، عذیر دس دن بعد ہی بھاگ گیا تھا۔

''مجھے اسلام آباد کبھی راس نہیں آتا۔'' شہالے کے روکنے پہ اس نے اپنی سرخ ناک کو دباتے کہا تھا۔

عذیر فاروقی کے جانے کے بعد وہ اور گرینڈ مدر ہی رہ گئے تھے وہ سارا دن اسلام آباد کی سڑکیں چھانتا اور شام کا وقت ان کے ساتھ گزارتا، مزید چند دن گزار کر وہ اس روٹین سے اچھا خاصا بور ہو گیا تھا اور واپس جانے کا سوچ رہا تھا جب اس کی کینیڈا میں مقیم پھپھو اپنی بیٹی کے ساتھ چلی آئیں تھیں۔

''یشل ابراہیم'' سے اس کی پہلی ملاقات اسلام آباد اپنی گرینڈ مدر کے گھر پہ ہوئی تھی اور اسے یہ ماننے میں کبھی عار محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ یشل ابراہیم سے پہلی ملاقات میں ہی متاثر ہوا تھا، وہ خوبصورت تھی یہ بات اہم نہیں تھی وہ یہ بات جانتی تھی یہ بات اہم تھی، وہ بہت جلد بے تکلف ہو گئے تھے اور اس میں زیادہ ہاتھ یشل ابراہیم کے دوستانہ مزاج کا تھا، وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والوں میں سے تھی، بہت کم عرصے میں ہی وہ بہت قریب آ گئے تھے، اسلام آباد میں ایک ساتھ گھومتے، اکٹھے اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، شہالے عباس سے ایک سال چھوٹی خوبصورت پر اعتماد ایجوکیٹڈ اور بلا کی شدت پسند یشل ابراہیم اس کی سب سے بہترین دوست بن چکی تھی۔

☆☆☆

''تم شام مہر کے ساتھ گئے تھے؟'' وہ سو رہا تھا جب یشل نے اس پہ سے کمبل کھینچ کر اتارتے ہوئے پوچھا تھا، وہ ہڑبڑا کے اٹھا تھا۔

''کیا ہو گیا یشل؟'' آنکھوں کو ملتے وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''تم شام کو مہر کے ساتھ گئے تھے؟''

''یہ کون سا طریقہ ہے پوچھنے کا۔''

''تم گئے تھے؟''

''ہاں اسے مارکیٹ سے کچھ چیزیں لینی تھی تو......''

''آئندہ مت جانا۔'' اس نے اس کی وضاحت نہیں سنی تھی وہ یہ کام کبھی نہیں کرتی تھی۔

''مہر میری بہت اچھی دوست ہے یشل۔''

اگلے چند دنوں میں وہ اسے مہر کے ساتھ کہیں گھومنے، آنے جانے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ بات کرنے پہ بھی اعتراض کرنے لگی تھی، جب ایک دن اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔

''ہے۔''

''نہیں۔''

''تھی۔''

''وہ اب تمہاری دوست نہیں ہے۔''

''یہ چیز مجھے ڈیسائیڈ کرنی ہے کہ مجھے کسے دوست رکھنا ہے کسے نہیں۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر خاموشی سے پلٹ گئی تھی۔

اگلے چند دن بھی اس کی یہ خاموشی نہیں ٹوٹی تھی، اس کی ہزار کوششوں طریقوں اور منتوں کے بعد بھی۔

''تم کیا چاہتی ہو یشل؟''

''تم مہر کو چھوڑ دو۔''

''یہ ممکن نہیں ہے وہ میری بہت اچھی......''

''تو پھر مجھے چھوڑ دو۔'' اس کے لہجے میں بلا کا سکون تھا۔

''تم میں ہر وہ خوبی ہے جو کسی بھی لڑکی کو بہت اچھی لڑکی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، مگر یو نو تمہاری یہ Intensity اور Madness تمہاری ہر خوبی پس پشت کرنے کے لئے کافی ہیں۔''

''میں تمہارے سامنے اس لئے نہیں کھڑی کہ تم مجھے میری خامیاں گنوا سکو، اس لئے کھڑی ہوں تاکہ میں جان سکوں کہ تم نے یشل ابراہیم اور مہر حیدر میں سے کس کا انتخاب کیا ہے۔'' اس کے لہجے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا، وہ بہت اطمینان سے بول رہی تھی۔

''یشل میں ایکسٹرا کوالٹی یہ ہے یہ بہت سکون سے کسی دوسرے کا سکون تباہ کر سکتی ہے۔''

اسے اپنی پھپھو کے کہے الفاظ یاد آئے تھے جو انہوں نے یشل کی کسی حرکت پہ جل کر کہے تھے، اسے ان الفاظ کی صداقت پہ یقین آیا اور وہ...... وہ الفاظ ترتیب دینے لگا جو اسے اپنے سامنے اور اپنا امتحان بنی کھڑی لیڈی سے کہنے تھے۔

اگلے چند سالوں میں وہ امریکہ آ گیا تھا، مہر حیدر سے وہ اس کے بعد وہ کبھی نہیں ملا تھا، یشل ابراہیم کو وہ کبھی چھوڑ نہیں پایا تھا، وہ عورت اس کی کمزوری بن گئی تھی، یہ بات اس نے بہت پہلے جان لی تھی۔

ہاں یشل ابراہیم کے لئے وہ بہت کچھ چھوڑ چکا تھا اور وہ بہت کچھ چھوڑ سکتا تھا، محبت اگر واقعی انسان کو احمق بنا دیتی ہے تو وہ بہت پہلے سے ہی احمقوں کی لائن میں آ کھڑا ہوا تھا، اسے بعض دفعہ خود پہ ہنسی آتی کئی بار غصہ آتا، ہر بار یشل کے کہنے پر کوئی بھی کام کرتے وہ خود سے عہد کرتا وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا اگلی بار اس کا یہ عہد ریت کی دیوار ثابت ہوتا۔

''عورت چاہے تو مرد کا دل نہیں پورے کا

پورا مرد ایک ہاتھ کی مٹھی میں قید کر سکتی ہے۔''
ایک بار اس کے باپ نے باتوں کے دوران کہا تھا، اس کے باپ نے سچ کہا تھا۔
بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لے کر وہ پاکستان آ گیا تھا اگلے چند مہینوں کے لئے اس نے ڈاڈے کو بزنس میں جوائن کر لیا تھا اور پھر ایک سال بعد وہ باپ کے سامنے کھڑا تھا۔
''پاپا مجھے سول سروس میں جانا ہے۔''
''تم سول سروس میں جانا چاہتے ہو؟'' اس کے باپ نے حیرت سے اس کے الفاظ دوہرائے تھے۔
''تم جانتے ہو ہمارا بزنس اس وقت کہاں ہے اور اگلے چند سالوں میں تم دونوں اسے کہاں پہنچا سکتے ہو۔''
''میرا ذہن نہیں چلتا اس طرف دو..... اور دو کرنے میں انٹرسٹ نہیں ہے میرا۔''
''یہ بات ڈگری لیتے وقت معلوم نہیں تھی؟''
''غلطی ہو گئی اب سدھارنا چاہتا ہوں۔''
''سول سروس میں نری خواری ہے۔''
''میں سہہ لوں گا۔''
''منہ بھر بھر کے گالیاں پڑتی ہیں پولیس والوں کو یہاں.....'' اس کے باپ نے تمسخر اڑایا۔
''بیوروکریٹس کو بھی منہ بھر بھر کے گالیاں پڑتی ہیں یہاں آپ نے برداشت کر یں میں بھی کر لوں گا..... کس کو گالیاں نہیں پڑتی یہاں؟ معمولی سپاہی سے لے کر ڈی آئی جی تک پانچ ہزار کی تنخواہ لینے والے کلرک سے لے کر بائیس گریڈ کے آفسر تک چھوٹی سی پرچون کی دکان چلانے والے تاجر سے لے کر بڑے سے بڑے انڈسٹریلسٹ تک، کسی گئے گزرے وزیر سے لے کر وزارت عظمیٰ کے منصب پہ بیٹھے شخص تک ہر کسی کو گالیاں دی جاتی ہیں، سب سمجھتے ہیں سب برداشت کرتے ہیں، کوئی اپنی جگہ چھوڑ کے نہیں جاتا، کوئی گالیوں کے ڈر سے بھاگتا نہیں ہے، زندگی کو جینا پڑتا ہے گالیاں دے کر بھی گالیاں کھا کر بھی، سب یہی کرتے ہیں۔''
''تم چھ ماہ بھی نہیں ٹک سکو گے، یہ میرا دعوا ہے۔'' اس کے باپ نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
''میں چھ صدیاں بھی نہیں بھاگوں گا، یہ میرا عہد ہے۔'' اس نے اپنے باپ کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔

☆☆☆

اس نے سالن بھون کر پانی ڈالا اور باہر نکل آئی، ٹیوشن والے بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، وہ موڑھے پہ بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی۔
اس کی ماں نعمان کے ساتھ آئی سپیشلسٹ کے پاس گئیں ہوئیں تھیں، وہ جانا نہیں چاہ رہی تھیں نعمان انہیں زبردستی ساتھ لے کے گیا تھا۔
وہ ہر دوسرے چوتھے روز آ جاتا تھا، اپنے ساتھ ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی لے آتا تھا۔
''میں اپنی خوشی سے لاتا ہوں یار تم ایسے خفا تو مت ہوا کرو ناں۔'' امن کے خفگی ظاہر کرنے پر یہ وہ لجاجت سے کہتا تھا۔
''میرا خیال ہے اب شادی ہو جانی چاہیے ہماری، اب تو جاب بھی ہو گئی ہے میری میں اسلام آباد سے واپس آ کے امی سے بات کرتا ہوں۔''
''فی الحال نہ تو یہ ممکن ہے میرے لئے اور نہ ہی میں ایسا کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔''
''کیوں؟''

''ابھی میری ایجوکیشن بھی کمپلیٹ نہیں۔''
''تم بعد میں بھی پڑھ سکتی ہو۔''
''میری بہت ساری ذمہ داریاں ہیں میں امی کو نہیں چھوڑ سکتی۔''
''ہم انہیں ساتھ لے کے جائیں گے۔'' وہ یقین دلاتا۔
''میں بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی آپ پہ۔''
''بوجھ میں اور فرض میں فرق ہوتا ہے امن، تم ہرگز بوجھ نہیں ہو میرے لئے، تم تو اہم ہو میرے لئے ہر چیز سے بڑھ کر اہم اور میری خواہش اور دعا ہے تم اس چیز کو سمجھ جاؤ۔'' وہ اسے لاجواب کر گیا تھا۔

☆☆☆

بچوں کو ٹیوشن دینے کے بعد اس نے وضو کیا تھا وہ عصر کی نماز پڑھنے لگی تھی جب عجیب بے ڈھنگے انداز میں دروازہ کھول کر اس کا باپ اندر داخل ہوا تھا، اپنے پیچھے اچھی طرح سے دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھا تھا، پورے سات ماہ بعد وہ واپس آیا تھا اور آتے ساتھ ہی اپنے کمرے کی طرف گیا تھا، امن کی طرف دیکھنے یا اس سے بات کرنے کے بجائے وہ خاموشی سے اس کے پاس سے گزرا تھا۔

امن نے بھی اس کے پیچھے جانے یا بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، اپنے کمرے میں جا کر اس کے باپ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور اگلے تین دن تک وہ دروازہ بند ہی رہا تھا، اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی وہ آواز دے لیتا تھا، وہ ہر وقت دروازہ بند کیے رہتا تھا اور اندر سے ہی فون پر بھی بہت اونچی اور بھی مدھم آواز میں گفتگو جاری رہتی تھی، تیسرے دن اس کی پھپھو کے آنے پہ وہ دروازہ کھلا تھا، اندر وہ دونوں ہی بات کرتے رہے تھے دو گھنٹے بعد پھپھو بہت غصے میں واپس چلی گئیں تھیں، امن پا اس کی ماں سے انہوں نے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تمہارے ابو نے پانچ لاکھ دینے ہیں کسی کے اب وہ لوگ پیسے واپس مانگ رہے ہیں نہیں تو مار دینے کی دھمکی دے رہے ہیں۔'' اس کی ماں نے بہت آہستہ آواز میں بتایا تھا، ان کا لہجہ بہت پریشان کن تھا۔
''تو پھر؟''
''تمہارے ابو نے تمہاری پھپھو سے مانگے ہیں پیسے انہوں نے انکار کر دیا ہے۔'' اس کے بہت بے تاثر قسم کے تو ''پھر'' کے جواب میں اس کی ماں بتا رہی تھیں۔
''آپ پریشان نہ ہوں امی، وہ اپنی پریشانیاں حل کرنا جانتے ہیں۔'' اس نے اپنی ماں کے سامنے سالن روٹی رکھتے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔
''تمہاری پھپھو کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔''
''تو اور کیا کرتیں؟ پانچ لاکھ دے کے کھڑی ہو جاتیں؟ اور بالفرض وہ آج دے بھی دیتیں ناں وہ کل پھر کسی اور سے ادھار لینے کھڑے ہو جاتے، پھر؟ میں نے آپ سے کہا ناں کے آپ پریشان مت ہوں وہ اپنی پریشانی خود حل کر لیں گے۔'' اس نے اپنی ماں سے کہا تھا، اس نے سچ کہا تھا اس کے باپ نے اپنی پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا تھا، امن علی کی شادی اپنے دوست سعود خان سے کرنے کا حل۔

☆☆☆

یہ امریکی ریاست کیلیفورنیا میں موجود شہر سان فرانسسکو تھا جہاں وہ اس وقت موجود تھا، سان فرانسسکو وہ شہر جہاں اس کی زندگی کے چند خوبصورت اور یادگار سال گزرے تھے، وہ سال

جنہیں وہ اپنی زندگی کے چند بہترین سال گنا کرتا تھا، سان فرانسسکو وہ شہر جہاں اس کی زندگی کا سب سے بدترین دن آیا تھا وہ دن جو اس کی زندگی کا سب سے تاریک دن تھا اور جس نے اس کی زندگی میں موجود ہر شے کو گہری سیاہی میں لپیٹ دیا تھا، 20 مارچ وہ دن جس نے اس کی زندگی میں موجود کسی بھی چیز کو اپنے مقام پر نہیں رہنے دیا تھا، پانچ سال پہلے اس نے سان فرانسسکو چھوڑا تھا اسے اس شہر سے نفرت ہو گئی تھی، اس نے عہد کیا تھا زندگی میں دوبارہ کبھی وہ اس شہر میں نہیں آئے گا لیکن صرف پانچ سال بعد ہی اسے اپنا یہ عہد توڑنا پڑا تھا اور پانچ سال بعد آج وہ 20 مارچ کو وہ ایک بار پھر سان فرانسسکو میں موجود تھا، اس کے سان فرانسسکو چھوڑنے کے پیچھے بہت بڑی وجہ تھی اس کے سان فرانسسکو واپس آنے کے پیچھے اس سے بھی بڑی وجہ تھی، وہ جب یہاں سے گیا تھا تو اس کی زندگی سے بہت کچھ چلا گیا تھا، وہ یہاں واپس آیا تھا کسی اور کی زندگی سے بہت کچھ چلے جانا تھا، وہ یہاں سے گیا تھا تو ایک عورت کی وجہ سے وہ وہاں واپس آیا تھا تو بھی وجہ ایک عورت ہی تھی۔

اپنے پیچھے نظر آتے شیر دل کے عکس کو دیکھتے اسے شیر دل کی نظروں میں موجود حیرت واضح طور پر محسوس ہوئی تھی، اس نے پلٹ کر شیر دل کو دیکھا اور مسکرایا۔

''کیسا لگ رہا ہوں میں؟'' اس نے مسکراتی نظروں سے شیر دل کو دیکھتے سوال کیا تھا۔

''آپ ہمیشہ ہی اچھے لگتے ہو صاحب پر آج تو کمال لگ رہے ہو۔'' شیر دل کی بات پر اس نے کھل کر قہقہہ لگایا تھا، شیر دل کو خوشگوار حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی، شیر دل پچھلے بارہ سال سے اس کے ساتھ تھا اور وہ اپنے صاحب کی دل سے عزت بھی کرتا تھا کہ اس کا صاحب دنیا والوں کے لئے جیسا بھی تھا اس کے لئے ایک مہربان اور نرم دل سا آقا ہی رہا تھا وہ ہمیشہ شیر دل سے عزت سے بات کرتا تھا اور شیر دل کو یاد نہیں کہ ان بارہ سالوں میں صاحب نے اسے کبھی بھی بلا وجہ ڈانٹا یا بے عزت کیا ہو، صاحب کوئی مغرور بد دماغ یا کرخت مزاج کا شخص نہیں تھا بلکہ وہ ایک اصول پسند اور خوش مزاج سا شخص ہوا کرتا تھا، اس کا صاحب اپنے انڈر کام کرنے والے لوگوں سے لے کر گھر کے ملازموں تک کو انسان سمجھ کر بات کیا کرتا تھا اور اسی وجہ سے شیر دل سمیت اس کے گھر میں موجود باقی ملازمین بھی دل سے اس کا احترام کیا کرتے تھے۔

ہنستے ہوئے اس نے شیر دل کے ہاتھ میں موجود ٹرے میں سے کافی کا کپ اٹھایا تھا، کافی پیتے ہوئے بھی وہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو تنقیدی نظروں سے جانچ رہا تھا، وہ بہت اچھا لگ رہا تھا یہ چیز اسے معلوم تھی مگر وہ مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا، تبھی کپ سائیڈ پہ رکھ کر اس نے ایک بار پھر برش اٹھا کر بال سنوارے تھے پھر پرفیوم اٹھا کر اسپرے کیا تھا، شیر دل کی موجودگی میں وہ یہ دونوں کام تین بار کر چکا تھا، وہ گنگناتے ہوئے اپنے کوٹ کے کالر سیدھے کر رہا تھا، وہ خوش تھا یہ بات شیر دل کے علاوہ کوئی انجان بندہ بھی اسے دیکھ کر بتا سکتا تھا کیوں خوش تھا؟ اس کے متعلق وہ فقط اندازہ ہی لگا سکتا تھا اور شیر دل فی الحال یہی کرنے میں مصروف تھا۔

''میرے لئے ڈنر تیار مت کرنا شیر دل میں لیٹ واپس آؤں گا بلکہ ہو سکتا ہے میں واپس آؤں ہی ناں۔'' جوتے پہن کر اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنا سیل اور گاڑی کی چابی اٹھاتے شیر

دل کو ہدایت کی تھی، شیر دل کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا تھا، کیونکہ روٹین کتنی بھی سخت ہوتی صاحب رات کا کھانا ہمیشہ گھر آ کے ہی کھایا کرتا تھا یہ اس کی بہت شروع کی روٹین تھی اور گھر سے باہر وہ ہمیشہ بہت سخت مجبوری میں ہی رات گزارا کرتا تھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں صاحب؟'' وہ دروازے سے نکل رہا تھا جب شیر دل نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوتے پوچھ لیا تھا، وہ رکا پلٹا اور پھر جو اس نے کہا تھا اس نے شیر دل کو حیرت سے ساکت کر دیا تھا۔

☆☆☆

''تو پھر کیا طے کیا تم نے؟''

''جو طے کیا ہے وہ آپ کو بتا چکا ہوں، تمہیں اس فیصلے کے لئے پچھتانا پڑے گا تم اس چیز کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں اپنے پچھتاوے میں آپ کو شریک نہیں کروں گا آپ اس چیز کا اطمینان رکھیں۔'' اس کے باپ نے اسے سول سروس میں جانے سے روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی اور اپنی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد انہوں نے عذیر سے اسے سمجھانے کے لئے کہا تھا۔

''آپ جانتے ہیں وہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے یا پھر اگر وہ کسی کی مانتا ہے تو وہ نیشل ہے آپ نیشل سے کہیں وہ اسے سمجھائے۔''

''وہ یہ سب کر ہی نیشل کے کہنے پر رہا ہے۔'' انہوں نے بے بسی ظاہر کی تھی۔

''اور پھر بھی آپ کو لگتا ہے کہ میں اسے سمجھا سکتا ہوں؟''

''ایک کوشش تو کر سکتے ہو۔''

اور وہی ایک کوشش کرنے کے لئے عذیر پچھلے تین دن سے عباس ولا میں موجود تھا، دلاور عباس کو یقین تھا عذیر فاروقی کو امید تھی کہ وہ اسے سمجھا لے گا ان دونوں کا ہی یقین اور امید غلط تھے یہ اس کے رویے نے ظاہر کر دیا تھا۔

''انہیں میرے سول سروس میں جانے پر اعتراض کیا ہے؟''

''بات اعتراض کی نہیں ہے فیکٹس کی ہے، تم جانتے ہو گورنمنٹ گنتی کے دنوں کی رہ گئی ہے، صاحب بہادر تخت بادشاہت پہ بیٹھنے والے ہیں اور ایک ڈکٹیٹر کے دور میں کسی بیوروکریٹ کے بیٹے کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا یہ مجھے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے تمہارا آئی کیو لیول مجھ سے بہتر ہے۔''

''یہ محض امکان کی بات ہے اور میں امکانات کے لئے فیصلہ نہیں بدل سکتا۔''

''تم پاگل ہو۔'' عذیر جھنجلا گیا تھا۔

''تم ایک عورت کے کہنے میں آ کر اپنا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہو، میرا مخلصانہ مشورہ ہے تم ایسا مت کرو۔''

''میں اس عورت کے لئے اپنی زندگی داؤ پہ لگا سکتا ہوں مستقبل تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔'' اس نے بہت سکون سے کہا تھا عذیر فاروقی پھر کچھ بول نہیں سکا تھا اور یہ کوئی پہلی یا آخری بار نہیں تھا جب اس نے نیشل ابراہیم کی مان کر کچھ کیا ہو، وہ اس عورت کی ہر بات مان جاتا تھا وہ اس عورت کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا، اس نے اس عورت کے لئے سب کچھ کیا تھا، عذیر فاروقی اس پہ ہنستا تھا۔

''محبت اچھی چیز ہوتی ہے پر یہ بڑے کمال کی چیز بھی ہوتی ہے یہ اندھی ہوتی ہے یہ انسان کو صرف اندھا نہیں کرتی بہرہ، گونگا اور احمق بھی کر دیتی ہے۔''

آنے والے چند سالوں میں اس میں بہت

ساری تبدیلیاں آ گئی تھیں، اپنے سرکل کے تمام اصول اپنانے اور آزمانے میں اسے زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا، سی ایس ایس کرنے کے بعد تین سال کی ٹریننگ پہلے راولپنڈی اور پھر لاہور پوسٹنگ، اس کے باپ کے تمام تر خدشات کے برعکس اس کے لئے زیادہ رکاوٹیں کھڑی نہیں کی گئیں مرتب تک جب تک فیصل کیانی کا بیٹا بریگیڈیئر طاہر مرزا کا داماد نہیں بنا، فیصل کیانی اور طاہر مرزا کی فیملی کی رشتہ داری اگر سب سے زیادہ کسی کے لئے مسئلہ بنی تھی تو وہ شہاے عباس تھا، طاہر مرزا کا بڑا بیٹا شہاے عباس کے ڈسٹرکٹ کا ڈی سی تھا اور جس طرح کی اور جتنی پرابلمز وہ اس کے لئے کھڑا کر سکتا تھا اس نے کی تھیں، مسئلہ یہ تھا کہ اس کے باپ کے آرمی والوں سے کسی قسم کے دوستانہ تعلقات نہیں تھے ورنہ شیراز مرزا کا تبادلہ کروانا اس کے باپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

''میں نے اس وقت ان ساری چیزوں کے متعلق تمہیں وارن کیا تھا تب تمہیں یہ سب محض امکانات لگ رہے تھے اب تم صبر کرو، فروری میں ہونے والے الیکشنز تک اور دعا کرو کہ ہماری پارٹی کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

اس کے باپ نے اس کی شکایت کے جواب میں جواباً کہا تھا۔

''اس کی دعا سے کچھ نہیں ہونے والا جو کرنا ہے ہم لوگوں کی دوا نے کرنا ہے۔'' اس کے باپ کے کولیگ نے بائیں آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''آرمی والے بڑے سخت جان ہوتے ہیں اکبر صاحب، چھوٹی موٹی دوا اثر نہیں کرتی ان پر۔'' اس کے باپ کا لہجہ خاصا ذومعنی تھا۔

''تو چھوٹی موٹی دوا سے کام چلاتا بھی کس نے ہے ایک ہی بار انجکشن سے کام لیں ناں۔''

ان کی حمایت زدہ پارٹی کے سابقہ وزیر نے بھی مسکراتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں بوسن صاحب، بس وعدہ خلافی ہمیں پسند نہیں اس چیز کا خیال رکھیے گا۔'' دلاور عباس کی بات پہ قہقہہ پڑا تھا۔

''اس کی آپ فکر نہ کیجئے دلاور صاحب۔''

یہ ان کے گھر میں ہونے والی پہلی پارٹی نہیں تھی جس میں اس طرح کی بے تکلفانہ گفتگو ہو رہی تھی اس کا باپ اکثر اس طرح کی پارٹیز ارینج کروایا کرتا تھا، جن میں وہ شہاے کو بھی اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا، وہ ان لوگوں کی گفتگو کے دوران عموماً خاموش رہا کرتا تھا۔

ان پارٹیز میں ہر طرح کی ڈیلنگ کی جاتی تھیں، ہر طرح کا جوڑ توڑ بہت آسانی سے کر لیا جاتا تھا، کاروباری معاملات سے لے کر سیاسی معاملات تک ہر چیز ڈسکس کی جاتی تھی ہر چیز طے کی جاتی تھی، یہ ساری چیزیں اس کے لئے نئی نہیں تھیں اس لئے سیکھنے میں اسے زیادہ ٹائم بھی نہیں لگا تھا، اگلے چھ ماہ میں اس کی زندگی میں دو تبدیلیاں آئی تھیں، ایک اس کی اچانک لاہور سے بہاولپور ہونے والی پوسٹنگ، جسے رکوانے کے لئے اس کے باپ نے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا تھا، دوسری اس کی نیشل ابراہیم سے اچانک ہونے والی انگیج منٹ، اسے بہاولپور چارج سنبھالے ایک ہفتہ ہوا تھا جب نیشل کی اسے کال آئی تھی، وہ ان دنوں سان فرانسسکو میں تھی، اپنی ویکشنز وہ ایسے ہی گھوم پھر کر گزارا کرتی تھی۔

نیشل کی کال غیر متوقع نہیں تھی وہ اسے تقریباً روز ہی کال کیا کرتی تھی، غیر متوقع اس کا مطالبہ تھا وہ اسے سان فرانسسکو آنے کا کہہ رہی تھی۔

''فی الحال پاکستان سے تو کیا بہاولپور سے باہر جانا بھی میرے لئے امپاسبل نہیں۔'' یہ بہانہ نہیں تھا حقیقت تھی جو وہ اسے بتا رہا تھا۔

کچھ چیزیں آپ کی مجبوری ہوتی ہیں مگر ضروری نہیں ہوتا سامنے والا آپ کی وہ مجبوری سمجھے ان دونوں میں بہت سارے فرق تھے اور ان بہت سارے فرقوں میں ایک یہ بھی تھا۔

وہ اسے ہر بات بتا سکتا تھا منوا نہیں سکتا تھا، وہ اسے ہر بات بتاتی نہیں تھی ہاں منوایا ضرور کرتی تھی۔ اگلے ہفتے وہ سان فرانسسکو میں موجود تھا۔

اس عورت کی کوئی بھی بات رد کرنا کم از کم یہ وہ بات تھی جو اس کے بس میں نہیں تھی، وہ صرف پانچ دنوں کے لئے امریکہ آیا تھا اور یہ پانچ دن ان دونوں نے تقریباً اکٹھے ہی گزارے تھے، یشل اس کے آنے پر بہت خوش تھی اور اس کی یہ خوشی اس کے ایک ایک انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''لٹل ٹمنگ یہ بلیک ڈریس لے لو تم، یو نو بلیک بہت جچتا ہے تم پر۔'' وہ دونوں شاپنگ کے لئے نکلے تھے وہ اس وقت سان فرانسسکو کے مہنگے ترین مال میں موجود تھے۔

یشل مختلف لباس دیکھنے اور ریجیکٹ کرنے میں مصروف تھی، اسے کوئی ڈریس پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔

''تم مجھے وہ رنگ بتا دو جو میں پہنوں اور مجھ پہ نہ جچے۔''

''میں اگلے دس سال بھی یہاں کھڑا ہو کے سوچتا رہوں کہ وہ کون سا کلر ہے جو تم پہنو اور مجھے یہ لگے کہ وہ تمہارے لئے نہیں بنا ہے دس سال بعد بھی میں یہ فیصلہ کرنے میں ناکام رہوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بے بس لہجے میں کہا تھا

سامنے کھڑی عورت کے چہرے پر موجود مسکراہٹ فخریہ تھی اب اس میں غرور کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا، اسی دن اس نے یشل کی چوائس پر اس کے لئے رنگ خریدی تھی۔

''میرا دل چاہ رہا ہے تم مجھے باقاعدہ طریقے سے پرپوز کرو۔''

اور یشل کی چوائس پہ ہی اگلے دن ایک چھوٹی سی پارٹی میں جس میں اس کے اور یشل کے چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں اس نے وہ رنگ اسے پہنائی تھی، یشل ابراہیم آج بے حد خوش تھی اور اس کی یہ خوشی اس کے ہر ایک انداز سے ظاہر ہو رہی تھی، شہالے عباس مطمئن تھا اور اس کا یہ اطمینان اس کے چہرے کی چمک بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

''آپ کیوں رو رہی ہیں امی، رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔'' اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے آنسو پونچھتے اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''اللہ کے آگے رونے سے ہو جاتے ہیں۔'' اس کی ماں کا لہجہ یقین بھرا تھا۔

''آپ پچھلے بیس سال سے یہ کہہ رہی ہیں کیا ہوا؟ اللہ کے پاس ہم جیسوں کے لئے وقت نہیں ہوتا امی نہ ہی ہمارے جیسے لوگوں کے لئے معجزے ہوتے ہیں، اپنے حصے کی کوشش خود کرنی پڑتی ہے۔''

''لیکن بعض دفعہ کوشش سے بات نہیں بنتی امن دعا سے بن جاتی ہے، پریشانی آ جانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ آپ کے ساتھ نہیں ہے، بعض دفعہ اللہ کو آپ کی آزمائش مطلوب ہوتی ہے، اللہ آپ کے صبر کو جانچنا چاہتا ہے، زندگی دو ہی چیزوں کے ساتھ ہی گزرتی ہے امن، یا صبر کے ساتھ یا شکر کے ساتھ، دونوں میں سے کسی

ایک چیز کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے جو نہیں چلتے وہ حد سے نکل جاتے ہیں جو حد سے نکل جاتے ہیں پھر راستے انہیں جگہ نہیں ملتی نہ اس جہاں میں نہ اس جہاں میں۔'' وہ اپنی ماں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ سو رہی تھی جب اس کی آنکھ اپنے ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑے سے کھلی تھی، چند سیکنڈز تک آنکھیں کھول کر چھت کو گھورتے اس نے ان دونوں کے درمیان جاری جھگڑے کی وجہ کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، اس کا باپ ہمیشہ کی طرح آج بھی اونچی آواز میں بولتے کف اڑا رہا تھا، یہ چیز اس کے معمول میں شامل تھی، غیر معمولی چیز اس کی ماں کا آگے سے جواب دینا تھا، یہ چیز خود امن کے لئے بھی غیر متوقع تھی، گزرے سالوں میں اس نے کبھی اپنی ماں کو اپنے باپ کے آگے بولتے یا جواب دیتے نہیں سنا تھا، وہ ان شوہر کی گالیاں کھا کر اور چھپ کر رونے والی عورتوں میں شامل تھی۔

''ہاں تو اور ہوتی کس لئے ہے؟'' اس کے باپ نے انتہائی ڈھٹائی بھرے لہجے میں اطمینان سے کہا تھا۔

''کم از کم اس لئے نہیں ہوتی کہ اسے جوئے میں ہاری گئی رقم ادا کرنے کے لئے بیچا جائے یا اس کا سودا طے کیا جائے۔''

''بکواس بند کرو تم اپنی۔'' اس کی ماں کے سچ نے اس کے باپ کو آگ لگائی تھی۔

''میں نے وہ رقم ثمن کی شادی پہ خرچ کی تھی۔'' اس کے باپ نے اپنی بیوی کو گھورتے ہوئے جھوٹ بولا تھا۔

''سب جانتے ہیں کہ ثمن کی شادی پہ خرچ ہونے والی رقم کتنی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔'' اس کی ماں نے دوبدو جواب دیا تھا، اس کے بعد اگلے آدھے گھنٹے کے لئے ان دونوں کے درمیان لایعنی بحث اور جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور یہ جھگڑا اگلے دو دن تک ان کے گھر بار بار ہوتا رہا تھا، اس کے باپ نے گھر سے نکالنے سے لے کر طلاق تک ہر طرح کی دھمکی دی تھی اور بار بار دی تھی، مگر اس بار اس کی ماں ڈرنے یا جھکنے کے بجائے اپنی اولاد کے حق میں کھڑی تھی، وہ ایک بار خاموش رہی تھی اور اس ایک بار کا پچھتاوا اسے ساری عمر رہنا تھا۔

اپنی ایک بیٹی کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکی تھی اپنی دوسری بیٹی کے لئے اسے سب کچھ کرنا تھا۔

''شام کو آ رہا ہے سعود علی نکاح خواں کے لے کر دیکھتا ہوں میں کون روکتا ہے۔''

بالآخر تیسرے دن اس کے باپ نے دھمکیوں سے ہٹ کر فیصلہ کن لہجے میں اعلان کیا تھا تب پہلی بار اس کی ماں دہل گئی تھی ڈر گئی تھی بھی احسان علی کے باہر جاتے ہی وہ بھاگ کر اندر آئی تھی، امن کی طرف اس نے انتہائی بے بس نظروں سے دیکھتے جو کہا تھا اس نے امن کو حیرت سے اپنی جگہ پتھر کر دیا تھا۔

''میں کہاں جاؤں گی امی۔'' تیز تیز ہاتھ چلاتی اپنی ماں کو دیکھتے اس نے رو دینے والے لہجے میں پوچھا تھا، اس کی ماں اس کی چند گنی چنی چیزیں ایک پرانے سے بیگ میں ڈال رہی تھی۔

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے امن کہیں نہ کہیں تمہیں بھی پناہ مل جائے گی۔'' وہی اس کی ماں کا یقین بھرا لہجہ۔

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے امی لیکن ہمارے جیسے لوگوں کے لئے یہ ہمیشہ سے بہت تنگ رہی ہے۔''

''اللہ راستے بنا دیتا ہے امن بس انسان کا یقین مضبوط اور حوصلہ بلند رہنا چاہیے۔''

"میرے ساتھ ایسے مت کریں امی۔" اس نے روتے ہوئے اپنی ماں سے کہا تھا۔

"تو کیا کروں؟ یہاں بیٹھ کر سعود علی کی بارات کا انتظار کروں، میری بات سنو امن۔" اس کی ماں اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"وہ شخص تمہارا باپ ہے لیکن وہ اس دنیا کے چند خود غرض ترین لوگوں میں شامل ہے، اسے پیسوں کی ضرورت ہے اور اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اس نے ایک بیٹی کو اگر بیچ دیا ہے وہ دوسری کے ساتھ بھی یہی کرے گا، میں ثمن کو نہیں بچا سکی مگر میں تمہیں کھونا بھی نہیں سکتی، تم اپنی پھپھو کے پاس چلی جاؤ انہیں ساری بات بتانا میں دو چار روز میں آ کر خود تمہاری پھپھو اور نعمان سے بات کروں گی انشاء اللہ چند روز میں تم دونوں کا نکاح کروا دیں گے۔" اس کی ماں بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی، اس نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلایا تھا، پھپھو کے گھر پہنچ کر اس نے جب ساری بات ان کو بتائی اور۔

"تو پھر؟" اس کی پھپھو کا جواب اتنا ہی بے تاثر قسم کا تھا جتنا کسی بھی غیر متعلقہ شخص کا ہو سکتا تھا، تمام تر بات سن کر بھی انہوں نے اس سے کسی بھی قسم کی ہمدردی جتانے یا تسلی دینے کی کوشش نہیں کی تھی، اس کے برعکس ان کے چہرے اور آنکھوں سے شدید ناگواری اور ناپسندیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا امن۔" کچھ دیر تک اپنے بھائی کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے بعد انہوں نے کہا تھا، امن نے انہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ یہاں نہ آتی تو کہاں جاتی اس وقت ان کے گھر کے علاوہ اس کے لئے کہیں جائے اماں نہیں تھی، مگر انہوں نے اسے بولنے یا کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"بلکہ تمہاری ماں کو تمہیں یہاں نہیں بھیجنا چاہیے تھا وہ جانتی تو ہے میرا شوہر کس طرح کا انسان ہے میں تو شکر کر رہی ہوں کہ وہ ابھی گھر پہ نہیں ہے ورنہ ساری زندگی کے لئے طعنے میرا مقدر بن جاتے اس کے اور اس کے سارے خاندان کے، تمہاری ماں کو ذرا بھر تو میری پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے تھا، میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی اور نہ ہی تمہیں یہاں رکھ سکتی ہوں، تم واپس گھر چلی جاؤ بلکہ میری مانو تو......" اس کی پھپھو اس کے قریب ہو کے رازدارانہ انداز میں جھکی تھیں۔

"سعود علی کو جانتی ہوں میں بہت امیر کبیر اور اچھا بندہ ہے اس سے ہونے والی شادی تمہارے باپ کی ہی نہیں تمہاری اور تمہاری ماں کی بھی قسمت بدل سکتی ہے۔" وہ ٹکر ٹکر اس عورت کی شکل دیکھ رہی تھی جو اس کے باپ کی بہن تھی جس کے بیٹے کے ساتھ اس کا رشتہ طے تھا اور جو اپنی ہونے والی بہو کو کسی دوسرے مرد سے شادی کا مشورہ دے رہی تھی۔

"ہاں میں مانتی ہوں وہ تھوڑا کم رو اور عمر میں زیادہ ہے مگر یہ چیزیں فرق نہیں ڈالتیں دولت جو ہوتی ہے اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اسے انسان کے سارے عیب چھپانے آتے ہیں، یہ انسان کی کسی خامی کو خامی نہیں رہنے دیتی، سعود علی کے ساتھ تم ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہو، نعمان کے پاس ہے ہی کیا چند ہزار کی نوکری، چند ہزار کے ساتھ ہم زندگی کو نہیں گزارتے زندگی ہمیں گزارتی ہے۔" وہ عورت اسے بیچ بازار میں کھڑا کر کے تھپڑ مار دیتی اسے اتنی تکلیف اتنی اذیت اور ایسی شرمندگی نہ ہوتی جو اسے اس عورت کے کہے ان چند الفاظ سے ہوئی تھی، خون کے رشتے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں

نام کے بھی ہوں تو بھی ان کی طرف سے ملنے والے دکھ انسان کو اذیت ضرور دیتے ہیں، اس نے اس عورت کو جواباً کچھ نہیں کہا تا، ایسا کوئی جواب تھا ہی نہیں جو وہ اسے دے سکتی، وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھی تھی، اس کی پھپھو نے اسے روکنے یا کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ واپس جا رہی تھی اس سے بڑا اطمینان ان کے لئے کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ اقصیٰ کے پاس آئی تھی، اقصیٰ اس کی چند بہترین دوستوں میں تھی اور اس وقت اس سے مدد لینے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، اقصیٰ کو اس نے اصل وجہ نہیں بتائی تھی، بھرم توڑنا اس کے لئے ہمیشہ سے مشکل چیز رہا تھا، اس نے اقصیٰ کو بتایا تھا کہ اس کی ماں کی دوسرے شہر میں رہنے والی کزن فوت ہوئی ہیں جس کی وجہ سے اس کے ماں باپ کو اچانک جانا پڑا تھا، گھر میں کوئی نہیں تھا اس لئے مجبوراً [illegible] آنا پڑا تھا، بہانہ بہت مضبوط نہیں تھا اور زیادہ دن [illegible] بھی نہیں سکتا تھا مگر اسے زیادہ دن وہاں رہنا بھی نہیں تھا، اسے اب نعمان کی واپسی کا انتظار تھا، زندگی میں بہت سارے رشتوں کی حقیقت اس پہ کھل گئی تھی محبت کی کھلنا ابھی باقی تھا۔

اگلے دو دن وہ اقصیٰ کے گھر رہی تھی اقصیٰ اور اس کے گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا، اقصیٰ اس کے آنے پر بہت خوش تھی اور یہ چیز اس کے رویے سے ظاہر ہو رہی تھی، دو دن بعد وہ ایک بار پھر نعمان منزل آئی تھی، تین دن پہلے وہ یہاں اس عورت سے مدد لینے آئی تھی جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا تین دن بعد وہ اس مرد سے مدد لینے آئی تھی جس سے اس کا دل کا رشتہ تھا، دروازہ نعمان نے ہی کھولا تھا۔

''تم۔'' امن پر نظر پڑتے ہی اس نے جس انداز میں تم کہا تھا اس نے امن کو ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

کیا کیا نہیں تھا اس ایک تم میں حیرت، افسوس، ناگواری، غصہ۔

''اب کیوں آئی ہو یہاں؟'' اجنبی لہجہ اور ناگوار انداز یہ نعمان حیات نہیں تھا کم از کم وہ نعمان حیات نہیں تھا جسے وہ پچھلے بہت سارے سالوں سے جانتی تھی۔

''اب اور کیا رہ گیا ہے جو لینے آئی ہو؟'' ناگوار لہجہ میں اب طنز بھی شامل ہو گیا تھا، اسے حیرت ہو رہی تھی وہ اس سے اس طرح کا برتاؤ کیوں برت رہا تھا۔

''نعمان آپ کیا کر رہے ہیں؟'' روہانسے لہجہ میں وہ بے چارگی سے بس پوچھ سکی تھی۔

''حد ہوتی ہے بے غیرتی اور بے شرمی کی امن، کہاں تھی تم پچھلے دو دن اور دو راتوں سے کس کے ساتھ تھی اور کیوں تھی؟'' مسئلہ یہ نہیں تھا وہ اس سے سوال پوچھ رہا تھا، یہ اس کا حق تھا مسئلہ اس کا لہجہ تھا جس میں شک تھا نفرت تھی اور ......اور بے اعتباری تھی۔

''آپ کو پھپھو نے نہیں بتایا کہ میں کہاں تھی اور کیوں تھی، آپ جانتے ہیں وہ میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔'' اس نے شروع سے آخر ہر چیز اسے بتائی تھی، اس کے سامنے رکھ دی تھی، وہ سینے پر بازو باندھے بہت آرام سے اسے سن رہا تھا اور اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کی ہر بات کو محض کہانی ہی سمجھ رہا تھا۔

''تم کیسے بیوقوف سمجھتی ہو امن، مجھے یا پھر اس ساری دنیا کو اس کے خاموش ہونے پر اس نے اسی سکون بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔'' وہ بنا

پلک جھپکے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''ایسی ہی ایک کہانی مجھے تمہاری ماں نے بھی سنائی تھی جب میں تمہارے گھر گیا تھا امی نے بتایا تھا مجھے کہ تم پچھلے دو دن سے گھر سے غائب ہو، میری ماں رو رہی تھی وہ بے حد پریشان تھی، مجھے اپنی ماں کے رونے اور پریشان ہونے کا یقین نہیں آیا مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا مجھے تم پہ اعتبار تھا۔'' اس نے تھا پر زور دے کر کہا امن کو اس چیز نے تکلیف دی تھی۔

''مجھے اپنی ماں کا یقین نہیں تھا مجھے تمہارا یقین تھا اور مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا میرا یقین غلط تھا۔''

امن کو پتہ نہیں چلا اس کی آنکھوں سے نمکین قطرے گرنے لگے تھے۔

''تمہاری ماں نے بھی یہی کہانی سنائی تھی، مجھے جب میں تمہارے گھر گیا تھا اور میں احمق میں نے سب سچ مان لیا، تمہاری ماں کے بقول انہوں نے تمہیں میرے گھر میری ماں کے پاس بھیجا تھا اور میری ماں نے تمہیں اپنے گھر رکھنے سے انکار کر دیا تھا، میں بہت غصے میں گھر آیا تھا، زندگی میں پہلی بار بھی میں اپنی ماں سے لڑا ان کے سامنے سر اٹھایا تھا تو بھی وجہ تم تھی میں نے دوسری بار بھی یہ کام کیا تو تمہارے لئے، میری ماں میرے سامنے روتی رہی اور مجھے یقین دلاتی رہی کہ تم یہاں نہ تو آئی اور نہ ہی انہیں اس ساری بات کا علم ہے، میں نے یقین نہیں کیا کرتا بھی کیسے میرے سر پہ محبت نامی شے کا بھوت سوار تھا، پھر میں نے تمہارے باپ کو بلایا، وہ بے حد پریشان تھے اور میرے پوچھنے پر وہ شخص دھاڑیں مار کر میرے سامنے رویا اس کی بیٹی نے اسے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، اس شخص نے میرے سامنے قسم کھائی کہ یہ سب الزام ہے اس پر، بھلا کوئی شخص جھوٹ کا رو سکتا ہے ڈرامہ کر سکتا ہے مگر جھوٹی قسم کیسے کھا سکتا ہے؟''

''وہ اسے بتا نہیں سکی کہ اس کا باپ کھا سکتا تھا وہ پیسے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا، وہ صرف ایک کام کر سکتی تھی اسے اپنی سچائی اور بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش اور یہ کوشش وہ اگلے تین دن تک کرتی رہی تھی۔''

دنیا میں سب سے تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ آپ اسے اپنی سچائی کا یقین دلاؤ جس سے آپ محبت کرتے ہو اور وہ آپ کا یقین نہیں کرے اور یہ تکلیف اس نے سہی تھی اور بار بار سہی تھی۔

نعمان حیات نے بھی اس کے ساتھ ہی کیا تھا اس نے اس کا یقین نہیں کیا تھا، اس کے آنسو اس کا رونا اس نے ہر چیز کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھی، وہ جو کہہ رہی تھی جو بتا رہی تھی وہ اس کا اعتبار نہیں کر سکتا تھا، وہ اس سے محبت کر سکتا تھا اس کے لئے جان دے سکتا بس اس کا اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔

وہ واپس جا رہی تھی تو ناکام تھی، وہ اسے یقین نہیں دلا سکی تھی، اسے اپنی ناکامی پہ رونا آیا، اسے اپنی بے بسی پہ رونا آیا، اسے اس محبت پہ رونا آیا جو وہ شخص اس سے کرتا تھا، اسے اس محبت پہ رونا آیا جو اسے اس شخص سے ہو گئی تھی۔

''ساری دنیا میں تمہارے خلاف کھڑی ہو جائے تو بھی نعمان حیات وہ شخص ہے جو ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو گا۔'' اسے اپنی ماں کے یقین پہ رونا آیا، وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھی اور اسے پتہ نہیں تھا وہ کس کس چیز کے لئے رو رہی تھی۔

''مرد کی محبت پانی کے بلبلے کی طرح ہوتی ہے۔'' ایک بار اس کی ماں نے کہا تھا، اسے آج

پتہ چلا اس کی ماں نے سچ کہا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت مشکل سے واپس اقصیٰ کے گھر پہنچی تھی اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ خود پہ بیتنے والی قیامت سے اپنی دوست کو کیسے بے خبر رکھے گی، اس کا چہرا اس وقت اس کتاب کی طرح تھا جسے کوئی بھی باآسانی پڑھ سکتا تھا، گھر میں اس وقت صرف اقصیٰ ہی تھی اس کی والدہ اور دوسری بہن بازار گئیں ہوئیں تھیں، اقصیٰ نے اس کے معمول سے زیادہ سرخ اور سوجے ہوئے چہرے اور بھاری ہوتے پپوٹوں کو حیرت سے دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے امن؟'' اس نے پریشان ہوتے لہجے میں اس سے استفسار کیا تھا، بمشکل اسے ڈالنے اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرتے وہ کمرے میں آ گئی تھی۔

اگلے دو دن اس نے بخار میں اور روتے ہوئے گزارے تھے، اقصیٰ اس کے لئے بے حد پریشان تھی اس نے ان دو دنوں میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا، دو دن بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تھی، وہ گھر سے باہر آئی تھی، اس کا ارادہ اپنی ماں سے رابطہ کرنے کا تھا۔

اقصیٰ کے گھر میں وہ اپنی ماں سے بات نہیں کر سکتی تھی، اسے بات کھل جانے کا خدشہ تھا، اس کی ماں کے پاس فون نامی کوئی چیز نہیں تھی اس نے ساتھ والی کوثر خالہ کے گھر کال کی تھی کوثر خالہ کی اس کی ماں کے ساتھ کافی دوستی تھی وہ ان کے گھر کے حالات سے واقف اور ان کی ہمدرد تھیں، اس کا رابطہ کوثر خالہ سے نہیں ہو سکتا تھا، وہ مایوس سی واپس آئی تھی اور واپس آتے اسے پتہ چلا تھا کہ اس کا باپ اقصیٰ کے گھر ہنگامہ کر کے اور پولیس لانے کی دھمکی دے کر گیا تھا، اقصیٰ کے گھر کا نعمان نے انہیں بتایا تھا کہ امن وہاں رہ رہی ہے۔

بھرم ٹوٹا تھا اور بہت بری طرح سے ٹوٹا تھا، کچھ لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں گرنے پہ آتے ہیں تو پھر حد نہیں دیکھتے گرتے چلے جاتے ہیں اور اس کا باپ بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔

☆☆☆

اقصیٰ اور اس کے گھر والوں کا رویہ اتنا ہی عجیب اور برا تھا جتنا وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

''تمہیں مجھے کچھ تو بتانا چاہیے تھا امن تمہاری وجہ سے آج مجھے اپنے گھر والوں کے سامنے کتنی شرمندگی ہوئی تم سوچ بھی نہیں سکتی، تم نے مجھے اپنے گھر والوں سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' اقصیٰ کے شکوے نے اسے شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرایا تھا۔

''کیا بتاتی اقصیٰ ہر چیز آسان ہوتی ہے اپنی عزت نفس پامال کر آسان نہیں ہوتا، میں کیا بتاتی اور کیسے بتاتی کہ پوری دنیا میں وہ ایک شخص جو آپ کے لئے تحفظ اور فخر کا ضامن ہوتا ہے، وہ میرے لئے خطرے کا باعث ہے، میں کس منہ سے بتاتی اقصیٰ کہ میں اپنے باپ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے بھاگتی اور چھپتی پھر رہی ہوں، کیونکہ میرا باپ ایک عادی جواری ہے اور وہ جوئے میں ہاری جانے والی رقم اپنی بیٹی بیچ کر ادا کرنا چاہتا تھا۔'' وہ بتاتے ہوئے رو پڑی تھی، کئی دن کی بے بسی اور اذیت کتنے سارے دکھوں کا بوجھ، وہ سب کہہ رہی تھی سب بتا رہی تھی بتاتی چلی جا رہی تھی۔

''مجھے بہت افسوس ہے امن اس سب کے لئے جو تمہارے ساتھ ہوا اور میری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ میں جس حد تک ہو سکتا تمہاری مدد کر سکوں۔'' اقصیٰ نے اس سے کہا تھا اور اس نے واقعی ہر ممکن حد تک اپنا کہا نبھانے کی کوشش کی

تھی، وہ اپنے گھر والوں کو تو اس کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں کر سکی تھی کیونکہ وہ کسی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے اور مفت کی مصیبت لینے کو تیار نہیں تھے، لیکن اس نے اپنی دوست کو اس کی مدد کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

''اس وقت سب سے ضروری چیز تمہاری حفاظت ہے امن اور وہاں تم بالکل محفوظ رہو گی۔'' اقصیٰ کی بات پر اس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔

''زندگی انہی چیزوں سے مل کر بنتی ہے امن، اگر اچھا وقت ہمیشہ نہیں رہتا تو برا بھی گزر ہی جاتا ہے۔'' اقصیٰ نے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی بھرے انداز میں دباتے کہا تھا۔

''تم نہیں جانتی اقصیٰ میری زندگی میں اب کچھ نہیں بچا، میں اگر یہاں سوچنے بیٹھوں کہ وہ کون سی چیز رہ گئی ہے میری زندگی میں جو مجھے خوشی یا سکون دے سکتی ہے تو اگلے کئی گھنٹے بھی میں یہ یاد کرنے میں ناکام رہوں گی، کچھ لوگوں کی زندگی سے کچھ چیزیں چلی جاتی ہیں میرے زندگی سے سب کچھ نکل گیا ہے، میں وہ عورت ہوں جس کا آج نہیں ہے اور جس کا کوئی کل بھی نہیں ہے۔''

''وقت بدل جاتا ہے امن۔'' اقصیٰ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''میں جانتی ہوں وقت بدل جائے گا ہر چیز بدل جائے گی مگر سب کچھ بدلنے کے باوجود بھی کچھ ایسا بھی ہے جو کبھی نہیں بدلے گا۔''

''انسان ایسے ہی ہوتے ہیں امن بس ہمیں پتہ اکثر اس وقت چلتا ہے جب دیر ہو چکی ہوتی ہے مگر تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ نعمان کی حقیقت جلدی کھل گئی، اگر یہ چند سال بعد کھلتی تب تم کیا کرتی، ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے تب وقت تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔''

''جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا مجھے اس پر افسوس نہیں ہے اگر میرا اپنا باپ میرے ساتھ یہ سب کر سکتا ہے تو دنیا کا کوئی بھی انسان میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے، بات اس کی حقیقت کھلنے کی نہیں ہے بات میرے یقین ٹوٹنے کی ہے اس پوری دنیا میں اگر کوئی شخص ایسا تھا جس پہ میں اعتبار کرتی تھی تو وہ نعمان حیات تھا، اس پوری دنیا میں اگر کسی نے میرا یقین توڑا ہے تو بھی وہ نعمان حیات ہی ہے، محبت اچھی چیز ہوتی ہے مگر غلط انسان سے کر لی جائے تو زندگی بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔''

☆☆☆

بہاولپور آنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر کوثر خالہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی اب کی بار اس کی کوشش کامیاب ٹھہری تھی، ان سے بات کر کے اس نے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا اور انہی کے ذریعے اسے پتہ چلا تھا کہ اس کے باپ نے گھر کو جہنم بنایا ہوا ہے وہ ہر روز اس کی ماں سے لڑتا اور اسے اور اس کے سارے خاندان کو گالیاں دیتا ہے بلکہ ایک دو بار اس نے اس پر ہاتھ بھی اٹھایا ہے، تب اس کا دل چاہ تھا کہ وہ واپس آ جائے اور یہی بات اس نے ان سے بھی کہی تھی، تب انہوں نے اس کی ماں کی قسم دے کر واپس آنے سے روکا تھا، کوثر خالہ سے بات کرنے کے بعد وہ نجانے کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔

☆☆☆

سان فرانسکو سے واپس آنے کے دو ہفتے بعد اس کی اور ریشل کی انگیج منٹ کی گئی تھی، شہر کے سب سے بڑے میرج ہال میں کی جانے اس انگیج منٹ میں شہر کی تمام ترکریم موجود تھی، اپنی

انجیج منٹ کے چوتھے روز ہی وہ واپس بہاولپور آ گیا تھا، یہاں وہ کافی حد تک سیٹ ہو گیا تھا ڈی سی کے ساتھ بھی اس کے اچھے تعلقات تھے اور ان دونوں کے درمیان اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

عملہ بھی کوآپریٹو اور کافی حد تک فرمانبردار قسم کا تھا، شہر کی چند بڑی سیاسی اور سماجی شخصیات بھی اس کے رابطے میں رہتی تھیں، سو فی الحال اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، اسے بہاولپور آئے ایک ماہ ہو چکا تھا کل سے عذیر اس کے پاس آیا ہوا تھا سو آج آفس جانے کے بجائے وہ گھر پہ ہی تھا دن ساتھ گزارنے کے بعد انہوں نے ڈنر باہر کیا تھا اور انہیں واپس آئے آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا جب اس کے پاس اے ایس پی خضر حیات کی کال آئی تھی، شہر کی مشہور کاروباری شخصیت خواجہ قربان کی بیٹی کا مرڈر ہو گیا تھا، اس کا موڈ ایکدم سے آف ہوا تھا وہ بہت تھکا ہوا تھا اور سونا چاہ رہا تھا مگر اب اسے یہ چیز خواب ہوتی نظر آ رہی تھی، اے ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

''مقتولہ نے مرتے ہوئے نزعی بیان دے دیا ہے جس کی روشنی میں قاتل کو گرفتار کر لیا گیا ہے جب وہ شہر سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔''

اس کے عملہ کی سب سے اچھی بات یہی تھی کہ وہ ٹرینڈ اور خاصی حد تک چوکس تھا، اسے انہیں بات بات پہ ہدایات دینے یا مغز کھپانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

''کون ہے قاتل؟'' اس نے کسی حد تک ریلیکس ہوتے خضر حیات سے سوال کیا تھا۔

''سر پنجاب کے مشہور بزنس مین فیصل کیانی کا بھانجا راحیل کیانی۔''

اسے تھانے پہنچے بمشکل ایک گھنٹہ ہوا تھا اور اس ایک گھنٹے میں فیصل کیانی نے چھ بار کال کرتے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، اس کی ہدایات پر اس کے اسسٹنٹ نے چھٹی بار بھی ''سر آفس میں نہیں ہے۔'' کی گردان جاری رکھی تھی۔

''تمہارے سر کی تو......'' اس نے ایک موٹی سی گالی دے کر کال ڈسکنکٹ کی تھی۔

اگلے ایک گھنٹے میں اس نے مزید کئی کالز کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، بالآخر رات بارہ بجے کے قریب شہالے نے اس کی کال ریسو کی تھی۔

''میرے بھانجے کو کیوں پکڑ رکھا ہے۔'' شہالے کے ہیلو کے جواب میں اس نے غرا کر پوچھا تھا، اس کا لہجہ انتہائی رعونت آمیز تھا۔

''تمہیں یہ پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے بھانجے کو پکڑ لیا گیا ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ کس وجہ سے پکڑا گیا ہے۔''

''نہیں مجھے نہیں معلوم اسے کس وجہ سے اریسٹ کیا ہے تم نے، میں وہ وجہ تم سے جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے تم سے پر زور دیا تھا۔

''قتل کیا ہے تمہارے بھانجے نے اور یہ وجہ کافی ہوتی ہے کسی کو اریسٹ کرنے کے لئے۔'' شہالے اس کے طیش بھرے لہجے کے جواب میں بہت سکون سے بات کر رہا تھا اور یہی چیز فیصل کیانی کے اشتعال میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

''بکواس بند کرو تم اپنی، الزام لگانے سے پہلے تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تم کس کے بارے میں اور کیا بات کر رہے ہو۔'' فیصل کیانی نے گالیاں دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اگلے دس منٹ میں وہ تھانے سے باہر

ہونا چاہیے۔'' اب اس کا انداز حکمیہ تھا جیسے وہ اپنے کسی سرونٹ سے بات کر رہا ہو۔

''اگلے دس منٹ میں تو کیا اگلے دس دن میں بھی تمہارا بھانجا سے باہر نہیں جا سکتا۔'' شہالے عباس کا انداز اور لہجہ سابقہ تھے۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔'' فیصل کیانی نے تمسخر بھرے لہجے میں اسے یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

''تم جس قانون کے ملازم ہو وہ قانون میرے دروازے کی رقاصہ ہے۔'' اس کا فقرہ اسے کسی چابک کی طرح لگا تھا، اپنے اشتعال کو قابو کرنے کے لئے اسے کتنے ہی سیکنڈز لگے تھے۔

''او کے فائن، اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو تم مجھے اسے اس تھانے سے باہر تو کیا اس تھانے کے اندر ہی مل کے دکھاؤ۔'' اس نے چیلنج کرتے انداز میں کہا تھا۔

اور واقعی اگلے چار دن تک فیصل کیانی نے ہر طرح کی کوشش کر لی تھی اسے یا اس کے کسی بھی جاننے والے کو اس کے بھانجے سے نہیں ملنے دیا گیا تھا، ہر کوشش بے اثر ہر سفارش بے معنی شہالے عباس کو دی جانے والی تمام تر دھمکیاں اور دباؤ، اس نے بہت طریقے اور سکون سے برداشت کیا تھا، یہاں تک کے اس کے باپ نے بھی کال کی تھی۔

''اسے کچھ زیادہ اچھی خبریں نہیں آ رہی اوپر سے جہنم میں جائیں وہ سب تم اپنے کیرئیر کو داؤ پر کیوں لگا رہے ہو۔'' بہت سا سمجھانے کے بعد انہوں نے اسے وارن کرنے کی کوشش یک تھی۔

''بات اب کیرئیر سے بڑھ کر عزت پہ آ گئی ہے پیچھے ہٹ جاؤں گا تو مرد نہیں کہلاؤں گا۔''

اس کی بات نے انہیں خاموش ہو جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دو دن میں اسے ڈی آئی جی کے آفس میں طلب کر لیا گیا تھا۔

''تم میرے بہت قابل اور بہترین آفیسر ہو اس طرح کی بیوقوفی کی امید نہیں تھی، مجھے تم سے......'' ان کی بات نے اسے سر اٹھا کر انہیں دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا اس کے دیکھنے پر وہ ذرا سا سنبھلے تھے۔

''یہ ان لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے شہالے ہمیں بیچ میں نہیں آنا چاہیے۔'' اب کی بار انہوں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

اسے ان کی باتیں سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی حیرت تب ہوئی جب وہ انہیں جانتا نہ ہوتا وہ انہیں بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔

بہت سا سمجھانے اور بہت ساری حقیقتوں کو اس پہ واضح کرنے کے بعد انہوں نے اسے واپس بھیجا تھا، وہ جتنی خاموشی سے گیا تھا اتنی ہی خاموشی سے واپس آیا تھا ان کے سمجھانے کا اس پر کتنا اثر ہوا تھا وہ یہ اندازہ لگانے سے انتہائی قاصر تھے۔

اگلے چند دن میں کی جانے والی مزید کوششوں اور ان کوششوں میں ناکامی نے فیصل کیانی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھ، مصالحت اور ڈیل کے لئے اس نے بیرسٹر عارف باجوہ کا سہارا لیا تھا۔

''فیصل صاحب ملنا چاہتے ہیں آپ سے۔'' وہ آفس سے گھر جا رہا تھا جب اسے عارف باجوہ کی کال آئی تھی۔

''میں اگلے دو دن فری نہیں ہوں۔'' ایک ہاتھ سے سیل تھامے دوسرے سے منہ میں دبائے

سگریٹ کا شعلہ دکھاتے اس نے اسی سکون سے کہا تھا جو اس کا خاصا تھا، اقرار یا انکار دونوں سے عاری لہجہ۔

''ہم صرف دس منٹ لیں گے۔'' عارف باجوہ کو اس کے لہجے سے تقویت ملی تھی۔

''میں شام لاہور جارہا ہوں۔''

''آپ جگہ بتا دیں ہم لاہور آ جائیں گے۔''

''میں اپنے گھر جارہا ہوں اور اگلے دو دن اپنی فیملی کے ساتھ ہی رہوں گا۔''

''لیکن فیصل صاحب آپ کے گھر کیسے آ سکتے ہیں، آئی مین آپ کے فادر شاید پسند نہ کریں اس بات کو۔'' عارف باجوہ نے جھجکتے ہوئے کہا تھا، اس کے سرخ لبوں پر جاندار سی مسکراہٹ چھلکی تھی۔

''آپ فیصل صاحب سے کہیں وہ خود کال کر کے پوچھ لیں ان سے۔'' اس نے آرام سے کہتے ہوئے سیل آف کر دیا تھا۔

فیصل کیانی نے بے اختیار اسے گالیاں دینی شروع کر دی تھیں، مگر اس کے انداز سے چھلکتی بے بسی ظاہر کر رہی تھی کہ اس کے مشورے پر عمل کرنے کے علاوہ فی الحال کوئی راستہ نہیں تھا اس کے پاس۔

☆☆☆

کمرے میں اس وقت پانچ نفوس موجود تھے، تین وہ جو یہاں معاملات طے کرنے اور ڈیل پکی کرنے آئے تھے، ایک وہ جو اس گھر کا مالک تھا اور ایک وہ جو اس وقت اس منظر کا سب سے اہم کردار تھا۔

فیصل کیانی نے گلا کھنکار کے اپنی بات شروع کی، وہ اس وقت خاصا ریلیکس بیٹھا تھا یہاں آئے ہوئے جو ٹینشن اور الجھن جو اس کے ساتھ تھی یہاں آ کے وہ کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

بینک بیلنس، زمین، جائیداد، پرموشن اور یہاں تک کے فیڈرل گورنمنٹ میں منسٹری، اس کی آفرز پرکشش بھی تھیں جاندار بھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی چیز یا یہ ساری چیزیں میری قیمت ہو سکتی ہیں؟'' اس کی بات پر سب نے ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا یہاں تک کہ اس کے باپ نے بھی۔

''میں اپنی خریدی ہوئی چیز دوبارہ نہیں بیچتا تم ضمیر خریدنے آئے ہو، دولت، طاقت، اختیار یہ چیزیں تمہارے لئے سب کچھ ہو سکتی ہیں میرے لئے کچھ بھی نہیں۔''

''ہیں چند چیزوں کے لئے تم خود بک سکتے ہوں انہی چیزوں کے ساتھ مجھے تولنے کی کوشش مت کرو۔''

فیصل کیانی یہاں ڈیل طے کرنے آیا تھا یہ اس کے انداز سے بہت پہلے ہی سب کو پتہ چل گیا تھا، شہالے عباس نے اسے یہاں کس لئے بلایا تھا، اس چیز کا اندازہ سب کو اب ہو رہا تھا، اس نے فیصل کیانی کو وہاں ذلیل کرنے کے لئے بلایا تھا۔

پچھلے تین سال سے فیصل کیانی جو کچھ اس کے ساتھ کر رہا تھا اس کا بدلہ اس نے اگلے تین گھنٹے میں لے لیا تھا، وقت بڑی عجیب چیز ہوتا ہے ہمیشہ کسی ایک کی مٹھی میں رہتا ہے اور فیصل کیانی کی بدقسمتی یہ کہ وہ اس وقت شہالے عباس کی مٹھی میں تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

☆☆☆

فلاور ہاؤس لفظی معنی کے اعتبار سے بس نام کا ہی فلاور ہاؤس تھا، کیونکہ وہاں نہ وسیع و عریض گھاس کے قطع تھے، نہ موسمی، بے موسمی اور سدا بہار رہنے والے پھولوں کی کیاریاں، گملے، قطاریں، لیکن مفہوم کے اعتبار سے فلاور ہاؤس واقعی پھولوں والا گھر تھا، ہر سائز کے چھوٹے بڑے، رنگ برنگے، خوشبودار پھول یہاں بستے تھے اور یہ پھول کوئی اور نہیں، فلاور ہاؤس میں کھلنے والی تیسری نسل کی شکل میں تھی، جن کی ننھی منی قلقاریوں پر جی جان سے فدا، دادا جان یعنی صغیر آفریدی نے اپنے گھر کے گیٹ پر فلاور ہاؤس اس وقت لکھوایا جب ارمان آفریدی کے بعد ارمین آفریدی نے اس گھر میں آنکھ کھولی۔

ارمین آفریدی نہ تو گھر کی سب سے بڑی پوتی تھی، نہ سب سے چھوٹی نہ اکلوتی مگر بس کچھ تو تھا اس میں ایسا کہ جو دیکھتا پیار سے چوم لیتا، بھینچ لیتا اور جو کوئی زیادہ ہی جذباتی ہو جاتا تو چٹا پٹ بوسے لے کر کر سفید سفید پھولے پھولے گال سرخ کر ڈالتا اور ان جذباتی لوگوں میں سرفہرست تھا، شاہان آفریدی۔

شاہان آفریدی، صغیر آفریدی کے سب سے بڑے فرزند مشکور آفریدی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔

دس سالہ شاہان آفریدی کو چھ ماہ کی یہ چینی گڑیا اس قدر پسند تھی کہ دن کا بیشتر حصہ وہ اسے گود میں لادے لادے پھرتے، یوں ارمین آفریدی کو سب سے پہلے گود کی عادت ڈالنے والے بھی وہی تھے، اسے اپنا عادی بنانے والے بھی وہی تھے ارمین کی ہر ضد اپنے بس میں ہوتی تو فوراً سے پہلے پوری کر ڈالنا اور اس کے لاڈ اٹھانا جہاں تک ممکن ہو سکے، گویا ان کا فرض عین تھا۔

مکمل ناول

تو میٹھے گھاٹ کا پانی
فرحین اظفر

گھر کے بڑے جہاں ان کی حرکتوں سے حظ اٹھاتے، وہیں برابر کے بچے کچھ تو ہنستے اور کچھ چڑ چڑ جاتے، مگر شاہان آفریدی نے کب کسی کی پرواہ کی تھی۔

☆☆☆

جنوری کا مہینہ تھا اور کراچی کی وہی ہمیشہ والی نکمی سردی، سیلی سیلی، مدھم اور خوشبودار، رات کی رانی سے مہکتی۔

فلاور ہاؤس کی مکینوں کے لئے یہ مہینہ ہمیشہ سے ہی تفریح کا سامان کرتا تھا، گھر کے چار افراد کی سالگرہیں منائی جاتی تھیں۔

سب سے پہلے چھوٹے چاچو کی سالگرہ آتی اور سب ان کی عمر پوچھ کر انہیں زچ کرتے رہتے۔

''جی نہیں...... بالکل غلط۔'' ارمان دائیں بائیں سر ہلا کر انکشاف کرتا رہتا۔

''چالیس کے تو آپ تب ہوئے تھے، تین سال پہلے۔'' چاچو بے چارے کھسیانے سے ہو کر ہنس پڑتے۔

''بھئی کیا کریں، اب لگتے نہیں چالیس کے تو۔'' وہ بے چارگی سے چچی کو دیکھ کر خواہ مخواہ صفائی پیش کرتے اور چھوٹے بڑے ان کی وضاحتوں سے خوب مزہ لیتے۔

اس کے بعد نمبر آتا، چھوٹے چاچو کی ہی شنزا کا، جو گھر بھر کی بے بی تھی اپنی توتلی زبان میں پٹر پٹر بولتی سب کا دل موہ لیتی۔

پھر آتی ارمان آفریدی کی سالگرہ، اف ...... صبح سے گھر میں غدر مچ جاتا، یہ اٹھاوہ پٹخ، ٹی وی لاؤنج کو سجایا جاتا، رنگین پٹیاں، کریپ پیپرز اور غباروں سے سجا روم، ایک مہینہ پہلے سے گھر کے سب بڑوں کو یاد دہانی کروادی جاتی کہ اس بار ارمان آفریدی ان سے تحفے میں کیا وصولنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اب جبکہ سب ہی بچے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ رہے تھے، بچپن والی سالگرہ تو چھوڑ دی تھی، مگر ارمان آفریدی وہی تھا، وہیں تھا، مانگ کر سب سے تحفے لینے والا اور الٹا احسان جتانے والا۔

''شکر کرو کہ مجھے زیادہ مہنگا پرفیوم پسند نہیں، ورنہ کیا میں جانتا نہیں بڑی امی کو، بڑے ابو سے لڑ جاتیں، مگر مجھے میری پسند کا ہی لا کر دیتیں۔'' وہ پیشانی پر گرے بالوں کے گچھے کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سنوارتا، نمل کو آنکھ مارتا، وہ تپ جاتی اور بڑی امی، شاہان کو پیار سے بھینچ لیتیں۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، ایک ہی تو میرا شہزادہ ہے۔'' مہینے میں کتنی ہی بار، بار بار یہ سین دہرایا جاتا تھا۔

''ایک یہ آپ کے شہزادے ہیں اور ایک وہ...... شاہان صاحب۔'' نمل نے ہاتھ سے کہیں دور اشارہ کیا۔

''ماشاءاللہ سے پردیس جا کے جو بیٹھے ہیں تو ملنے کا نام نہیں لیتے۔'' نمل نے دانستہ بڑی امی کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا تھا، وہ ایک سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

شاہان ان کا اکلوتا اور سب سے بڑا بیٹا تھا، دو بیٹیاں کومل اور نمل اس سے چھوٹی تھیں، تعلیم مکمل کر کے باہر جاب کے لئے اپلائی کیا، قسمت اچھی تھی کہ بعد کے تمام مراحل تیزی اور آسانی سے یوں سمٹے کہ انہیں دو ماہ کے اندر اندر اپنی پسند کی جگہ نوکری مل گئی، اس کے بعد بارہ سال گزر گئے، شاہان کئی بار پاکستان آئے، مگر مستقل ٹھہر نہ سکے۔

جب وہ گئے تو دس سالہ ارمین اور بارہ سال کا ارمان بالترتیب چوتھی اور چھٹی کلاس میں تھے،

اب ماشاءاللہ دونوں ہی تعلیمی مدارج طے کر چکے تھے، ارمین نے انٹر کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور ارمان بی بی اے کر کے اپنے والد کی ہی اسٹیٹ ایجنسی سنبھالنے لگا، فی الحال وہ صبح کے وقت کہیں پارٹ ٹائم بھی کرتا تھا۔

''ارے یہ ارمین کہاں ہے؟'' بڑی امی سے لاڈ اٹھوائے اسے اچانک ہی ارمین کی یاد ستائی۔

''ہوگی کہاں گھسی ہوگی کچن میں سب کے لئے کچھ اسپیشل لنچ بنانے۔'' مہینے کی سب سے آخری اور سب سے خاموش، مسکراتی سالگرہ ارمین آفریدی کی ہوتی تھی، جسے وہ خود سیلبریٹ کرتی، سب کے لئے دو بڑے سارے کیک بیک کرتی، اچھا سا کھانا اور کوئی سویٹ ڈش، اگر چھٹی کا دن ہوتا تو دوپہر میں ورنہ رات کے کھانے پر سب مل کر کیک کاٹ لیتے اور بس...... اس سے زیادہ کی اسے خواہش تھی نہ طلب۔

بلکہ یوں کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ باپ کے انتقال کے بعد، اس کی خواہشات کے دائرہ تنگ ہوتا چلا گیا اور اب تو فقط ایک نکتے پر مرتکز تھا اور اس نقطے کا نام تھا..... ارمان آفریدی۔

سنہری دھوپ چھت کی منڈیروں پر سمٹ رہی تھی، جب اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا، تو تخت پر تہہ کیے ہوئے کپڑے سامنے ہی نظر آ گئے۔

''ارے یہ کس نے.....'' بلا ارادہ اس کے منہ سے نکلا۔

''میں نے۔''

چھت پر بنے چھوٹے سے کمرے کی مشرقی دیوار کے پار سے نکل کر وہ ایکدم ہی سامنے آ گیا۔

''اچھا!'' وہ ایکدم ہنس دی۔

''کیوں بھئی یہ مہربانی کیوں؟''

''بس ایک اچھا شوہر بننے کی پریکٹس کر رہا تھا۔'' اس نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے، ارمین کے ہاتھ میں موجود چائے کا کپ لے کر گھونٹ بھرا اور اس کے جھینپے ہوئے چہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔

وہ انجان نہیں تھی، وہ ایسا کہہ رہا ہے، کس کے لئے کہہ رہا ہے سب جانتی تھی، بلکہ وہ کیا، گھر کے ہر فرد واقف تھا، ارمان آفریدی کے دل کا ارمان گھر سے کہیں باہر نہیں، کوئی اور نہیں، ارمین آفریدی تھی، اس کی آنکھوں سے چھلکتے جذبے ہر ایک پر عیاں تھے اور گھر کی نوجوان نسل کے لئے بہت دلچسپی کا باعث بھی تھے، کیونکہ اس سے پہلے گھر میں کسی نے یوں کھلم کھلا اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ارمان سے بڑے ایمان آفریدی تھے اور ارمین سے چھوٹا جاثم آفریدی، پھر شاہان بھی تھے تو گھر کے فرد ہی ناں، مگر فلموں ڈراموں اور کہانیوں کی طرح اس گھر کی لڑکیاں اور لڑکے آپس میں ''کھپ'' نہ سکے تھے، جس کا بالخصوص سب ہی لڑکیوں کو بہت غم کھائے جاتا۔

''پتہ نہیں یہ رائٹرز کون سے گھروں کی بات کرتی ہیں جہاں بڑی ساری جوائنٹ فیملی میں تقریباً ہر لڑکا اپنی کزن کے ساتھ ''سیٹ'' ہوتا ہے۔''

کومل بڑی بے لاگ، بیہودگی سے اپنا تبصرہ ہم عمر بہنوں سے شیئر کرتی تھی، شاہان کے شادی سے صاف انکار کے بعد سب کی منتظر نگاہیں ارمان آفریدی پر ہی جمی تھیں، ریحان آفریدی نے گھر کے دوسرے بچوں کے برعکس تعلیمی میدان میں بہت تیر مارے تھے، اس لئے ان کی سب سے بڑی امیدوار خود کومل ہی تھیں، مگر

افسوس کہ تعلیمی میدان میں تیر مارنے والے کے دل پر کیوپڈ کا تیر چل نہ سکا اور ان کا کوئی جھکاؤ نہ پا کر کونی آفریدی کو خاندان کے باہر کے ایک انجانے کھونٹے سے باندھ دیا گیا۔

یوں ارمان کی، ارمین کے لئے پسندیدگی جاننے کے بعد ارمین کی والدہ اور دوسرے بزرگوں کو جہاں دلی اطمینان حاصل ہوا، وہیں لڑکیوں کے ہاتھ اسے چھیڑنے کے لئے ایک شغل آ گیا۔

''چلو شکر ہے کسی کو تو گھر کی بھیڑوں کا خیال آیا۔'' کونی کے تبصرے جوں کے توں تھے، چند دن ایمان کی بے رخی کا غم منانے کے بعد وہ خوشی خوشی اپنے منگیتر پر راضی ہو چکی تھی، بقول اس کے۔

''اب کسی کی قریب کی نظر ہی کمزور ہو تو کوئی کیا کرے۔'' کونی کی بات یاد آتے ہی ارمین کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کس سوچ میں گم ہو۔'' سنہری شعاعوں کے رنگ میں ڈوبا اس وقت ارمین کا چہرہ بھی سنہری سونے سا ہو رہا تھا، ارمان کا دل چاہتا تھا، اسے دیکھے ہی جائے۔

''تم نے سب کے سامنے میرے لئے اپنی پسندیدگی کا بھانڈا پھوڑ کے اچھا نہیں کیا۔''

''کیوں؟ یہ اتنی پرانی بات کا خیال تمہیں آج کیوں آ رہا ہے۔''

''پچ پرانی بات تمہارے لئے ہے، نمل اور کونی روز مجھے چھیڑتی ہیں، مجھے شرم آتی ہے اچھا نہیں لگتا۔'' معصومیت سے اپنی مجبوری بتاتی وہ ارمان کو اتنی بھائی کہ بلا ارادہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ایک بھانڈا میں آج بھی پھوڑنے والا ہوں رات کے کھانے پر وہ بھی ڈائننگ ٹیبل کے بیچوں بیچ۔''

''کیا؟'' وہ ایکدم ہونق سی ہو گئی۔

''تم سے شادی کا۔''

''ہیں؟'' وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی، پھر ایکدم لالوں لال پڑ گئی۔

''کیا پاگل ہوئے ہو، اتنی جلدی، ابھی تو تم صرف اکیس سال کے ہو۔''

''اکیس سال کا ہوں تو کیا شادی نہیں کر سکتا۔''

''اُفوہ یہ میں نے کب کہا۔'' وہ بات کو ٹال کر اٹھنے لگی، مگر اٹھ نہ سکی، اس کی کلائی پر ارمان کی گرفت تھی۔

''تو پھر، تمہارے خیال میں وہ کون سا کام ہے، جو میں نہیں کر سکتا۔''

''ارمان پلیز، مجھے تنگ نہ کرو۔'' اس کے لہجے میں حیا آمیز بے بسی تھی۔

''او کے، مگر یاد رکھنا، آج رات کے کھانے پر۔''

''نہیں نہیں کم سے کم میرے سامنے نہیں۔''

وہ ایسا ہی تھا، جلد باز، بے باک اور بے دھڑک قسم کا، اس کا کیا بھروسہ تھا بھلا، وہ اس کے چچا تایاؤں کے سامنے ہی شادی کی بات کرنے بیٹھ جاتا۔

کھٹ سے فیصلہ کر کے پٹ سے عمل کرنے والا، بولتا کہ ابھی نکاح پڑھواؤ اور اس کی ضد کے آگے سب مجبور ہو ہی جاتے، یوں بھی بڑے ابو اور بڑی امی شاہان کے جانے کے بعد اس کی ہر ادا پر فدا ہوئے جاتے تھے، چھوٹے چچا، بچوں سے کچھ ہی بڑے تھے، بچوں والے ہو کر بھی بچوں میں ہی گنے جاتے تھے، پھر بھلا بچتا کون؟ صرف چھوٹے تایا، یعنی ارمان کے والد اور اتنے لوگوں کے سامنے ان کی کیا چلنی تھی، سو عافیت

اسی میں تھی کہ ارمان کو اس کے ارادوں سے باز رکھا جائے، مگر وہ ارمان ہی کیا جو اپنے ارمان ٹھنڈے ہونے دے، وہ بھی اتنی آسانی سے۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے ارمان، ورنہ میں کھانے پر آؤں گی ہی نہیں۔'' اس کے ہاتھ سے خالی کپ پکڑتے ہوئے اس نے ایک بار پھر تنبیہ کرنی ضروری سمجھی۔

''ورنہ تم کیا کرو گی۔''

''ورنہ......'' اس نے یک دو لمحے سوچنے میں لگائے پھر ڈھیلی ہوگئی۔

''ورنہ میں کیا کرسکتی ہوں ارمان تم جانتے ہو، میں کچھ نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر بحث کیوں کررہی ہو۔''

''بحث کب کررہی ہوں۔'' وہ روہانسی سی ہوگئی۔

اپنی سالگرہ والے دن پورے گھر والوں کے سامنے اپنے ہونے والے دولہا سے اپنی ہی شادی کی خبر سننا، اس کے لئے بہت بے شرمی کی بات تھی۔

''تو پھر اور کیا کررہی ہو، خواہ مخواہ میں منع کیے جارہی ہو۔'' اس کا انداز ضدی بچے کا سا تھا جیسے ''تم سمجھتی ہی نہیں ہو۔''

''میں منع نہیں کررہی ارمان، میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ سب کے سامنے مت کہنا، تم یہ بات اکیلے میں چھوٹی تائی امی سے بھی تو کہہ سکتے ہو۔''

چند لمحے کی بات تھی، اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، ارمان یہ نہیں چاہتا تھا۔

''اوکے نہیں کروں گا۔'' وہ فوراً ہی مان گیا، ارمین نے چند لمحے خفگی سے اسے دیکھا، پھر مسکرا دی۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر خیر گزری، البتہ ارمان نے اپنے معنی خیز اشاروں سے اس کا ناطقہ بند کیے رکھا، بار بار اشاروں میں پوچھتا، بول دوں؟ کہہ دوں؟ اور وہ چڑ جاتی کبھی ڈر جاتی، حسب معمول اپنی سالگرہ کا کیک اس نے خود ہی بنایا تھا، مصالحے دار بریانی اور میٹھے میں کھیر بھی۔

بڑی امی، چھوٹی تائی امی اور چچی سب ہی اس کے ہاتھ کے ذائقے کے معترف تھے، مہینے کی آخری سالگرہ خوشگوار ماحول میں تقریباً اختتام پذیر ہوچکی تھی، نم اور کومل سب لوگوں کو ان کی پسند سے سبز اور دودھ الائچی والی چائے پیش کررہی تھیں، جب بالکل اچانک، ہاں ایکدم سے ہی، ایک ایسی بات ہوئی کہ لمحہ بھر کے لئے تو سب ہی سکتے میں رہ گئے اور پھر پورے لاؤنج ہلچل سی مچ گئی۔

شاہان آفریدی بنا کسی پیشگی اطلاع کے اچانک واپس آئے تھے، یہاں تک کہ لاؤنج کے بیرونی دروازے پہ پہنچنے تک کسی کو ان کی آمد کی خبر نہیں تھی۔

ارمان اپنے ڈیجیٹل کیمرے میں کھٹا کھٹ بڑوں سے چوری چوری ارمین کی تصویریں لے رہا تھا، اسے بھی ارمان کی حرکت کا پتہ تھا، جبھی طرح طرح کے پوز دے رہی تھی، کبھی اسے گھور کر دیکھتی، تو کبھی ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھ لیتی، کبھی ایک انداز دلربائی سے مسکراتی اور کبھی سب کی نظر بچا کر اسے تھپڑ کا اشارہ کرتی۔

اور عین اس وقت جب وہ ارمان کے ایک خاموش التجا بھرے اشارے پر، اسے آنکھوں میں خمار بھر کے دیکھ رہی تھی، اس کا کیمرہ فل فوکسڈ تھا، کمل چھوٹے ابو کی موٹی بالائی والی دودھ پتی پکڑا رہی تھی، جب لاؤنج میں آواز گونجی۔

''السلام علیکم!''

ارمان کے ہاتھ میں پکڑا کیمرہ ہل گیا اور اچھی خاصی تصویر آڑھی ٹیڑھی، دھندلی ہوگئی، کومل کے ہاتھ میں پکڑے لبا لب بھرے کپ سے چائے چھلک کر چھوٹے ابو کے کپڑوں پر جا گری اور ارمین جو گردوپیش سے بے خبر سی ہو رہی تھی، ہڑبڑا گئی۔

سب کی نظریں بیک وقت بے یقینی سے لاؤنج کے دروازے کی سمت اٹھیں، ارمان کو اپنی تصویر اور چھوٹے ابو کو کپڑوں پر لگے داغ کا غم بھول گیا، لاؤنج میں لحہ بھر کے لئے ایسی خاموشی چھائی جیسے وہاں صرف ٹی وی رکھا تھا اور وہی بج رہا تھا، اگلے ہی لمحے لاؤنج آوازوں سے بھر گیا، خوشی، شور، ہنگامہ، حیرت، پھر خوشی، خوشی..... خوشی اور بس.....خوشی۔

شاہان مسکراتے ہوئے ایک ایک کر کے سب سے ملتے رہے، پھر کھانے اور چائے کا دور دوبارہ چلا، وہ چونکہ اسلام آباد سے آئے تھے اور امریکہ سے اسلام آباد ایک دن پہلے ہی لینڈ کر چکے تھے، اس لئے اب کوئی ان کی تھکاوٹ کا خیال کرنے والا بھی نہیں تھا، سب یوں باتیں کرنے اور بولنے میں لگے تھے، جیسے ان کو صبح ہی واپس چلے جانا ہے۔

''ارے بھئی کیا ساری باتیں آج رات میں ہی ختم کرنی ہیں، اب اسے آرام کر لینے دو، پھر باقی باتیں آرام سے کر لینا۔''

بالآخر بڑے ابو کو ہی شاہان کی بادامی آنکھوں میں سرخی کے دھاگے دکھائی دیئے اور شاہان سب کو شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو ذہن کے پردے پر گھنٹوں سے لہراتی ایک مبہم شبیہ ایک دم واضح ہوگئی۔

خمار آلود نگاہوں سے گلابی لبوں پر مسکراہٹ آجاتی وشبیہ کسی اور کی نہیں ارمین کی ہی تھی۔

وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے لاؤنج میں بیٹھے تھے، بھانت بھانت آوازیں، جدا جدا لہجے اور رنگ رنگ باتیں، تبصرے، چٹکلے، سوال جواب، مگر انہیں چنداں حیرت نہ تھی کہ اتنی..... ی ی..... دیر تک مسلسل بولنے اور سننے کے باوجود ان کا ذہن اسی ایک منظر پر اٹک گیا تھا، جو انہوں نے لاؤنج میں داخل ہو کر سلام کرتے وقت محض اتفاقیہ دیکھا تھا، لب جیسے گلابی مسکراہٹ اور نگاہیں جیسے ایک بہکی شرارت۔

☆☆☆

رات کو چونکہ دیر سے سوئے تھے اس لئے صبح اٹھے بھی دیر سے، صرف ریحان چونکہ ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہے تھے، اس لئے صبح صبح جا چکے تھے، باقی سب ہی دھیرے دھیرے ناشتہ کر کے کام پر روانہ ہوئے۔

بڑے ابو، پھر چھوٹے ابو، چاچو کی ایک قریبی مارکیٹ میں گارمنٹس کی دوکان تھیں، وہ کھلتی ہی ذرا دیر سے تھی، اس لئے گھر کی خواتین کچن میں اور لڑکے ڈائننگ ٹیبل پر تھے، کومل اور کومل کا ایک پیر کچن میں اور ایک ڈائننگ ٹیبل کے پاس، مشترکہ لاؤنج اور ڈائننگ روم میں جیسے ایک غدر سا مچا ہوا تھا۔

''ارے بھئی ہری مرچیں تو ڈلواؤ۔'' شور مچا مچا کر اپنے لئے خاص طور پر بنوائے گئے آملیٹ کو ارمان نے فی الفور مسترد کر دیا۔

''یہ..... یہ میری چائے اتنی پھیکی کہ.....مہ..... مل۔'' حاتم حلق پھاڑ کر چلایا تو اس نے چینی کا ڈبہ لا کر ٹیبل پر پٹخ دیا۔

''لو پورا ڈبہ انڈیل لو کھا کھا کر ہاتھی بنتے جا رہے ہو لیکن.....'' اس کی بات مکمل نہیں ہو سکی،

کچن سے آواز پڑ رہی تھی، وہ پیر پٹختی واپس ہوئی۔

شاہان اس پورے شور شرابے میں خاموشی سے سامنے رکھی چیزوں سے انصاف کر رہے تھے، انہوں نے ایک بار بھی کسی ایک چیز کے لئے بھی آواز نہیں لگائی تھی، بلکہ انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر ہاتھ سے ذرا دور رکھی چیزیں بھی کسی سے مانگنے کے بجائے حق المقدور خود ہی اٹھانے کی کوشش کی تھی، شور مچانے کے لئے جاثم، ارمان اور چھوٹے چچا کا صائم ہی کافی تھا، چھوٹی شزا، کی پٹ پٹ بھی اسی ہاؤ ہو میں جاری تھی اور شاہان حقیقتاً اس رونق کو خاموشی سے انجوائے کر رہے تھے، وہ اتنے سالوں سے اپنوں سے دور دیار غیر میں تنہا رہ رہے تھے کہ اتنے شور شرابے اور اپنوں کی نوک جھونک کے لئے ترس سے گئے تھے، اب یہی صورت حال جس سے الجھ کر نمل اور کومل روہانسی سی ہو گئی تھیں، ان کی طبیعت پر ایک عجیب سی خوشگواریت پھیلا دی تھی، وہ لبوں پر ایک دھیمی شرارتی مسکان لئے ارمان اور جاثم کو اپنی بہنوں کو زچ کرتا دیکھ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ان کا ناشتہ ختم ہوا اور ارمان جاثم اور صائم کو ٹیبل سے اٹھتے دیکھ کر کومل اور نمل نے جلدی سے پلیٹیں کچن میں ڈال کر اپنے لئے کرسیاں سنبھالیں، جبھی ٹیبل سے اٹھتے اٹھتے ارمان کو کچھ خیال آیا۔

''ارے ارمی...... ی...... ین۔'' اس نے زوردار آواز لگائی، نمل نے ''سی'' کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

''خود ٹھونسنے بیٹھ گئیں اور اس بے چاری کا کچھ خیال نہیں۔''

''وہ بے چاری ہم سے اور تم سے بھی پہلے اکیلے ہی ناشتہ ٹھونس چکی ہے، وہیں کچن میں، سلیب پر اس کا چائے کا خالی کپ اور آدھا بچا کھچا پراٹھا پڑا ہے۔''

''ہیں مجھ سے بھی پہلے۔'' ارمان مصنوعی حیرت سے چلایا۔

''جی...... بتایا ناں، سب سے پہلے، یقین نہیں تو جا کے کچن میں دیکھ لو، بلکہ اس کے کپ میں بچی ہوئی چائے پی لو، پراٹھا اٹھا کر آنکھوں سے لگاؤ اور ثواب دارین حاصل کرو اور جاؤ۔''

کومل اپنے تبصرے سمیت کھی کھی کرنے لگی، نمل نے بھی اس کا ساتھ دیا، مگر شاہان کو اتنے خوش خیال منظر کے سارے رنگ سیاہ و سفید میں ڈھلتے ہوئے لگے، فقط چند لمحوں کی بات تو تھی، بس...... انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا، بلکہ چائے کا کپ بھی پرے کھسکا دیا اور سادہ پانی گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے لگے۔

''یعنی وہ یہاں ڈائننگ ٹیبل پر نہیں آئے گی۔'' انہیں خود پر شدید قسم کی جھنجھلاہٹ حملہ آور ہوتی محسوس ہوئی۔

''کیا ہو گیا ہے ایسا بھی۔'' وہ خود بھی اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

بہت ہی ناسمجھی کی عمر میں وہ اسے چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے اس کے بعد جب بھی آئے مختصر مدت کے لئے۔

ایک آدھ دفعہ تو وہ اپنے ننھیال میں تھی، سو ملاقات ہی نہ ہوئی، اس کے علاوہ بھی جب وہ آئے تو گھومنے پھرنے، سیر و تفریح اور بھولے بسرے رشتے داروں سے ملنے میں وقت کہاں نکل جاتا تھا، وہ رک کر سوچ بھی نہ پاتے تھے اور روانگی کا وقت آ جاتا تھا۔

''اگلی بار آؤں گا تو واپس نہیں جاؤں گا۔'' بڑی امی کی آنسو بھری آنکھوں نے ارادے

تو بہت بندھوائے، مگر ہر بار وہ واپس جا کر اپنی مصروفیات میں ایسے الجھے کہ پاکستان مستقل واپسی کا خیال سرے سے آیا ہی نہیں اور آیا بھی تو امریکہ میں پھیلی ان کی مصروفیات کو سمیٹ کر ہمیشہ کے لئے پاکستان منتقل ہونے کا خیال ایک نرا جھنجھٹ ہی لگا تھا، مگر اب...... آج...... اس وقت انہوں نے سنا ہی نہ تھا کومل ارمان سے کیا کہہ رہی تھی اور کیوں۔

انہیں اتنا خیال ہی کہاں تھا، وہ تو ایک الگ ہی جہان میں تھے، ایک انوکھے خواب کے یقین میں، ایک بہت ہی گدگداتی ہوئی سی خواہش کے زیر اثر اجالوں میں کہکشاؤں میں محو سفر۔

''شاید...... شاید میں اس بار اکیلے واپس نہیں جا سکوں گا۔''

انہوں نے اپنے دل کی کسی ضد کی انگلی پکڑ کر سرنڈر کیا، اسی پل ارمین نے ڈائننگ روم میں قدم رکھا، پیچھے ہی ارمان تھا، اسے دھیرے دھیرے آگے کی طرف دھکیلتا، ارمین کے چہرے پر نمی تھی، شاید اس نے کچن سے نکلنے سے پہلے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے تھے، سنہری گردن کے گرد بالوں کی لٹیں چپکی تھیں اور نازک کلائی میں کالی کانچ کی چوڑیاں پڑی تھیں۔

''شاید...... شاید...... میں اس بار واپس ہی نہیں جا سکوں گا۔'' ان کے دل نے ایک اور قلا بازی کھائی اور وہ چاروں شانے چت ہو گئے۔

☆☆☆

نمی بھرے سیلے ہوئے موسم نے کھل کر انگڑائی لی اور تین دن سے گھر کر آتی کالی گھٹاؤں نے رات کے کسی پہر اپنے بھرے ہوئے پر جھاڑ ڈالے۔

رات بھر کھل کر برسنے کے بعد صبح بھی دھیمی موسم بوندا باندی جاری تھی، جب آفس سے واپسی پر ارمان نے صحن میں بنی پانی سے بھری کیاریوں کو دیکھا، ہر سال موسم بہار کی آمد سے چند دن پہلے وہ اور ارمین مل کر ان کیاریوں میں بیلے اور گلاب لگایا کرتے تھے، اس بار شاہان کی آمد نے کچھ ارادہ کر کے لاؤنج میں داخل ہوا اور شور مچا دیا۔

''او میری نکمی، بڈھی روحوں والی بہنوں بورنگ لوگوں چلو، آؤٹنگ پر چلیں، موسم دیکھو اور اپنا یہ کمبلوں میں گھسنا دیکھو۔'' اس نے چلغوزے چھیلتی کومل کے سر پر ایک چپت رسید کر کے، کمبل میں گھسی نمل کے ہاتھ پکڑ باہر گھسیٹ لیا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ارمان کو بے نقط سناتی، مگر آؤٹنگ کے خیال سے دانت نکل آئے، اب ان کا اندر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

کومل کے سامنے دھری پلیٹ چلغوزوں اور مونگ پھلی کے چھلکوں سے بھری تھی، سر پر چپت لگنے سے تھوڑے سے چھلکے زمین پر گر گئے، کارپٹ پر پھیل گئے، اس نے غصے سے سر اٹھا کر ارمان کو گھورا، پھر چند لمحے ک بعد دانت نکوسنے لگی۔

''آئس کریم بھی کھاؤں گی۔''

''پتہ ہے مجھے مفت خوریوں...... جاتم۔'' اس نے منہ اونچا کر کے آواز لگائی۔

''شانی بھائی کہاں ہیں، جلدی بلاؤ سب کو اگر جانا ہے تو۔'' نمل باہر بھاگی، کومل جلدی جلدی بکھرے چھلکے سمیٹنے لگی، وہ لاؤنج میں داخل ہوتی چچی سے بولا۔

''پانچ منٹ میں بے بی اور صائم کو تیار کر دیں، اگر ایک بھرپور نیند لینی ہے، تو میں تھوڑی دیر کے لئے آپ کی جان چھڑانے کو تیار ہوں۔'' انہوں نے فوراً لا کر صائم اور بے بی کو لاؤنج میں پہنچا، انہیں ان دونوں سے ہی شکایت تھی کہ وہ چچی

کی نیند پوری نہیں کرنے دیتے تھے۔

کچن میں اپنے لئے کافی پھینٹتی ہوئی ارمین کو ارمان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی، ارمان کو گھر میں آئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے اور پورے گھر میں اس کی آواز زندگی بن کر جاگ اٹھی تھی، ہلچل کی طرح بچ گئی تھی، خوشبو کی طرح گھر کے کونے کونے میں پھیل رہی تھی، سوئے ہوئے ماحول میں اس نے بجلیاں بھر دی تھیں، وہ شاہان اور اپنے لئے کافی بنا رہی تھی۔

اس نے ادھوری کافی کو ایک نظر دیکھا، اب بھلا ارمان اسے کہاں اتنا ٹائم دینے والا تھا کہ وہ کافی بناتی اور موسم کا مزا لے کر پیتی، حسب توقع وہ لمحے بھر بعد اس کے سر پر کھڑا تھا۔

''تمہیں کیا الگ سے دعوت نامہ دوں۔'' وہ زور سے بولا۔

''جان من۔'' اب کے دھیرے سے بولا۔

''ارمان پاگل ہو گیا، کیسی باتیں کرتے ہو۔'' اس نے جھینپ کر گھورا۔

''بعد میں بتاؤں گا کہ میں ایسی ویسی سب باتیں کرتا ہوں۔'' اس نے ثمل کی طرح اس کی بھی کلائی کھینچی، اسی پل شاہان نے کچن میں قدم رکھا۔

''شانی بھائی ہم سب آؤٹنگ کے لئے جا رہے ہیں اور آپ، ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔'' اس نے فوراً سے بیشتر انہیں بھی مطلع کر دیا۔

''اچھا وہ، میری کافی۔'' ان کی سوالیہ نظریں ارمین پر تھیں، انہوں نے شاید ارمان کی بات ٹھیک سے سنی بھی نہیں تھی۔

''شانی بھائی سنا نہیں آپ نے کافی چھوڑیں، آئس کریم استعمال کریں۔'' اس نے فوراً ایک مشہور ایڈ کی نقل اتاری، ارمین کی ہنسی چھوٹ گئی اور شاہان کو لگا، ان کے خرد کی لگامیں بھی بس چھوٹیں کہ چھوٹیں۔

''وہ شانی بھائی، آپ بھی چلیں ناں ہمارے ساتھ باہر، میں آپ کو واپس آ کر کافی بنا دوں گی۔'' شاہان کو مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ سمجھی کہ شاید انہیں برا لگ گیا ہے، جبھی سنبھل کر صفائی دینے لگی حالانکہ سنبھلنے کی ضرورت تو شاہان کو تھی۔

''آں...... ہاں...... اوکے...... میں پانچ منٹ میں تیار ہو کے آتا ہوں۔'' وہ کچھ گڑبڑا سے گئے، پھر جلدی سے بات مکمل کر کے پلٹے، ان کے باہر نکلتے ہی ارمان نے اسے دیکھ کر کندھے اچکائے پھر، کنپٹی پر شہادت کی انگلی گھما کر ''کریک'' کا اشارہ کیا۔

''ارمان...... بری بات۔'' ارمین نے ہنستے ہوئے اسے ٹوکا اور اس نے ارمین کو باہر دھکیلا۔

''پانچ منٹ دے رہا ہوں، جسٹ فائیو۔''

☆☆☆

دروازے سے باہر نکل کر پتہ چلا کہ وہ اپنے کسی دوست سے اوپن ائیر جیپ مانگ کر لایا تھا، فٹافٹ کومل اور ثمل اوپر چڑھیں، شہزاء، جاثم اور صائم کو ارمان نے اٹھا کر پھینکا اور شاہان، جنہوں نے شاید سالوں بعد ایسی کھلی جیپ دیکھی تھی یا اس میں بیٹھنے جا رہے تھے، لڑکیوں اور ارمان کی پھرتی دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''شانی بھائی آپ یہاں کنارے پر بیٹھیے گا، بچے اوور ہو جاتے ہیں اور یہ پاگل۔'' اس نے ثمل اور کومل کی طرف اشارہ کیا، شاہان اپنی بہنوں کے بارے میں اس کے کمنٹس سن کر ہنس دیئے۔

اور عین اس وقت جب جیپ اسٹارٹ

ہونے کی گھر گھر فضا میں گونج رہی تھی، شاہان کو مستقل ہوتی کسی کمی کی چبھن نے بولنے پر مجبور کر دیا۔

''ارمین نہیں آرہی۔'' جاثم کو گھورتی کومل، جاثم خود اور شہزاء کے کپڑے جھاڑتی نمل ایکدم ہی خاموشی کی لپیٹ میں آئے، شاہان خود بھی پوچھ کر دل ہی دل میں چور سے بن گئے۔

''وہ آگئیں میڈم۔'' انہوں نے بے ساختہ ہی پلٹ کر دیکھا، لمبے سیدھے بالوں کو اس نے کندھوں پر کھلا چھوڑ رکھا تھا اور ان ہی میں کہیں سیاہ رنگوں والے چمکیلے ٹاپس بہار دکھا رہے تھے، میڈم نے آتے ہی اپنی کزنز کی طرف ایک مسکراہٹ اچھالی اور جیپ کی فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھ گئی، معمولی ہی سہی مگر یوں سنگھار کیے ہوئے انہوں نے ارمین کو پہلی بار یہی دیکھا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ اب سے پہلے انہوں نے ارمین کو کیوں نہیں دیکھا، یا شاید ٹھیک سے اب ہی دیکھا تھا شاید۔

☆☆☆

فجر سے کچھ دیر بعد کی بات تھی، جب آدھی رات تک مسلسل جاگتے رہنے کے بعد وہ بمشکل دو گھنٹے ہی سو سکے تھے اور نماز پڑھ کے سیدھا امی کے پاس جا پہنچے، بڑی امی انہیں اس وقت دیکھ کر حیران ہی ہوئیں۔

''ماشاء اللہ، کیا نماز کی پابندی کرتے ہو۔'' ان کے لہجے میں اپنی اولاد کے لئے فخر آمیز حیرت بھی تھی اور بے یقینی بھری خوشی بھی۔

''پابندی تو نہیں مگر کوشش کرتا ہوں، قضا نہ ہو۔'' وہ خواہ مخواہ میں شرمندہ سے ہو گئے۔

''چلو اب جب تک یہاں ہو تو کوشش کرو کہ پابندی سے ہی پڑھو۔'' انہوں نے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پردے سمیٹے، شاہان کی نظر کھڑکی سے باہر گئی اور انہوں نے دو چھوٹے بچوں کو وہاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا، صحن میں ایک طرف لوہے کا بڑا سا جھولا رکھا ہے، کبھی وہ بچے اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی باہر نکل کر ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے کھیلتے بھاگتے ہیں اور کبھی وہ لڑکا جو تھوڑا سمجھ دار ہے، اسے ساتھ کھیلتی بچی کو گود میں بھر کے اسے جھٹ پٹ چوم لیتا ہے۔

کتنا مانوس منظر تھا، کتنا خوش خیال اور کتنا خوش کن، انہوں نے لمحے بھر کے لئے اپنی آنکھوں کو نم ہوتا محسوس کیا، ماضی سے جڑی یادیں اگر خوشگوار ہوں تو وقت بے وقت بن بلائے مہمان کی طرح ٹپکتی تو ہیں ہی، مگر جاتے جاتے گیلی گیلی ہنسی بھی دے کر جاتی ہیں۔

''کس سوچ میں گم ہو، میں تو کہتی ہوں اب تم بھی شادی کر لو اور گھر بساؤ۔'' بڑی امی نے بیڈ پر بیٹھ کر لحاف ٹانگوں پر ڈالا، اس عمر میں موسم کی سختی تو کیا ہلکی سی گہری نظر بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

انہوں نے سر جھکا اور لحاف کے اوپر سے ہی امی کے پیر دبانے لگے۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں امی، شادی کے لئے بھلا اس سے مناسب عمر اور کیا ہوگی۔'' وہ بات کرتے ہوئے امی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنس دیئے، انہوں نے اپنی والدہ کی بات میں لفظ ''بھی'' پر غور نہیں کیا تھا۔

''اچھا، شکر ہے تمہیں بروقت عقل کی بات سوجھ گئی، ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ تمہاری شکل کے ساتھ ساتھ تمہارے سارے ارمانوں کو بھی ترس جاؤں گی۔'' وہ لمحہ بھر میں روہانسی ہو گئیں۔

''اوہو، اب دل چھوٹا کیوں کر رہی ہیں، اب تو میں تیار ہوں ناں۔''

''اچھا چلو، اب لڑکی کا بھی بتا دو، امریکہ میں ہے کیا، ایک بات سن لو، میں کسی فرنگن میم کو اپنی بہو نہیں بناؤں گی۔'' ان کے اندر کی روایتی مشرقی عورت اچانک ہی جنم لے کر بولی، شاہان ہنس دیئے۔

''لڑکی امریکن نہیں، پاکستانی ہے اور خالص گھریلو بلکہ گھر کی بے حد قریب ترین ہے۔'' ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ارمین چائے کے کپ سمیت اندر داخل ہوئی، لبوں پر شرارتی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ اس نے شاہان کی بات نہ صرف سن لی ہے، بلکہ وہ گفتگو کا ماخذ بھی سمجھ چکی ہے۔

شاہان نے ایک اچٹتی محظوظ سی نظر اس کے سادہ و خوبصورت چہرے پر ڈالی، اپنے جذبات کے اظہار کا اس سے موثر، بہتر اور جامع، مکمل اور بھرپور موقع پھر کہاں مل سکتا تھا۔

''تو پھر جلدی سے بتا دو لڑکی کا نام۔'' بڑی امی منتظر تھیں اور ارمین بھی، مگر اس نے نامحسوس طریقے سے بڑی امی کی تسبیح کو اپنی انگلیوں پر لپیٹا تھا۔

''اس لڑکی کا نام ہے...... ارمین منہاج آفریدی۔'' اس کی انگلیوں پر لپٹی تسبیح بالکل اچانک ٹوٹی اور کمرے کے چکنے فرش پر سنہری سبز دانے بکھرتے چلے گئے، جانے تسبیح کا دھاگہ کمزور تھا یا اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

☆☆☆

کھچ کھچ کھچ...... کھچا کھچ۔

وہ بے دردی سے کیاریوں کی مٹی کو کھود رہا تھا، نم اور گیلی نرم مٹی الٹ پلٹ ہوتی اس کی ستم روی کا شکار تھی، ماتھے پر شکنیں، سکڑے ہوئے ہونٹ اور تپتی ہوئی سرخ آنکھیں۔

مسلسل تین دن سے اس کے منہ پر یہی تاثر سجا تھا اور رویہ...... بے حد دھیمی اور سرد یا پھر بے حد بلند چنگھاڑتی غصیلی آواز...... بدتمیز لہجہ بے مروت الفاظ اور بدلحاظ انداز۔

کمرے کی ڈریسنگ پر بچی بیشتر پرفیوم کی بوتلیں چکنا چور ہو چکی تھیں، نہ لیمپ جلنے کے قابل رہا تھا، نہ موبائل بجنے کے لائق بچا تھا۔

''تم نے...... تم نے منع کیا تھا مجھے ارمین! تم نے روکا تھا مجھے کیوں...... کیوں، اس دن کا انتظار تھا تمہیں؟ یا اس شخص کا انتظار تھا تمہیں بولو، اب خوش ہو بولو۔''

ارمان کے بیڈروم کے لاکڈ دروازے کے باہر گھر کی خواتین کا ہجوم تھا اور اندر سے برآمد ہوتی ارمان کی آواز...... بڑی امی کے دل بیٹھا جا رہا تھا، چھوٹی امی ہول رہی تھیں، ارمین کی امی جو گھر بھر کی ''اچھی امی'' تھیں، مسلسل قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھیں، چچی نمل اور کول کے آنسو زارو قطار بہہ رہے تھے اور اندر ارمین کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔

وہ اپنی صفائی میں کیا کہتی، کوئی بات تھی ہی نہیں، کوئی وجہ نہیں تھی، اس لئے کوئی عذر بھی نہ تھا، کوئی غلطی نہیں، ہاں مگر معذرت۔

''بولو ناں اب خاموش کیوں ہو، اب تو تمہیں دلی سکون مل گیا ہوگا، ہو گئے گھر بھر میں چرچے، آ گئے تمہارے شانی بھائی، جنہیں بھائی بھائی بولتے تم جوان ہوئیں، وہی تمہارے امید وار بن کر آ گئے ارمین...... ارمین۔'' وہ غصے کی شدت سے ادھ موا ہوا جاتا تھا، گردن کی رگیں پھول کر پھٹ پڑنے والی تھیں اور لال بھبھوکا چہرے پر کہیں اس نرمی کا شائبہ نہ تھا جو صرف اور صرف ارمین کے لئے ہوئی تھی۔

''میری کوئی غلطی نہیں ارمان، پھر بھی اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تو مجھے معاف کر

دو پلیز۔'' ہچکیاں لیتے وجود سے آواز نکالنا مشکل تھا، مگر وہ ارمان کے لئے ہر مشکل جھیلنے کو تیار تھی، وہ اس کی محبت کے لئے اپنی انا پر پیر رکھ سکتی تھی، اپنی ''میں'' کو پس پشت ڈال سکتی تھی اور ڈال رہی تھی، کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے خود کو قصوروار ٹھہرا کر اس سے معافی مانگ رہی تھی، اسے اپنی محبت سے زیادہ ارمان کو پہنچنے والی تکلیف سے زیادہ دروازے کے باہر کھڑی اپنی ماں کی فکر تھی، باہر کھڑی سب ہی عورتیں اس کی مائیں تھیں یا اس کی بہنیں، ارمان کا رویہ انہیں کتنا ہرٹ کر رہا تھا، وہ نہیں سمجھ سکتا تھا، وہ بس غصہ کرتا تھا یا فیصلہ، فرد جرم تو آج پہلی بار عائد کر رہا تھا اور آج پہلی بار ہی کوئی رعایت کرنے کو تیار نہ تھا۔

کھٹاک چٹخنی گری، کھڑچ سے لاک گھوما اور وہ تن فن کرتا سامنے نمودار ہوا باہر کھڑی سب ہی خواتین ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں اور وہ بنا کسی کی طرف دیکھے سیدھا باہر نکلتا چلا گیا۔

بڑی امی جو اتنی دیر سے سوچ رہی تھیں کہ موقع ملتے ہی اپنی محبت بھری تسلی سے اسے شانت کریں گی، کچھ بھی نہ بول سکیں، چھوٹی امی نے بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کر دل تھام لیا اور اچھی امی اس سے سوال بھی نہ کر سکیں کہ آخر میری بیٹی نے کیا کیا تھا، جو تم اسے رسوا کرنے پر تل گئے، تم سے محبت؟ ایک لڑکی کے لئے کسی نے دست سوال دراز کر دیا، تو اس میں عجیب کیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں حق کس نے دیا کہ تم اسے یوں سوال جواب کے کٹہرے میں گھسیٹو اور وہ بھی بند کمرے کے اندر؟

نمل اور کومل تو ویسے بھی اس کے غصے سے ڈرتی تھیں، کوئی اور مرد فی الحال گھر میں موجود نہ تھا اور چاہتی تو چچی بھی تھیں کہ اپنے پیارے بھتیجے کو روکیں، سمجھائیں مگر اس وقت اسے یوں طوفان بلا خیز کی طرح باہر جاتے دیکھ کر چلا اٹھیں۔

''ارے کومل جا دیکھ بائیک لے کر نہ نکل جائے کہیں۔'' کومل آنسو صاف کرتی باہر بھاگی تھی، وہ مسلسل آوازیں دے رہی تھی۔

''ارمان! رکو۔''

''ارمان!'' خیالات کا تسلسل گزشتہ سے ٹوٹ کر اس کے نام کی پکار کے ساتھ ہی حال سے جڑ گیا، اس کا ہاتھ لمحہ بھر کو رکا اور پھر چلنے لگا، کوئی بہت خاموشی سے بہت آہستگی اور دھیرج سے اس کے برابر میں آ کر بیٹھا۔

''کب تک ناراض رہو گے ارمان، تم کو کیا ہو گیا ہے، تم ایسے تو نہیں ہو۔'' وہ ایک طنز بھرا ہنکارا لے کر رہ گیا۔

''بولو ناں ارمان، تم تو میرے اوپر کبھی غصہ نہیں کرتے تھے، میری غلطیوں پر بھی نہیں، پھر اب ایسا کیا ہو گیا، کیوں کر رہے ہو ایسا؟'' اس نے جواب نہیں دیا، ارمین نے گہری سانس لی، پھر کیاری سے باہر آ جانے والی مٹی کو واپس کیاری میں ڈالنے لگی۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو میری اور تمہاری مرضی کے بغیر گھر میں کوئی کچھ نہیں کرے گا، پھر اتنا غصہ کیوں، مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تمہارا یہ انداز۔'' اس کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔

''میں تو ایسا ہی ہوں اور یہی میرا انداز ہے اور رہے گا۔'' کافی دیر بعد اس کے لبوں سے نکلا۔

''اگر آپ کو پسند نہیں تو جو پسند ہو شوق سے اس کے ساتھ چلی جائیں۔''

اپنے تئیں اس نے ایسی بات کی تھی کہ ارمین کو شدید غصہ آتا، مگر اس کے بجائے وہ دبی

دبی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلانے لگی۔

''تو ٹھیک ہے، میں چھوٹی امی اور امی سے کہہ دیتی ہوں کہ کوئی بات بڑے ابو لوگ سے کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ارمان نے منع کر دیا ہے۔'' اس نے فراٹے سے جھوٹ بولا۔

وہ اب بھی کیاری کے کنارے والی زمین پر گری مٹی، اپنی ہتھیلی سے اندر ڈال رہی تھی، ارمان اس کی بات سن کر خاموش سا بیٹھا رہ گیا اور جب ارمین اپنے ہاتھ سے مٹی کیاری میں گراتی ہاتھ کھسکا کر اس کے ساتھ لے گئی، تو اس نے ہاتھ تھام لیا۔

''مت کرو، ہاتھ گندے ہو رہے ہیں تمہارے، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔''

☆☆☆

''امی کوئی چولہا خالی ہے کیا؟'' وہ تیزی سے بولتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی تھی۔

''کیوں؟'' امی خواہ مخواہ میں ذرا تیکھی سی ہوگئیں۔

''وہ بڑی امی اور چھوٹی امی کے لئے چائے بنانی ہے۔''

''رہنے دو تم...... اس گھر میں اور بھی تو لڑکیاں ہیں، تمہیں تو سب نے اپنا نوکر ہی سمجھ لیا ہے۔'' وہ تنی سے بولیں۔

''امی...... کیا ہو گیا ہے آپ کو آج، کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' وہ حیران رہ گئی۔

''اور نہیں تو کیا۔'' وہ تیزی سے پلٹیں، مگر دروازے سے اندر آتی چھوٹی امی کو دیکھ کر خاموش ہوگئیں، البتہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا میں ضرور۔

''جو بات کہنی ہے صاف کہو زبیدہ، آخر تم اتنی اکھڑی ہوئی کیوں ہو۔'' چھوٹی امی کا لہجہ خراب نہیں تو بہت اچھا بھی نہیں تھا۔

''صاف کہوں گی تو سب کو بہت برا لگ جائے گا بھابھی، اس لئے رہنے ہی دیں۔''

''نہیں کہو تم...... جو کہنا ہے کہہ ڈالو، ہم جو بیٹھے ہیں سننے کے یہاں...... جس کے جو دل میں آئے کرتا ہے اور کہتا ہے، تو تم کیوں نہیں۔''

''میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کچھ کہا ہے جو آپ مجھے باتیں سنانے لگیں۔''

''اسی لئے تو کہہ رہی ہوں، کہ جو دل میں ہے سنا ڈالو، ایسا نہ ہو کہ دل میں کوئی ارمان دبا رہ جائے، پہلے ہی تمہاری بیٹی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

''میری بیٹی نے۔'' وہ حیرت سے پلٹیں اور پھر واپس مڑ کر گرم چمٹا ہاٹ پاٹ کے اوپر پنخ دیا۔

''میری بیٹی نے کیا کیا ہے بھلا، تماشا تو آپ کے بیٹے نے شروع کیا ہے، اچھی خاصی معمولی بات کو اس قدر بڑھا چڑھا دیا، ہوا بنا دیا، ارمین کو قصوروار ٹھہرایا وہ الگ میں پوچھتی ہوں، کیا کیا ہے اس نے ایسا، اگر شاہان نے اس کا نام لے بھی لیا تو کون سی قیامت آگئی تھی، جو اس نے ہنگامہ مچا دیا، آج اگر میری بیٹی کے سر پر بھی باپ کا سایہ ہوتا تو......'' وہ بات مکمل نہیں کرسکیں، ارمین جلدی سے آگے بڑھی تاکہ انہیں چپ کروا سکے، چھوٹی امی چند لمحے وہیں کھڑی رہیں، پھر دھیرے سے ان کے نزدیک آئیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو زبیدہ، میں ہی غلط تھی، غلطی تو ارمان کی ہے، مگر پتہ نہیں میں تم سے کیوں یہ سب کہنے لگی، شاید اس دن غصے میں ارمان کو گھر سے نکلتے دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا، تم ارمان کو معاف کر دو اور مجھے بھی، میں جانتی ہوں تمہارا دل دکھا ہے، ارمین میری بھی بیٹی ہے، صرف تمہاری نہیں۔'' امی نے دوپٹے سے آنسو

پوچھے۔

''آپ کا بڑا پن ہے بھابھی، ورنہ آج کل اتنا احساس کون کرتا ہے۔''

''کوئی کرے نہ کرے ہم تو کریں گے احساس اور آج ہی ارمین کے چھوٹے ابو سے بات بھی۔'' انہوں نے ارمین کے سر پر ہاتھ پھیر کر امی کو گلے سے لگا لیا، ارمین نے سوچا، یہی محبت اس گھر کے لوگوں کو جوڑے ہوئے ہے ورنہ۔

☆☆☆

وہ مبارک دن آن پہنچا تھا، جس کا سب سے زیادہ انتظار ارمان کے سوا اور کس کو ہو سکتا تھا، اتنی کم عمر میں جب کہ وہ ٹھیک سے کمانے بھی نہیں لگا تھا، صبح کی پارٹ ٹائم جاب تھی، یا اپنے ابا کی اسٹیٹ ایجنسی، ابا کی خواہش پر ابھی اسے ایم بی اے میں ایڈمیشن بھی لینا تھا، یعنی ادھوری تعلیم سمیت، وہ دولہا بن چکا تھا۔

زندگی کی پلاننگ سب سے اونچی سیڑھی پر اس نے سب سے پہلے چھلانگ لگا لی تھی اور تعلیم اور روزگار جیسے اہم زینے، نیچے رہ گئے تھے، اس کے دانت مستقل بنیادوں پر کچھ اس طرح باہر نکل آئے تھے کہ گھر کی بزرگ خواتین تو ایک طرف، مردوں کے سامنے بھی لاکھ کوشش کے باوجود اندر نہیں جا پا رہے تھے، کمل اور کومل نے ریحان کے ساتھ مل کر اسے چہرے سے جھلکتی، چھپائے نہ چھپتی، روکے نہ رکتی اور سنبھالے نہ سنبھلتی قسم کی خوشی پر اس کا خوب ریکارڈ بجایا تھا، مگر اسے کب کسی کی پرواہ تھی۔

اسے اگر پرواہ تھی، تو صرف ارمین کی، جو اس کے دل کی سرزمین پر کھلنے والا پہلا گلاب اور جاگتی آنکھوں میں سجنے والا پہلا خواب تھی، وہ اس کی بچپن کی محبت نہیں تھی، وہ اس کی امنگوں بھرے جوان دل کی آرزو تھی اور سالوں محبت، محبت کا راگ الاپتے ارمین نامی وجود اس کی رگوں میں یوں خون بن کر دوڑنے لگا تھا، کہ جب شاہان نے ارمین کا نام لیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ارمین کے لئے صرف جان دے ہی نہیں سکتا بلکہ لے بھی سکتا ہے، بات ہی ایسی تھی اور موقع ہی ایسا تھا، جب دو دن فقط دو دن باقی تھے، چھوٹے ابو کی طرف سے باقاعدہ پورے گھر والوں کے سامنے بات نہیں آئی تھی، جبھی شاہان بھی ناواقف تھے تبھی تو ٹیرس پر سفید چوڑی دار پاجامے اور فراک میں ملبوس ارمین کو دیکھ کر ایکدم بول اٹھے۔

''سفید لباس مت پہنا کرو ارمین۔'' وہ ان کی آمد سے بے خبر تھی، چونک کر پلٹی اور خفیف سی ہو گئی۔

''جج...... جی...... لیکن...... کیوں۔'' وہ چند دن پہلے والی بات سے بہت ڈر گئی تھی، شاہان کے سامنے بھی کم جاتی اور بات تو بالکل نہیں کرتی۔

شاہان محسوس تو کرتے تھے کہ اب وہ، وہ بچپن والی ارمین نہیں جو گھر بھر میں سب سے زیادہ ان کے قریب تھی، بلکہ وہ مکمل طور پر بدل چکی تھی، سر تا پا، وہ جھجکتی تھی، شرماتی تھی اور شاید کتراتی بھی تھی، لیکن وہ ایسا کیوں کرتی تھی، یہ جاننے کی انہوں نے کوشش نہیں کی، ان کے خیال میں وہ جس عمر میں تھی اس میں لڑکیاں شرمیلی ہو ہی جاتی ہیں، انہوں نے از خود وجہ گڑھ لی تھی اور اس پر یقین بھی کر لیا تھا۔

''کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ سفید لباس میں تمہیں نظر لگ سکتی ہے اور شاید...... میری ہی نظر لگ جائے۔''

''ارمین!'' معاً اس کے نام کی پکار گونجی۔

اس کے لب کھلے تو تھے، وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تھی اور شاید وہ شاہان کو منع ہی کرنا چاہتی تھی کہ ایسی باتیں مت کیا کریں، مگر اس کے لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے، یا آواز نکلی بھی تو اتنی مدھم کہ ارمان کی آواز تلے دب گئی۔

اس نے خوف زدہ سی ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی، اسے تپ چڑھی ہوئی تھی۔

''میں...... مجھے شاید امی نے آواز دی ہے۔'' وہ جلدی سے بولی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی، شاہان ایک نظر ارمان کو دیکھ کر ٹیرس سے نیچے جھانکنے لگے۔

''آپ کچھ زیادہ ہی اسمارٹ بن رہے ہیں۔'' اس کی بات یقیناً بہت غیر متوقع تھی، شاہان ایکدم پلٹ کر تعجب سے دیکھنے لگے۔

''بہتر ہوگا کہ آئندہ آپ اسے کوئی آرڈر نہ دیں۔''

''میں نے اسے کوئی آرڈر نہیں دیا، یونہی ایک بات کی تھی اور اس سے کوئی بات کہنے کے لئے مجھے تم سے یا کسی سے بھی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔'' ارمان کا لہجہ اتنا اکھڑا تھا کہ شاہان کی آواز میں خود بخود سرد مہری جھانکنے لگی۔

''اجازت نہیں تو کم سے کم خیال ہی کر لیں۔''

''کس بات کا خیال۔'' انہوں نے جان بوجھ کر تجاہل برتا۔

''یہی کہ وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔''

انکشاف یقیناً نیا بھی تھا اور غیر متوقع بھی، یہ بات کب اور کہاں طے ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر میں کس نے انہیں بتانے کی ضرورت تک محسوس نہ کی، ایک لمحے میں کئی خیال دماغ میں چکرائے مگر، انہوں نے کسی سوچ کا عکس چہرے پر لہرانے سے پہلے ہی روک لیا۔

''اوہ رئیلی، ہونے والی ہے ناں...... ہوئی تو نہیں۔'' ان کی بات یقیناً ارمان کو تپانے کے لئے کافی تھی۔

''ہونہہ...... آپ کیا سمجھتے ہیں، آپ کی باتیں سن کر میں ڈر جاؤں گا، یا کسی عدم تحفظ کا شکار ہو جاؤں گا۔''

''نہیں تم کیوں ڈرو گے، میں جانتا ہوں، تم بہت بہادر آدمی ہو، تم ڈرنے والوں میں سے نہیں اور تم ڈر بھی نہیں رہے، لیکن تم اس طرح کی باتوں اور حرکتوں سے ارمین کو سب کی نظروں میں ہلکا ضرور کر رہے ہو۔'' شاہان بہت پرسکون تھے، جبکہ وہ اتنا ہی مضطرب ہو گیا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے۔''

''مطلب یہ کہ جس سے محبت کی جاتی ہے، ان کی حفاظت کی جاتی ہے، ان کی عزت کی جاتی ہے، ڈھال بن کر انہیں دوسروں کی نظروں اور باتوں سے بچایا جاتا ہے، نا کہ دوسروں کی کرنی کا الزام ان کے سر ڈال کر انہیں ہی کٹہرے میں گھسیٹ لیا جائے۔'' وہ خفا خفا سے رخ پھیر گئے۔

''ایک عورت، مرد سے سب سے پہلی ڈیمانڈ حفاظت کی کرتی ہے اور یہ حفاظت عزت سے جڑی ہوتی ہے، محبت کا نمبر اس کے بعد آتا ہے، جو مرد عورت کی عزت نہ کر سکے اس کی حفاظت نہ کر سکے اس کی محبت، سچی بھی ہو تو خالص نہیں ہوتی اور تم...... مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے میرے بھائی، تم ارمین کو وہ تحفظ اور عزت نہیں دے رہے، جو تمہاری اور اس کی محبت کی ڈیمانڈ ہے۔'' ارمان کی نگاہوں میں کینہ توزی آسمائی۔

''اور یہ بات میں اتنے وثوق سے اس لئے کہہ رہا ہوں، کیونکہ ارمین یہاں سے تمہاری وجہ

سے چلی گئی، تمہیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی، میری بات سن کر نہیں، تمہارے چہرے کے تاثرات نے اس کا رنگ اڑا دیا، میرے الفاظ نے نہیں، میرے ایکسپریشن اسے گھبرانے والے نہیں تھے، کیونکہ اسے پتہ ہے، اس کا مسئلہ میں نہیں تم ہو اور تمہارا مسئلہ بھی میں نہیں وہی ہے، میں جو بھی کہوں یا کروں، وہ جانتی ہے سوال تم اس ہی سے کرو گے، جواب اسی سے مانگو گے اور مورد الزام بھی۔''

''کیا میں آپ کی اس بکواس کا مقصد جان سکتا ہوں۔'' ارمان نے بڑے بھائی والا سارا ادب لحاظ ایک طرف رکھ کے ان کی بات کاٹی، وہ چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئے، پھر بولے۔

''جو شخص ایک عورت سے طوفانی محبت کا دعوا کرے اور پھر اپنی محبت کا مقصد نہ جان پائے، وہ بھلا میری بکواس کا مقصد کیسے جان سکتا ہے۔'' ارمان کے پورے وجود میں شرارے ناچنے لگے۔

اس وقت اسے پہلی بار محسوس ہوا، وہ ارمین کی محبت میں، کسی کی جان لے بھی سکتا ہے، جیسے اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سامنے کھڑے شخص کی جان لے لے، جس کے انداز کہہ رہے تھے، کہ وہ اور ارمان ایک ہی راہ کے مسافر ہیں۔

☆☆☆

فلاور ہاؤس میں ایک طوفان امڈ آیا تھا، مگر یہ طوفان کوئی تباہی بربادی نہیں بلکہ فلاور ہاؤس کے دو خوبصورت فلاورز کی شادی خانہ آبادی کے نتیجے میں آنے والا طوفان تھا، اس طوفان میں قہقہے تھے، خوشیاں تھیں، رنگ تھے، خوشبوئیں تھیں، چاہتیں آرزوئیں تھیں، اس طوفان میں ایک مان تھا، ایک احترام تھا ایک تقدس تھا اور ایک ارمان تھا اور ایک ارمین تھی اور......اور......

اور ایک وہ تھے، شاہان آفریدی، جنہوں نے تقریب میں شرکت سے معذرت کر لی تھی، کیونکہ بقول خود ان کے وہ اس دن اپنے ایک بہت پرانے دوست سے ملاقات کا وعدہ کر بیٹھے تھے اور وہ خود کو وعدہ فراموش نہیں کہلوانا چاہتے تھے، یہ بھی انہوں نے خود ہی کہا تھا، یا شاید ارمان کو جتایا تھا۔

بڑی امی چاہتی تھیں کہ وہ ارمان سے اس نکاح میں شرکت کے لئے اصرار نہ بھی کرے، مگر کم سے کم ایک بار خود سے انہیں انوائیٹ ضرور کرے، بڑا بھائی سمجھ کر اور گھر کا ایسا فرد مان کر جو برس ہا برس دیار غیر کی خشک فضا میں رہ رہ کر اپنوں کی محبتوں کو ترس گیا تھا، مگر دوسری طرف ارمان تھا، جو دل سے چاہتا تھا کہ شاہان اس تقریب میں شرکت نہ کریں تو، اس سے بہتر سچویشن کوئی ہو بھی نہیں سکتی، چھوٹی امی نے تو اپنے منہ تک سے کہہ ڈالا۔

''ایک بار بول دینے میں کوئی حرج تو نہیں، تم کہو کہ ان کی موجودگی نے اس گھر کی خوشی کو دوبالا کر دیا ہے، بچہ کسی بھی موقع پر تو شامل نہیں ہو پاتا تھا، تم کہو گے تو اس کا مان بڑھ جائے گا۔''

چھوٹی امی کے لہجے میں بھی تو ایک مان تھا اور ارمان چپ رہا، بلکہ آخر وقت تک، اس نے شاہان کو عزت تو کیا دینی تھی، اپنی ماں اور ماؤں کی طرح چاہنے والی تائی کا مان بھی خاک میں ملا دیا، اس نے ایک بار بھی جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر شاہان کو ضرورت کیا تھی، اسی دن اپنے دوست سے ملنے جانے کی، اس نے تو شاہان کے نام بھی اپنے لبوں پر حرام کر لیا، کجا کہ ان کو روکنا اور ان کے شرکت نہ کرنے پر فکر مند ہونا۔

چھوٹی امی تو بیٹے کے جذبات سمجھ رہی تھیں، اس لئے ایک ہی بار کہہ کر چپ ہو رہیں، مبادا وہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے، وہ ایسا ہی تو تھا، جلد باز اور غصہ ور...... مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ بڑی امی بھی صرف بیٹے کے ہی جذبات سمجھ رہی تھیں، بھتیجے کے بھی سمجھ لیتیں تو۔

بہر حال اپنے اپنے دلوں میں کہیں خفگی کے خار اور کہیں ندامت کی نمی لئے اس دن کا سورج طلوع بھی ہوا اور غروب بھی اور عین ایجاب و قبول کے مراحل کے وقت شاہان واپس گھر لوٹ آئے، ارمین کی رضامندی لی جا رہی تھی، اس کے گلے میں جانے کیوں آنسوؤں کا گولہ اٹک کر آواز کی راہ کھوٹی کر رہا تھا، نکاح خواں اس کی ہاں کے منتظر تھے، دائیں ہاتھ امی اور بائیں ہاتھ چچی بیٹھی اس کا ہاتھ تھام کر ہولے ہولے سہلا رہی تھیں۔

ذرا دور صوفے پر ارمان، چھوٹے ابو، بڑے ابو اور چچا کی معیت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور زندگی کے اس اہم فیصلے اور اہم ترین موڑ پر جب وہ عملی زندگی کی طرف قدم بڑھانے والی تھی، اسے بالکل اچانک ایک دم ہی اپنے ابو کی یاد آئی۔

اس کا بچپن ان ہی دو لوگوں کے سنگ ہنستے کھیلتے گزرا تھا، پھر ایک کے بعد ایک کر کے دونوں نے ہی اسے اپنے سے دور کیا تھا، ابو کی شبیہ بہت دھندلی تھی، مگر یاد اچھی طرح تھی، وہ کس طرح اسے گود میں اٹھاتے تھے، کبھی ہوا میں اچھالتے تھے اور کبھی...... ٹپ ٹپ کر کے کتنے ہی موتی آنکھوں سے ٹپک گئے، ابو تو آ نہیں سکتے تھے مگر...... وہ تو آ سکتے تھے، جنہوں نے ابو کے بعد انہیں اپنے سب سے قریب رکھا، انہیں چاہت دی، اہمیت دی اور جب تک پاس رہے۔

''ارمین بیٹا بولو! بولو قبول ہے۔'' امی کی آواز رندھی ہوئی تھی اور ارمین کے دھیان کی ڈوری کہیں اور کسی اور شخص کے خیال میں الجھ کر الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔

''اتنے سالوں بعد اتنے اہم موقع پر، میرے خیال سے ہی، سہی آپ کو یہاں ہونا چاہیے تھا شانی۔'' اس کے دل سے آواز نکلی، اس نے شکایتی نگاہوں سے بالکل سامنے لاؤنج کے خالی دروازے پر ڈالی مگر...... یہ کیا...... وہ دروازہ خالی نہیں تھا، وہاں کوئی کھڑا تھا۔

''شانی بھائی...... شاہان۔'' قبول ہے کے بجائے اس کے لبوں سے نکلا اور سب چونک گئے سب خوش ہو گئے لیکن ارمان نہیں، اس کے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

لمحے بھر میں لاؤنج کے منظر صرف اس شخص کی آمد کی وجہ سے بدل گیا، ارمین بے ساختہ کھڑی ہو گئی، پھر باقی لوگ بھی، وہ بالکل دھیرے سے سلام کرتے آگے بڑھے۔

ارمین کے آنسو زار و قطار بہنے لگے، انہوں نے پاس آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، چچی نے جگہ خالی کر دی خود بخود، آنٹو ہٹکی ان کو ارمین کے برابر میں جگہ دے دی گئی، انہوں نے برابر میں بیٹھتے ہو بالکل سیدھی ایک نظر ارمان پر ڈالی۔

وہ ایک نظر بالکل سادہ اور سپاٹ تھی، اس میں نہ کوئی جتاتا ہوا تاثر تھا نہ جلاتا ہوا، پھر بھی ارمان کا روم روم جل اٹھا، اس کا موڈ ایک پل میں غارت ہو گیا، ارمین پر بلاوجہ غصہ آنے لگا اور چہرے پر تناؤ کا خول چڑھ گیا۔

شاہان کی آمد بے وقت تھی یا بر وقت، ارمان کو آگ ضرور لگا گئی تھی اور اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا ایک ہی طریقہ فی الحال اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

بے حد سنجیدگی سے نکاح نامہ پر دستخط کرنے کے بعد، اس نے مبارک سلامت کا شور بھی نہ مچنے دیا اور سب لوگوں کو گیدڑ سنگھی سنگھا دی تھی۔

''ابو میں چاہتا ہوں ارمین کی رخصتی بھی آج ہی ہو جائے۔''

☆☆☆

''خاندان والے میری بچی کے کردار پر باتیں بنائیں گے بھائی صاحب۔'' مباحثے، دلائل، تکرار، تلخی، ترشی، سب ہی تذکروں کے بعد زبیدہ امی کے منہ سے نکلنے والی بات نے سب کو خاموش کرایا تھا، یہاں تک کہ ارمان کو بھی۔

خاموش تو وہ پہلے ہی تھا، پتا نہ چھوڑ کر لیکن تذبذب کا شکار اب ہوا تھا، بات میں وزن تو تھا اور وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ ارمین کی ذات خاندان بھر کے لئے چٹ پٹا موضوع بن جائے، لوگ اپنی سوچ میں کس حد تک جاسکتے تھے یا کتنا نیچے گر سکتے تھے، سب ہی کو بخوبی اندازہ تھا، مگر چند لمحوں پہلے نظر آنے والے منظر سے دل میں سلگتی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں پڑ رہی تھی۔

وہ آج ابھی اسی وقت ارمین کو اپنا لینا چاہتا تھا، اس کے جملہ حقوق تو نام ہو ہی چکے تھے اب تو بس دنیا دکھاوے کی رسمی کاروائی باقی تھی۔

''خاندان والے، دنیا والے تو اس جھٹ پٹ نکاح پر بھی باتیں بنائیں گے، اچھی امی، تو پھر ان کی پرواہ میں آپ اپنے بچوں کی خوشی کو کیوں روند رہی ہیں، ہفتہ بھر بعد ولیمے کی تقریب میں سب خاندان والوں کو بلا کر کہہ دیئے گا کہ میری روانگی کی ڈیٹ قریب آ گئی تھی اس لئے۔''

شاہان نے آگے بڑھ کر مسئلے کا حل پیش کر دیا، ارمان حیران باقی سب لوگ راضی و مطمئن لیکن اچھی امی مخمصے میں پڑ گئیں۔

ایک ہی بیٹی تھی، بغیر کسی چیز کے کیسے...... محاورتاً نہیں حقیقتاً تین کپڑوں میں۔

''میں جانتی ہوں تم کیوں فکرمند ہو زبیدہ، مگر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت، ارمین کوئی غیروں میں تو نہیں جا رہی، گھر کی بیٹی ہے، گھر میں ہی رہے گی، تمہیں جو بھی کرنا کرانا ہے، کرتی رہنا، جو بھی تمہارے ارمان ہیں سب پورے کر لینا، ہم کوئی بھاگے تو نہیں جا رہے، نہ تمہیں روکنے والے ہیں اور نہ باتیں بنانے والے ہیں۔''

چھوٹی امی جو بیٹے کی اس بے وقت فرمائش سے نادم سی ہو گئی تھیں، اپنی شرمساری دور کرنے کے لئے اچھی امی کے پاس آ گئیں، امی کے پاس انکار کی گنجائش نہ رہی، انہوں نے ایک گہری سانس لے کر ارمان کو دیکھا، وہ گھر کا لاڈلا بچہ نہیں تھا، مگر اپنے لاڈ اٹھوانا اسے خوب آتا تھا، آج پتہ چلا اسے اپنی بات منوانی بھی آتی تھی، اچھی طرح۔

''یاہو......ہو......ہو۔'' سب سے پہلے نمل کا نعرہ نکلا اور پھر سب ہی نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا، جس میں خود ارمان کی آواز سب سے واضح تھی۔

ہمیشہ کی طرح پورے گھر میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، جاثم کو چھوہارے لینے بھیجا، جو نکاح کے سمے تک کسی کو یاد نہ آئے تھے۔

''لو اتنی ضروری چیز...... اور......'' چھوٹی امی سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

نمل اور کزن نے ہکا بکا حیران پریشان سی ارمین کو ٹیک کر اٹھایا اور جھپک سے باہر نکل گئیں، گھنٹہ بھر بعد جب وہ دوبارہ لاؤنج میں آئی تو خواتین کے نرغے میں شرمائی شرمائی اور روئی روئی لیکن بے حد خوبصورت تاثر لئے، وہ حسین

صورت تو نہیں تھی، مگر اس وقت لگ رہی تھی، شاید یہ ارمان کی شدت بھری محبت کا جواب تھا، اثر تھا، طلسم تھا، جس نے اس کے وجود کو گویا نور سے نہلا دیا، اس کے وجود سے روشنیاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ارمان نے اس پر ایک نظر ہی ڈالی تھی، پھر وہی نظر اس پر سے ہٹانی محال ہوگئی، وہ پہلو پر پہلو بدلنے لگا، اس کی کیفیت خود اس کی اپنی سمجھ میں نہ آنے والی تھی، ایک عجیب اضطراب نے وجود کا احاطہ کرلیا، وہ بند مٹھی ہونٹوں پر جماتا جہاں سے شرارتی مسکان بار بار جھب دکھلاتی تھی، مگر وہ مٹھی جما نہیں پاتا تھا، وہ ہونٹوں پر جا کر تھر کنے لگتی، اس کے پیر چند لمحوں کے لئے تھمتے پھر ایڑیاں دھیرے دھیرے زمین پر دھمکنے لگتیں، گھٹنے ہلنے لگتے، کبھی دائیں تو کبھی بائیں، اس کے بدلتے پہلوؤں کے بے چینی شاید کسی نے نوٹ نہیں کی، شاہان کے علاوہ، وہ جانتے تھے اسے کس بات کی جلدی تھی۔

بس لمحہ بھر کی بات تھی، کوئی خیال کرنٹ کی طرح جسم میں برقی رو گزارتا ہوا نکلا اور وہ ایکدم بیٹھے سے کھڑے ہوگئے، ان کا کھڑا ہونا ایسا تھا جیسے ..... جیسے کسی چیز نے اس قدر بے چین کر دیا کہ بیٹھنا ممکن نہیں رہا تھا، وہ چیز کیا تھی، وہ خود بھی سمجھنا نہیں چاہتے تھے، بڑی امی، کومل، جاثم بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''شاہان بیٹے کیا ہوا۔'' بڑی امی گھبرا کر پوچھنے لگیں، پتہ نہیں کیوں، حالانکہ گھبرانے والی کیا بات تھی، ابھی کچھ تو نارمل تھا بے حد نارمل مگر پھر بھی شاید کچھ تو تھا ان کے انداز میں، کوئی غیر معمولی تاثر، کوئی خاص ادا۔

ارمان نے بھی انہیں دیکھا اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کرلیا، ہونٹوں پر بند ہتھیلی تھرک رہی تھی اور ایڑھیاں سنگ مرمر کے فرش پر، وہ پھر بھی پرسکون نظر آنے لگا، شاہان خاموش کھڑے تھے، تب بھی بے سکون سے لگے۔

''کچھ نہیں امی، بہت تھک گیا ہوں آرام کروں گا۔'' اگلی بات سنے بغیر وہ لاؤنج سے باہر نکل گئے۔

میں رنگ شربتوں کا تو میٹھے گھاٹ کا پانی
مجھے خود میں گھول دے تو میرے یار بات بن جانی

فل والیوم میں ڈیک بجنے کی آواز بیڈ روم تک آرہی تھی، بیڈ پر آڑھے ترچھے پڑے شاہان کے کانوں میں آواز گونجنے لگی۔

تو میٹھے گھاٹ کا پانی ....
تو میٹھے گھاٹ کا پانی ....

ان کی بادامی آنکھوں میں نمی پھیل رہی تھی اور انہیں کوئی حیرت نہ تھی، نہ اس نمی کو صاف کرنے کی عجلت۔

☆☆☆

زندگی میں ایک خوشگوار موڑ بہت اچانک ہی آیا تھا، وہ ابھی اس موڑ پر رک کر سنبھل بھی نہ پائی تھی، کہ شاہراہ حیات نے ایک نیا خم کھایا، وہ مٹی سے سونا بن گئی۔

ارمان کی وجہ سے لڑکی سے خاتون تک کا سفر محض چند گھنٹوں میں مکمل ہوگیا، ارمان کی وجہ سے اسے اپنی محبت کی منزل مل گئی، ارمان کی بدولت، وہ جتنا بھی ناز کرتی کم ہی تھا، ہر چند کہ یہ انداز تھوڑا نرالا اور تھوڑا قابل اعتراض تھا، مگر ارمان تو وہی تھا، اس کا محبتوں بھرا دل بھی وہی تھا اور اس کی شدتیں بھی وہی تھیں، ہاں سب پہلے جیسا تھا لیکن یہ جو نیا تعلق نیا بندھن ان دونوں کے درمیان بندھا تھا، یہ جو رشتہ اپنی نوعیت تبدیل کر بیٹھا تھا، پہلے وہ صرف منکوحہ تھی اور ایک گھنٹے

کے فرق سے اس کی بیوی، یہ رشتہ یہ تعلق یہ بندھن اس کی ہتھیلیاں نم کیے دے رہا تھا۔

ایسی گھبراہٹ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، ارمان کے نام سے، ایسی جھجک بھی پہلے نہیں آئی تھی اور ایسی لاج، ایسی شرم، سب وہی ہوتے ہوئے بھی نیا ہو گیا تھا، انوکھا لگ رہا، نرالا بن گیا تھا، کیوں؟ کیونکہ اس کے یہ انداز بھی نہ تھے پہلے، ایسی بے باکی نہیں تھی برتاؤ میں، ایسی معنی خیزی نہیں تھی باتوں میں۔

وہ..... وہ نہیں رہا تھا، کوئی اور بن گیا تھا، سراسر محبت کا پیکر، سراسر چاہت کا وجود ارمین جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا اور خوشی..... خوش ہونے کی باری ہی نہیں آ رہی تھی، وہ اس کے جذبوں کے آگے بند باندھنے میں ناکام ہوئی جا رہی تھی، اس کا وجود ارمان کی محبت کی بارش میں بھیگ رہا تھا اور حلق خشک ہوا جاتا تھا۔

''ارمین!..... ارمین!..... ارمین!'' وہ یوں ہولے سے اس کا نام پکارتا گویا کسی پنکھڑی کو چھو رہا ہو، اس کی بے اختیاریاں بڑھ رہی تھیں، جب بہت تھک کر ارمین نے اس کے ہاتھ تھام لیتے۔

''ارمان!''

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ چونکا گیا۔

''کچھ نہیں..... بس..... کیا ہم..... ہم کچھ عرصے کے لئے دوستوں کی طرح نہیں رہ سکتے، صرف اچھے دوستوں کی طرح۔'' اس کا انداز محبت سے زیادہ التجا کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، ارمان دھیرے سے نہ سمجھنے والے انداز میں ہنس دیا۔

''لیکن کیوں، کیا برائی ہے؟''

''کوئی برائی نہیں، لیکن میں..... میں ابھی ذہنی طور پر شادی کے لئے تیار نہیں تھی، تم نے اس قدر اچانک یہ سب..... بہت نیا ہے میرے لئے، بالکل اچانک، میں شاید ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں ابھی۔''

وہ الجھ رہی تھی، ٹھیک سے بول نہیں پا رہی تھی، مگر اس نے کہہ دیا جو سمجھ آیا، مگر شاید ارمان کو سمجھ نہیں آیا، اچھا بھی نہیں لگا، اس نے ایک دم اپنے ہاتھ چھڑا لئے، ارمین ڈھیلی سی پڑ گئی۔

''تم مجھے..... ارمین..... تم مجھے خود سے دور جانے کے لیئے کہہ رہی ہو۔'' اس کے انداز میں جتنی بے یقینی تھی، ارمین سن سی ہو کر رہ گئی، کیا اس نے یہ کہا تھا جو وہ سمجھا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا؟''

''تو اور کیا کہا ہے، اچھے دوستوں کی طرح؟ کیا ہوتے ہیں اچھے دوست، کیسے ہوتے ہیں، کیا میاں بیوی اچھے دوست نہیں بن سکتے اور کیا فرق ہوتا ہے شادی اور دوستی میں، ایک اچھی دوستی میں اور ایک لو میرج میں۔''

ارمین نے سر جھکا لیا، ارمان اس سے خاموشی کی توقع نہیں کر رہا تھا، وہ توقع کر سکتا تھا کہ وہ وضاحت کرے اپنی بات کی، صفائی دے یا یہی کہہ دے کہ اس کا مطلب وہ نہیں جو وہ سمجھا یا پھر بولے کہ میں مذاق کر رہی تھی، یا پھر..... یا پھر..... کچھ بھی..... کوئی بھی بات..... مگر یہ خاموشی؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر واش روم میں بند ہو گیا، واپس آیا تو اس کی جانب دیکھے بنا، دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گیا، دیر سے ہی سہی، نیند تو آ ہی جاتی تھی، ارمین کے آنسو بہتے رہے۔

☆☆☆

''تم مجھ سے ناراض ہونے میں کتنی جلدی دکھانے لگے ہو ارمان۔'' یہ اس کا پہلا جملہ تھا، جو دوسرے دن اپنی شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح اس

نے ارمان سے کہا، اس نے ڈریسنگ کے آگے کھڑے ہو کر لمحہ بھر کا وقفہ دیا اور پھر بال بنانے لگا، ارمین کے دل کو دھکا سا لگا۔

پہلی صبح کتنی بھرپور اور خوبصورت ہوتی ہے، امنگوں بھری، معنی خیز، نم آلود، شرمیلی مسکان سے سجی، مگر یہ وہ صبح نہیں تھی، جس کا ان دونوں کو انتظار تھا، یہ وہ بات نہیں تھی، جو اسے کہنی چاہیے تھی، ان دونوں کو ہی ایک دوسرے سے یہ امیدیں نہیں تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں پائے نہ احساسات، ہاں جذبات کو سمجھتے تھے، انہیں جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

''ارمان، میں نے کچھ کہا ہے تم سے۔'' وہ سائیڈ ٹیبل سے کچھ اٹھانے کے لئے جھکا تھا، جب ارمین نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس کا بازو تھام لیا، وہ وہیں رک گیا۔

''اگر میں ناراض ہونے میں جلدی دکھانے لگا ہوں، تو تمہیں بھی چاہیے کہ تم مجھے منانے میں جلدی دکھاتی، نہ کہ اتنی خوبصورت رات کو یوں برباد کرتی۔'' بات کے اختتام تک اس کے لبوں پر شرارت پھوٹ پڑی، ارمین نے اس کا بازو ایکدم چھوڑ دیا، وہ جھینپ گئی، ارمان سیدھا ہو کر اس پر جھکنے لگا، اس نے زور سے پیچھے دھکیل دیا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئی۔

خفگی کہاں تھی، کہیں نہیں، وہ خاموشی جو رات سے اب تک ان دونوں کے درمیان کنڈلی مارے بیٹھی تھی، ایک لمحے میں ٹوٹ گئی۔

☆☆☆

زندگی کی ہری بھری شاہراہ پر ان کی رفاقت کی گاڑی چھکا چھک چلنے لگی، سبک رفتار، مگن، بے پروا اور خود میں گم، ہر صبح رنگ تھی ہر شام خوشبو، ہر پہر مہک، ہر پل دھنک رنگ، گزری زندگی میں کوئی کمی تھی بھی، یا کوئی شکایت تھی بھی تو اسے، ایک دوسرے کے ساتھ نے مل کر پورا کر دیا تھا۔

یونہی ایک دوجے کے سنگ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے اتنے معصوم دلہا دلہن کو دیکھتے لوگوں کی حیرت کو انجوائے کرتے دن پر دن گزرتے چلے گئے، جانے کتنے، شاید سال یا پھر سالہا سال۔

گھر میں کتنے موسم آئے گئے، نئے رشتے بنے اور کچھ پرانے ساتھ چھوڑ گئے، جن میں سر فہرست چھوٹے ابو تھے۔

چھوٹی امی کو ان کے جانے سے ایک چپ سی لگ گئی، ڈسٹرب تو ریحان اور ارمان بھی ہوئے تھے اور گھر کے بھی افراد مگر رفتہ رفتہ سب سنبھل گئے، البتہ ان کے جانے سے بالخصوص چھوٹی امی کی زندگی میں ایک خلا در آیا، جسے اب کوئی پورا نہیں کر سکتا تھا۔

ریحان آفریدی اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر کے اس کے میکے والوں کے نزدیک جا بسے، یہ کوئی ایسی قابل مذمت بات نہیں تھی، مگر مسئلہ یہ ہوا کہ بھابھی کا میکہ کراچی کے بجائے اسلام آباد میں تھا، چھوٹی امی، ابو کے بعد ریحان کی شکل کو بھی ترسنے لگیں، یہاں تک بھی گزارا تھا، مگر انہوں نے بالا ہی بالا ملک سے باہر جانے کے انتظامات مکمل کر لئے، بھابھی کے میکے والوں کا آشیر واد ساتھ تھا، ماؤں کی دعائیں لینے کے وقت نہیں تھا، کراچی شہر تھا بھی تو کتنا دور، ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ جانے سے پہلے وہ اکیلے ہی گھر ملنے چلے آئے اور چھوٹی امی اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے ترستی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان کرنے لگیں۔

''کراچی آ جاؤ واپس، بے شک الگ رہ لینا، مگر ہر ہفتے شکل تو دیکھ لوں گی تمہاری۔''

''امی آپ ان کو کراچی بلا رہی ہیں، یہ اسلام آباد سے نہیں اور ہی جانے کے لئے بلکہ اڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔'' ارمان کا لہجہ کافی طنزیہ تھا، ریحان سے برداشت نہیں ہوا، یوں بھی ان کی قوت برداشت آزمانے کو سسرال والے ہی کافی تھے، وہ ایک دم بھڑک گئے۔

''تم چپ رہو، میں امی سے بات کرنے ہی آیا ہوں۔'' امی ہکا بکا دونوں بیٹوں کو دیکھنے لگیں۔

''بات کرنے یا اطلاع دینے۔''

''تمہیں کیا، تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

''سوری میں آپ کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا اس ساری بکواس سے، تم کہنا کیا چاہتے ہو مجھے امی کا یا گھر والوں کا خیال نہیں، میں سب سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔''

''خیر میں یہ تو نہیں کہہ رہا تھا، مگر آپ کے دل میں خیال آ گیا ہے تو یقیناً بیگم کے توسط سے ہی آیا ہوگا، اب...... نکل تو سکتا نہیں۔''

''ارمان چپ کرو تم۔'' چھوٹی امی کو کچھ کچھ معاملے کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''اب کیا چپ کروا رہی ہیں آپ، سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے، چھوٹے بڑے سے بات کرنے کی تمیز تک تو بھول گیا ہے یہ۔''

بڑے ابو گھر پر نہیں تھے، چھوٹے چچا آفس سے نہیں لوٹے تھے، چچی بچوں سمیت اپنے میکے میں تھیں اور جاثم کو چنگ لے دے کر گھر میں صرف ارمین اور امی ہی تھیں، ان تینوں کے علاوہ، ریحان کی اونچی آواز سن کر کچن سے نکلیں، وہ لوگ باہر صحن میں بیٹھے تھے اور ارمین ان کی تواضع کے لئے بہت دل سے ریفرشمنٹ تیار کر رہی تھی، مگر سب ہی اہتمام دھرا رہ گیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو ریحان۔'' چھوٹی امی دکھی کم نہیں حیران زیادہ ہوئیں۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں میں، سب گھر والوں نے مل کر اس کو سر پر چڑھایا ہے، ورنہ جب شاہان آتا ہے تب تو اس کے منہ سے کبھی نہیں نکلا کچھ بھی اور جب اس گھر کا ایک بیٹا ملک سے باہر جا سکتا ہے، تو میں کیوں نہیں، میرے اوپر پابندیاں کیوں۔''

''کون تم پر پابندیاں لگا رہا ہے، ریحان میرے خیال سے تم بیٹھ کر بات کرو، آرام سے۔'' امی نے وہاں پہنچتے ہی معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی، مگر ریحان کا موڈ نہیں تھا۔

''رہنے دیں آپ لوگ، میں صرف یہی بتانے آیا تھا کہ میں اور بشریٰ پرسوں کی فلائٹ سے لندن جا رہے ہیں اور اچھی امی سمجھائیں اپنے اکلوتے داماد کو، ابو کا بزنس خود تو ڈبو کے بیٹھ گیا، دوسروں کو بھی ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتا ہونہہ۔'' ارمان کے ضبط کرتے لال بھبھوکا چہرے پر ایک نظر ڈال کر وہ رکا نہیں، بیرونی دروازہ عبور کر کے صحن تک ہی آیا تھا، وہیں سے واپس پلٹ گیا، تواضع تو دور کی بات اس کا پانی کا گلاس تک یونہی ان چھوا پڑا تھا، سو پڑا رہا۔

چاروں نفوس کو اس کی بات پر جو سکتہ ہوا تھا، وہ سب سے پہلے ارمین کا ٹوٹا اور اس نے ارمان کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا، ارمان جو سرخ نگاہوں سے ابھی تک دروازے کو گھور رہا تھا، بنا اس کی طرف دیکھے اس کا ہاتھ جھٹک کر اندر چلا گیا، ارمین جانتی تھی اب، وہ کئی دنوں تک ڈپریشن کا شکار رہے گا اور اس کا ڈپریشن ارمین کے لئے نری مصیبت تھا۔

یہ اس کی کم نصیبی یا کم فہمی جو بھی کہیں،

چھوٹے ابو کی موت کے بعد ان کا اسٹیٹ ایجنسی کا کام کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا، جانے کیا بات تھی، وہی لوگ جو چھوٹے ابو کی زندگی میں خوب ملتے ملاتے تھے، ان کے انتقال کے بعد آنا جانا کم کرتے چلے گئے، ارمان کو خود اندازہ نہیں تھا کاروبار اور وہ بھی مارکیٹنگ، گھر کی خرید و فروخت کا کام میں جلد بازی اور آر یا پار والا انداز نہیں چلتا، یہ کام صبر اور تحمل سے نمٹائے جاتے ہیں اور خوش اخلاقی سب سے پہلا ہتھیار رہے، اسے کلائنٹس کو ڈیل کرنا نہیں آیا، یا کیا کہ بس، کاروبار جو نہ صرف چل رہا تھا بلکہ منافع بھی دے رہا تھا، ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا اور ارمان نے پرائیویٹ جاب کرلی۔

اس کا ایم بی اے بھی ادھورا رہ گیا اور وہ گھر کو سنبھالنے کے چکر میں اسے کمپلیٹ بھی نہیں کر سکا، ریحان تو اپنی بیگم کو ایسے پیارے ہوئے کہ سب دانتوں تلے انگلیاں لے کے بیٹھ گئے۔

قصہ تمام شد، گھر کے حالات شاہان کے ڈالرز اور ارمان کی بھاگ دوڑ سے پہلے جیسے نہیں تو بہت برے بھی نہیں تھے، اللہ کا شکر ہی تھا، مگر ریحان نے ارمان کو ابو کا بزنس ڈبونے کا جو طعنہ دے مارا تھا، اس کی جلن اور دکھن دلوں میں کہیں جا کے کم ہوتی تھی اور جب تک کم نہ ہو جاتی ارمان اپنے ساتھ ساتھ ارمین کو بھی مبتلائے زچ کیے رکھتا۔

اس کی پہلے دن کی عادت تھی، خود اگر خوش ہوتا تو ارمین کے قہقہے چھڑوا دیتا اور اگر خود کا موڈ آف ہوتا تب بھی سب سے زیادہ نزلہ ارمین پر گرتا، ارمین اس کے مزاج کے بھی رنگوں سے واقف ہونے کا باوجود اس کے غصے سے اب تک گھبرائی تھی، جس طرح ارمان کی خوشی، خواہش، محبت اور والہانہ جذبے سب ارمین کے لئے تھے، بالکل اسی طرح اس کا غصہ بھی ارمین کے لئے تھا اور ارمین......؟ وہ کیا تھی، وہ سر تا پا ارمان کے لئے تھی، پوری کی پوری دل دماغ اور جذبات سمیت...... اسے یہ بات ارمان کو بتانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی، ارمان خود بھی اور گھر کا ہر فرد ہی جانتا تھا، بہرحال اس نے اندر جانے سے پہلے گہری سانس بھری اور سوچا رات کے کھانے کے لئے ارمان کی پسند کی کوئی ایسی چیز بنا لے جو اس کا موڈ بحال کر دے۔

اس نے بہت دل لگا کر چکن بریانی اور شکر قندی کی کھوئے والی کھیر تیار کی، اسے یقین تھا وہ، اس کا موڈ ٹھیک کر دے گی، اسے ڈپریشن کے اس فیز میں جانے سے پہلے ہی نکال لے گی، جس میں ریحان بھائی نے اسے دھکیلنے کی پوری کوشش کی تھی۔

مگر رات کے کھانے سے پہلے ہی ایک ایسی خبر گھر والوں کو ملی، جو تھی تو خوشی کی خبر لیکن ارمان کا مزاج اور دو آتشہ کر گئی۔

☆☆☆

کومل جو اپنے پیا سنگ بیاہ کر اس گھر سے تین سال پہلے رخصت ہو گئی تھی، سب کی بے پناہ دعاؤں اور منتوں مرادوں کے بعد ایک عدد بیٹے کی ماں بن گئی تھی، وہ ڈائننگ ٹیبل پر برتن رکھ رہی تھی جب، فون آیا اور سب ہی خواتین کو ہاسپٹل جانے کی جلدی پڑ گئی، ارمان کے انکار کا تو سب ہی کو پتہ تھا، اس لئے انہیں لے جانے کی ذمہ داری جاثم کے سر آئی اور وہ بخوشی راضی ہو گیا۔

''خدا کا شکر ہے، اس نے کومل کو خیریت سے فارغ کیا۔''

''ہاں بھابھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اب اللہ مجھے ارمان کی خوشی بھی دکھائے، آپ دعا

کریں۔"

کمرے سے باہر نکلتے ارمان نے چادر اوڑھے جانے کو تیار کھڑی چھوٹی امی کے الفاظ سن لئے اور اس کے بعد کوئی ہاسپٹل نہیں جا سکا، یوں لگا جیسے گھر میں بھونچال آ گیا ہو، اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی ماں کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس قدر بدتمیزی سے بات کی کہ سب ششدر رہ گئے۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں، اس طرح کی باتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں، معذور ہوں میں، بیمار ہوں جو اولاد پیدا نہیں کر سکتا، کوئی کمی ہے میرے اندر، کیوں ہر ایک کے آگے اس بات کو رونا روتی ہیں چھ سالوں سے، ہر ایک کے آگے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا ہے آپ نے، حالانکہ میں نے سب کو بتا دیا تھا اور ہزار بار بتا چکا ہوں، نہیں چاہیے بچے مجھے، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے بچوں سے لیکن نہیں۔"

"ارمان!...... ارمان! کیا ہو گیا ہے بیٹا، تمہاری امی تو یونہی ایک بات......"

"آپ تو چپ ہی رہیے خدا کے واسطے۔" اس نے بدلحاظی کی انتہا کرتے ہوئے اچھی امی کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"جو کچھ آپ ارمین کے دماغ میں خناس بھر چکی ہیں، کیا جانتا نہیں ہوں میں، کیا کیا فضول اور بیہودہ مشورے دے دے کر اور ہر وقت اسی ایک بات کی رٹ لگا لگا کر آپ لوگوں نے اس کا بھی دماغ خراب کر دیا ہے، آپ کا کیا ہے، آپ لوگوں کو تو بس اپنی بات کرنے سے مطلب ہے، بھگت تو میں رہا ہوں، کان پک گئے ہیں میرے آپ کی یہی رٹ سن سن کر بچہ بچہ بچہ...... بچہ کیوں نہیں ہوتا، بچہ کب ہو گا، ارے خدا پر سے اگر آپ لوگوں کا یقین اٹھ گیا ہے تو خدارا ہمارا

ایمان تو سلامت رہنے دیں۔"

بات کچھ بھی نہیں تھی اور اب بڑھ کر کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی، چھوٹی امی درمیان میں چیخ کر اسے خاموش کراتی رہیں، پہلی بار تیز آواز میں دوسری بار رندھی ہوئی اور تیسری بار آنسوؤں کی آمیزش لئے۔

جب وہ دھاڑ سے کمرے کا دروازہ مار کر اندر گم ہوا تو اس وقت تک ان کی آواز مکمل بند ہو چکی تھی اور چہرہ اور ٹھوڑی سے لپٹا ہوا نفیس آف وہائٹ اسکارف مکمل طور پر آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

☆☆☆

اس بار تو حد ہی ہو گئی۔

وہ جلد باز تھا، ٹھیک، غصیلا تھا، درست، انتہا پسند بھی تھا، کسی کسی معاملے میں جیسے ارمین، چلو یہ بھی، مگر وہ اس قدر بدتمیز اور بدلحاظ بھی ہو سکتا ہے، یہ نہ درست تھا نہ ٹھیک نہ صحیح بلکہ یہ تو ناقابل یقین تھا، ارمان آفریدی ہمیشہ ہی سب سے زبردستی بھی اور بغیر زبردستی کے بھی محبتیں ہی وصولتا رہا تھا، اکلوتا نہیں تھا، نہ سب سے بڑا نہ سب سے چھوٹا مگر گھر والوں نے اس کی کتنی بے تکی ضد کتنی جلدی، مان کر اسے جو مان دیا تھا، وہ یقیناً گھر کے کسی اور بچے کے حصے میں نہیں آیا تھا، اب اگر ابو کا بزنس اس سے سنبھالا نہیں جا سکا تو اس کا کوئی قصور نہیں تھا، مگر ریحان بھائی اسے کہہ گئے۔

"اسے چھوٹے بڑے سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔" اور ہوا کیا۔

گھر کے باقی سب افراد کی رائے مسترد کر کے ان کا مان توڑ کر اس نے ریحان بھائی کی بات کو ہی سچ کر دکھایا، اپنی ماں کو بے نقط سنائیں اور ماں جیسی چاچی اور تائی کو بھی، بھلے اس نے

سوچا نہ ہو کہ وہ اس طرح پھٹ پڑے گا، مگر پھٹا تو تھا ناں اور بھلا کس کس چیز کے چیتھڑے نہیں اڑ گئے تھے۔

ارمین کی عزت نفس چھوٹی امی کی عزت بھرم اور اچھی امی کی ساری اچھائی، خاک ہو گئی تھی، کومل کے تین سال بعد ماں بن جانے کی خوشی کو ارمان کے سونے آنگن نے نگل لیا تھا۔

☆☆☆

''ایک بات کرنی تھی آپ سے۔''

پندرہ دن تک اس کے مزاج کی تلخی ترشی سہہ کر برداشت کرنے کے بعد آج بڑی مشکل سے اس کے چہرے کے نرم تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے ہمت کی تھی۔

''بولو۔'' وہ بے دھیانی میں چینل بدل رہا تھا۔

''وہ...... ایک ڈاکٹر ہے...... وہی جو...... کومل کا کیس جس نے کیا......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھا، اس نے صرف ''ہوں'' ہی کی تھی۔

''کومل کہہ رہی تھی بڑی اچھی ڈاکٹر ہے، ایک بار اگر ان کو دکھا دیتے تو......'' خلاف توقع وہ پرسکون ہی رہا، ارمین کا حوصلہ تھوڑا بڑھ گیا۔

''کیا فائدہ ہے اس سب کا مجھے بتاؤ، پہلے بھی ڈاکٹر کو دکھا چکی ہو، وہی سارے ٹیسٹ وہ کروائیں گی، پھر وہی رپورٹ پھر وہی تسلی اور پھر وہی......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی، ارمین کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری تھیں، میٹھے گھاٹ سے نمکین پانی چھوٹ رہا تھا، ارمان خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

''میں تھک گئی ہوں انتظار کرتے کرتے، مجھے یقین کی ڈور چاہیے، امید کا ستارہ تو مدھم ہوتے ہوتے اب بجھنے لگا ہے، کتنا اور کتنا انتظار کرنا ہوگا، انسان ہاتھ پیر تو مارتا ہے ناں، مجھے اپنا آپ ادھورا لگتا ہے، اپنی شادی شدہ زندگی نامکمل لگتی ہے، میں مکمل ہونا چاہتی ہوں، اپنی فیملی کو مکمل کرنا چاہتی ہوں، ہم صرف میاں بیوی ہیں، میں مکمل خاندان بننا چاہتی ہوں اور سب سے بڑھ کر میں دنیا کی سب سے بے غرض محبت اور سب سے انمول جذبے کو محسوس کرنا چاہتی ہوں، میں تکمیل چاہتی ہوں ہر چیز کی، اپنے عورت پن کی، اپنے اور تمہارے رشتے کی، ہماری محبت کی اور...... اپنے گھر کی۔'' الفاظ اس کے اندر ادھم مچا رہے تھے، اسے اکسا رہے تھے، جھنجھوڑ رہے تھے، وہ اپنے اندر خود سے ہی جنگ لڑ رہی تھی، کسی تنازع سے نبرد آزما تھی، وہ تھک رہی تھی ٹوٹ رہی تھی، مگر بولی تو صرف اتنا۔

''پلیز ارمان...... پلیز۔'' بعد کے الفاظ اس کے لہجے کی نمی میں بھیگ گئے، آنسوؤں کے گولے تلے دب گئے، لیکن ارمان یہ سب محسوس کرنے کے موڈ میں نہیں تھا، وہ موڈی ہی تو تھا، موڈ تھا تو نکاح کا شوشا چھوڑا اور موڈ ہوا تو رخصتی بھی کروائی، کم از کم اس کی سنگت میں چھ سال گزارنے والی ارمین کو تو یہی لگتا تھا۔

''تمہاری فیلنگز کو میں سمجھتا ہوں ارمین مگر...... آئی ایم سوری میں نہیں جاؤں گا، نہ تمہیں ان فضول کے چکروں میں اپنی جان اور پیسہ پھونکنے دوں گا۔''

''مجھے پیسے کا غم نہیں ہے ارمان۔''

''لیکن مجھے ہے کیونکہ میں بہت محنت سے کماتا ہوں اس لئے۔'' لمحہ بھر میں اس کا لہجہ بدلا اور ارمین کے چہرے کا رنگ بھی۔

''تو آپ کے خیال میں مجھے آپ کی محنت کا احساس نہیں۔''

کچھ تو تھا اس کے لہجے میں، ارمان کو فوراً ہی

اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''نہیں یار یہ میرا مطلب نہیں تھا، بس یونہی نکل گیا منہ سے، تم بھی تو فضول میں ایک بات کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔'' ارمان نے پھر ٹی وی پر نگاہیں جمائیں اور اس نے سوچا شام میں جب وہ یونہی تیار ہو کے کہے گی تو وہ انکار نہیں کر سکے گا، یوں بھی اس نے آج ورکنگ ڈے میں آفس سے چھٹی کی تھی، تو اس کا فائدہ ہی اٹھا لے اور ارادے کے مطابق ہی وہ شام میں پھر اس کے روبرو تھی۔

''جب میں نے منع کر دیا ایک بار تو تمہاری سمجھ میں کیوں میری بات نہیں آ رہی ارمین، نہیں جاؤں گا میں کہیں بھی، کسی بھی ڈاکٹر کو دکھانے۔'' اس کی ساری تیاری اور ہلکے میک اپ سے جگمگاتے چہرے پر دھول پڑ گئی۔

اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ کچھ عرصے پہلے تک ارمان نے کبھی اس طرح اسے کسی بات کے لئے انکار کیا ہو، وہ تو بہت اچھا تھا، اس کی محبت ارمین کے لئے سب سے قیمتی بلکہ انمول اثاثہ تھی اور وہ اپنا اثاثہ اپنا سرمایہ حیات گنواتی جا رہی تھی، وہ یونہی اس کی شکل کو دیکھتی سوچے گئی۔

''اب دیکھ کیا رہی ہو، کوئی دن مجھے بھی سکون سے گھر بیٹھ کر گزارنے دو یار۔'' وہ کتنا بیزار ہو رہا تھا، کس قدر الجھ رہا تھا اس سے، اس کے وجود سے جس کے جسم کے اندر زندگی سانس ہی اسے دیکھ کر لیتی تھی، اس کے لب ہلتے تو بغیر آواز کے مدعا جان لیتی تھی۔

''ٹھیک ہے آپ مت جائیں، پھر میں ہی چلی جاتی ہوں۔'' اس نے ایکدم ہی فیصلہ کر لیا۔

''کیا، دماغ خراب ہے تمہارا، اکیلی جاؤ گی۔''

''ہاں اکیلی جاؤں گی۔'' ضد کرنا ارمان کی عادت تھی، اس کی نہیں مگر وہ بھی تو انسان تھی اور پھر جذبات میں گندھی، ممتا کے بغیر ادھوری عورت۔

''تم نہیں جاؤ گی ارمین۔'' اس نے سرسری لہجے میں اسے حکم دے کر کاؤچ پر پڑا کشن اٹھا کر بستر پر پھینکا اور پھر بیڈ پر گر کر موبائل سے کھیلنے لگا، انداز اتنا لاپرواہ تھا گویا اسے یقین تھا ہمیشہ کی طرح، ارمین ہتھیار ڈال دے گی اور اسے مزید کچھ اور کہنا بھی نہیں پڑے گا، ارمین سکون سے اس کا انداز دیکھتی رہی، پھر گہری سانس لے کر اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالا۔

''میں جاؤں گی ارمان، بلکہ میں جا رہی ہوں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں قدم بڑھائے، ارمان چونک گیا، ٹھٹک گیا، پھر اس کی ہٹ دھرمی کے مظاہرہ دیکھ کر بگڑ بھی گیا، اسے تو یوں بھی آج کل بگڑنے میں لمحہ بھر ہی لگا کرتا تھا۔

''جا رہی ہو...... ہاں؟...... جا رہی ہو، میرے منع کرنے کے باوجود، میں روک رہا ہوں تب بھی، تو ٹھیک ہے جاؤ، جاؤ شوق سے جاؤ۔'' وہ جارحانہ انداز میں اٹھا اور نزدیک آ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

''مگر ایسے نہیں پورے انتظام سے، کبھی نہ آنے کے لئے کیونکہ میں ارمان آفریدی تمہیں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔'' اس نے دروازہ کھول کر اسے دھکا دیا اور وہ سامنے کھڑی بڑی امی سے ٹکرائی، جو اس سے کوئی بات کرنے ان کے کمرے کی طرف ہی آئی تھیں، ان کے پیچھے ہی بڑے ابو تھے، ارمین پر اس کے الفاظ نے جو سکتہ طاری کیا تھا، وہی بڑی امی اور بڑے ابو پر چھا گیا، ارمین لڑکھڑا کر لمحے بھر کو سنبھلی، اس نے بڑی امی کا ہونق چہرہ دیکھا پھر

بڑے ابو کا، اگلے ہی پل وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر زمین پر آ رہی۔

ارمان اس کا حشر دیکھنے کے لئے رکا نہیں، وہ اسے دھکیل کر ان سب کے حواسوں پر اپنے سنگین الفاظ کی سنگباری کر کے کمرہ بند کر چکا تھا۔

☆☆☆

آج ان کا صبح سے ہی کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا، ایک عجیب سی بے کلی دامن گیر تھی، اپنوں کی اور اپنے وطن اور گھر کی یاد تو پہلے بھی وقت بے وقت حملہ آور ہوتی رہتی تھی، خاص طور پر اس وقت کے بعد سے جب دل کی سرزمین پر جنم لینے والا پہلا سنہرا خواب اپنی موت آپ ہی مر گیا تھا، کسی کے علم میں آئے بغیر ہی، ہر چند کہ انہوں نے اپنی والدہ سے ارمین کے ساتھ کی خواہش کا اظہار ضرور کیا تھا مگر، دل کی بے قراریاں اور اسے پانے کی آرزو کرنا کوئی ماں کے سامنے عیاں کرنے والے راز نہ تھے، پھر گھر کے ماحول میں ان کے ذکر سے گھل جانے والی بدمزگی اور سب سے بڑھ کر وہ جس کے لئے سوالی ہوئے تھے، اس ہی کے دل کا مکین کوئی اور بن چکا تھا تو تگ و دو کی بھی جاتی تو لا حاصل ہی ٹھہرتی، لہٰذا خاموشی سے اپنے سنہرے خوابوں کو دل کے اندر ہی سمیٹ کر بیٹھ گئے، لب سی لئے اور بے رنگی سی زندگی کو جینے کے لئے دیار غیر واپس آن بسے، کتنی بار امی نے ان سے شادی لئے کہا مگر انہیں اپنی یہ تنہائی زیادہ عزیز تھی، جس میں ارمین کی یادیں اور اس کے خیال تھے، بہ نسبت اس رونق کے جوان کی شریک سفر کی مرہون منت ہوتی اور وہ اس کے ساتھ ایک منافقت بھری زندگی گزارتے چلے جاتے۔

پھر اس بے کلی کی وجہ بھی سمجھ آ گئی، پاکستان سے آدھی رات کو موصول ہونے والی ایک فون کال نے ان کے حواس چھین لئے۔

''ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، ان کی حالت بہت نازک ہے، تم کسی بھی طرح فوراً پاکستان پہنچو بس۔''

ریسور ان کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا، بھاگم بھاگ بکنگ کروائی، سفر لمبا تھا پھر سیٹ بھی فوراً نہیں ملی، چوبیس گھنٹے بعد کی ملی، وہ بھی collectine فلائٹ میں، پلین کو دو جگہ درمیان میں رک کر بھی پسنجرز کو لینا تھا، نتیجتاً انہیں پہنچتے پہنچتے دیر ہو گئی اور بڑے ابو دنیا سے گزر گئے، ان کا دل چاہتا تھا وہ اڑ کر جا پہنچیں، یہ تو ناممکن ہی تھا، مگر جو ممکن تھا اسے بھی ہونے میں کتنی دیر لگ گئی، بڑے ابو اپنے بڑے اکلوتے بیٹے کو آخری بار دیکھنے چھونے بات کرنے کی حسرت لئے ہی دنیا سے چلے گئے، شاہان، امی سے لپٹ کر خود پر ضبط نہ کر سکے، زار زار رو دیئے۔

ان کا دل تڑپ اٹھا، سوچ سوچ کر کہ ابو نے کتنا انتظار کیا ہو گا، انہیں یاد کیا ہو گا پکارا ہو گا، وہ دنیا داری کے چکروں میں الجھتے گئے، شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ نہ چھوٹے ابو کا دیدار کر پائے، نہ اپنے ابو سے مل پائے، ریحان نے تو بے حسی کی حد ہی کر دی، فون پر ہی تعزیت کر کے کہہ دیا ابھی تو انہیں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہی ہوئے ہیں، اتنی جلدی تو وہ نہیں آ سکتے، ہاں کوشش ضرور کریں گے، وہ کتنی کوشش کرنے والے تھے، ان کے انداز سے ظاہر تھا۔

☆☆☆

گھر کے سبھی افراد نے شاہان کو زندگی میں پہلی بار اپنا ضبط کھوتے ہوئے دیکھا تھا، ورنہ گھر کے بچوں میں صرف وہی تھے جو ہر طرح کی صورت حال کو قابو کرنا اور خود کو ایڈجسٹ کرنا بخوبی جانتے تھے، آنسوؤں، آہوں، سسکیوں

میں بڑے ابو کو سپرد خاک کر دیا گیا اور شاہان اپنے ابو کے کمرے تک محدود ہو گئے پھر کون آیا کون گیا، کس نے کیا کہا اور کیا نہیں، وہ بس قرآن پڑھتے رہے اور اپنے ابو اور چچا کو ایصال ثواب پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ چار دن گزرے، چچی کمرے میں ان کا کھانا لاتیں اور وہ اور چچا زبردستی پیار محبت سے انہیں اور بڑی امی کو اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر دیتے، کمل اور کومل پاس بیٹھی ضبط کرتی رہتیں۔

پھر وہ چوتھے دن کی مغرب کے بعد کی بات تھی، کومل انہیں چائے کا پوچھ کر گئی تھی، جب کسی غیر معمولی احساس نے انہیں چونکا دیا، کیا گھر میں صرف چچا اور چچی ہی تھے، یا باقی لوگ بھی ان کی طرح عبادت اور پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے، مگر جتنے بھی مصروف تھے، ان سے آ کر ان کی سوچیں رک سی گئیں۔

کہیں ارمین بڑے ابو کے جانے کا صدمہ دل پر تو نہیں لے بیٹھی، وہ بیمار تو نہیں، وہ ٹھیک تو ہے ناں، ان کا خیال دھیان اور سوچیں ایک نقطے پر مرتکز تھیں، ارمین ارمین...... وہ بھول ہی گئے نہ دیکھنے والے چہروں میں ایک چہرہ چھوٹی امی کا بھی تو تھا، جنہیں انہوں نے سارا وقت لاؤنج کے ایک کونے میں سر جھکائے آنسو بہاتے ہوئے پایا، ابو کی میت اٹھتے وقت وہ بڑی امی کو تسلیاں اور دلاسے دینے والوں میں نہیں تھیں، انہیں اب یاد آ رہا تھا، چار دن بعد، سوئم گزرنے کے بعد

امی کیوں دوسری خواتین کے کندھوں پر سر رکھے آنسو بہا رہی تھیں، اچھی امی کہاں تھیں، چھوٹی امی کہاں تھیں، ارمان کہاں تھا، ارمین کب سے دکھائی نہیں دی، کیوں...... ان کے ذہن میں ایک کے بعد ایک سوال شور کرنے لگا، وہ سب سے پوچھنا چاہتے تھے اور سب تھے کہاں پتہ نہیں، تبھی اس دن انہوں نے بطور خاص چچی کو روک لیا۔

''چچی امی کہاں ہیں؟''

''وہ بیٹا مغرب کے بعد ذرا دیر کے لئے لیٹ گئی تھیں تو ان کی آنکھ لگ گئی۔''

''اچھا اور چھوٹی امی۔'' چچی خاموش رہیں۔

جانے کیوں ان کے لاشعور میں یہی بات دبی تھی کہ چچی شاید انہیں جواب نہیں دے پائیں گی، کوئی خطرے کے بگل کہیں دور بجا رہا تھا، تبھی انہوں نے اپنا سوال بدل دیا۔

''ارمان کہاں ہے۔'' چچی اب بھی چپ تھیں۔

''ارمین...... اور جاثم......''

چچی چپ...... اور ویسے تو چپ کتنی سکون آمیز ہوتی ہے، سو سکھوں کی ضامن ہوتی ہے ناں، مگر اس وقت شاہان کا چین سکون سب لے ڈوبی، وہ بے یقین نگاہوں سے چچی کو دیکھ رہے تھے، جو منہ پر دوپٹہ ڈال کر پھپک پڑی تھیں۔

''مت پوچھ شانی...... کیا قیامت بیت گئی یہاں سب گھر والوں پر۔'' انہوں نے تیزی سے اٹھ کر چچی کو تھاما اور مسہری پر بٹھایا۔

''سب اس کمینے ارمان کا کیا دھرا ہے، وہی ہے تمہارے ابو کی موت کا ذمہ دار منحوس۔''

شاہان ہکا بکا سے چچی کو سن رہے تھے، کیا گھر میں کبھی اس سے پہلے کسی نے، کسی نے بھی، کسی کو بھی اس انداز میں یاد کیا تھا، نہیں ہرگز نہیں؟

''کیوں چچی! ایسا بھی کیا ہو گیا جو......'' ان کی بات مکمل نہیں ہو سکی، کیونکہ چچی کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''ارے کیا نہیں ہوا یہ پوچھو...... طلاق

دے دی اس نے ارمین کو۔" چچی کے منہ سے الفاظ نہیں سلگتے ہوئے کوڑے نکلے اور ان کے وجود سے لپٹ کر الگ ہوئے تو جیسے قوت گویائی بھی ساتھ چھین لے گئے۔

"ایسے ہی بالکل خواہ مخواہ ایک دن اچانک، بغیر کسی وجہ کے، وہ بے چاری چھ سال سے خالی گود لئے بیٹھی ترس رہی تھی، ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا تو ایسا بھڑکا کہ اس کے سر سے چادر ہی کھینچ ڈالی ذلیل نے۔"

وہ اور زور زور سے رونے لگیں، امی باہر سے گھبرا کر اندر آئیں، تو شاہان کے تاثرات اور چچی کے چہرے نے ساری بات بن پوچھے سمجھا دی اور شاہان...... ان کا حال تو بدتر سے برا تھا۔

گھر والوں پر ایک نہیں دو قیامتیں ٹوٹی تھیں، وہ تو مرد ہو کر بکھر گئے تھے، ان جذباتی نازک دل رکھنے والی عورتوں نے کس طرح خود کو سنبھالا ہو گا، کیسے برداشت کیا ہو گا، چھوٹی امی کو کتنی بے عزتی محسوس ہوئی ہو گی، امی نے خود کو کیسے سنبھالا ہو گا! نمل اور کومل...... ان کی کتنی دوستی تھی ارمان سے، انہوں نے کس طرح سہا ہو گا اور ابو...... وہ تو سہار ہی نہیں پائے، وہ برداشت نہیں کر پائے، تو...... تو ارمان تمہاری وجہ سے...؟

ان کی نگاہوں میں خون اتر آیا، تمہاری وجہ سے یہ سب لوگ کس قدر اذیت سے گزرے اور وہ...... وہ...... ارمین...... وہ کہاں تھی، اس پہ کیا گزری! اور اچھی امی؟ کس کس کا سوچتے وہ، کس کس کا خیال کرتے، ایک ایک نام پر آ کر ان کا دل کٹتا اور کٹ کٹ کر گرتا۔

"امی...... ارمین...... کہاں ہے؟ میں جب سے آیا ہوں، میں نے اسے نہیں دیکھا۔" چچی نے سر اٹھا کر ایک سسکی بھری اور پھر ان کے لبوں سے ٹوٹ کر نکلا۔

"وہ...... وہ عدت میں ہے۔"

☆☆☆

ارمان کو چھوٹی امی نے سزا کے طور پر گھر سے نکال دیا تھا، وہ تب ہی سے اپنا ایک دوست کے پاس رہ رہا تھا، بڑے ابو کو آخری بار دیکھنے کی اجازت بھی بہت مشکل سے ملی تھی، وہ گھنٹوں چھوٹی امی کے آگے ہاتھ جوڑ کر آنسو بہاتا رہا تھا۔

"مجھ سے کیوں مانگ رہے ہو، معافی تم میرے قصوروار نہیں، معافی مانگنی ہے تو ارمین سے مانگو بڑی بھابھی سے مانگو، مگر یاد رکھنا ارمان، تم نے جس حد تک سب گھر والوں کا دل دکھایا ہے ناں، وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گی، نہ ارمین نہ بڑی بھابھی اور نہ زبیدہ، تم ایک نہیں کئی لوگوں کے ایک ساتھ مجرم ہو اور قیامت تک بھی معافی مانگو تب بھی تمہاری معافی ان لوگوں کے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی، اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ اپنی شکل لے کر اس گھر سے ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ۔"

چھوٹی امی کے دل میں بھری بھڑاس کا ایک فیصد بھی وہ اسے نہیں سنا سکی تھیں اور منہ پھیر لیا تھا، ارمان واپس چلا گیا، بنا کسی سے ملے، بغیر کسی سے معافی مانگے اور پھر کتنے دن گزرے وہ پلٹ کر نہیں آیا۔

چھوٹی امی اس کی وجہ سے دوہری اذیت میں گرفتار تھیں، ایک طرف ان کی ممتا تھی تو دوسری طرف ضمیر۔

ایک طرف سوچتیں اس کی خطا نہ قابل معافی ہے، اسے یہی سزا ملنی چاہیے، دوسری طرف وہ گھر والوں سے دل ہی دل میں اعلیٰ ظرفی کے جس مظاہرے کی خواہشمند تھیں،، وہ ناممکن نہیں تو بے انتہا مشکل ضرور تھا، خاص کر ان

دنوں میں جبکہ ابھی تو ارمین کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے اور جاثم اس طرح ارمان کا منتظر تھا، جیسے سامنے آتے ہی اس کا گلا دبوچ کر جان سے مار ڈالے گا۔

وہی گھر تھا اور وہی سب لوگ جو کبھی کسی زمانے میں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، اب اس گھر کا شیرازہ بری طرح بکھرا تھا، کہ ہر فرد ہر شخص دوسرے کے بجائے خود کو سمیٹنے کی ناکام کوشش میں غرق تھا۔

☆☆☆

ایک کے بعد دوسری صبح دوسری کے بعد تیسری، ایک کے بعد دوسری رات اور دوسری کے بعد تیسری، ایک دوسرے کے پیچھے اداس کونج کی طرح اپنے پروں میں چونچ دبا کر گزرتی شامیں۔

اس نے زندگی میں کبھی اتنی بے رنگ صبحیں، اتنی بے کیف راتیں اور اتنی بے پہر شامیں کبھی نہیں دیکھی تھیں اور اس زندگی میں بھلا دیکھا ہی کیا تھا، ایک ارمان اور دوسری اس کی چاہت کے سوا، ابھی تو وہ اس الفت اس چاہت کے رنگوں سے اپنی آنکھوں کو مانوس نہیں کر پائی تھی، اس کی محبت وہ قوس وقزح تھی، جس کے ست رنگ تھے اور ہر رنگ دوسرے سے جدا اور۔

بالآخر یہ آخری سیاہ رنگ اس کے بخت پر بھی سیاہی پھیر گیا، شاید یہ بھی اس دشمن جاں کی محبتوں کا کوئی رنگ ہی تھا، جو وہ آج سونی اجڑی مانگ اور کندھوں سے ڈھلک کر کلائیوں میں پھنسے پھڑ پھڑاتے آنچل سے بے نیاز دور خلا میں یک ٹک کچھ کھوج رہی تھی اور خود سے اور گرد و پیش سے اس قدر بے خبر تھی کہ شاہان کب برابر میں آ کھڑے ہوئے اور کتنی دیر گزری اسے دیکھتے رہے، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

دفعتاً ڈور بیل کی تیز آواز سے وہ اپنے حال میں پلٹی، پھر برابر میں کھڑے شاہان کو دیکھ کر جلدی سے آنچل سر پہ لیا اور رخ موڑ لیا۔

''کیسی ہو ارمین؟'' انہوں نے دھیرے سے پوچھا، وہ جواب دیئے بنا ہی ناخن سے گرل کھرچتی رہی۔

''کیسی ہو سکتی ہوں میں بھلا۔'' وہ بول نہیں تھی، مگر انہیں جواب مل گیا تھا، شاہان گہری سانس لے کر مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے جاثم کو دیکھنے لگے، جس کے ہاتھوں میں ریفریشمنٹ کے شاپرز تھے، ارمین بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں کچھ لوگ ثمل کو دیکھنے کے لئے آنے والے تھے، کبھی جو باتیں خوشی کا باعث بنتی تھیں، اب وہی دل دکھانے کا سبب تھیں۔

وہ کتنی جلدی اپنی زندگی کے خوبصورت مدارج طے کر کے طلاق یافتہ کے حاشیے میں آن گری تھی، بلکہ پٹخ دی گئی تھی، ثمل اور کومل اپنی زندگی کی شروعات کر رہی تھیں۔

کومل کے یہاں بیٹے کی ولادت اور ثمل کی بات ٹھہرنے کے مرحلے، وہ دونوں اس سے کتنا پیچھے تھیں، انہوں نے بحسن وخوبی اپنی اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور خود اس نے محض بارہ جماعتیں پڑھ کے کسی کی محبت کے آگے سرنگوں کر دیا تھا، اس وقت ارمان کی سنگت میں دنیا کا ہر کام غیر ضروری اور غیر اہم نظر آتا تھا، سب سے ضروری تھا اس کی ہو جانا اور وہ ہو بھی گئی تھی، مگر کتنی جلدی چند سالوں کے فرق سے وہ زندگی کی اس ریس میں ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری اور جب کھڑی ہوئی تو پتہ چلا کہ جو لوگ اس کے خیال میں اس کے پیچھے رہ گئے تھے، وہ کب کے آگے نکل گئے، سب سے پیچھے دور بہت دور ایک نقطے کی مانند تو

وہ خود کھڑی رہ گئی تھی، اپنا ادھورا وجود اور ادھوری محبت لے کر۔

"کیا سوچتی رہتی ہو ہر وقت، کیوں گم رہتی ہو اتنے گہرے خیالوں میں، کسے سوچتی ہو...... ارمان کو۔" اس نے یکدم سر اٹھا کر شاہان کو دیکھا، ان کے چہرے پر ناگواری تھی۔

"اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو یاد رکھنا، آدھی زندگی تم نے اس کے ساتھ برباد کی اور آدھی اس کے پیچھے برباد کر رہی ہو۔" انہوں نے غصے سے سر جھٹکا، اس نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

وہ چند لمحے وہیں کھڑے ٹیرس سے باہر روڈ پر کھیلتے بھاگتے دوڑتے بچوں کو دیکھتے رہے ان کا، ارمین کا اور گھر کے باقی سب بچوں کا بچپن بھی اسی سڑک پر یونہی کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔

"یاد ہے تمہیں ہم لوگ ہر شام یونہی کبھی صحن میں اور کبھی باہر گلی میں کھیلتے تھے، کبھی پکڑم پکڑائی، کبھی کھو کھو اور کبھی بس یونہی بھاگ دوڑ، وہ تھکے ہارے پسینہ پسینہ وجود اور ان پر سجے سرخ چہرے ایک دوسرے کی محبت میں غرق تھے، پھر ہم لوگ بڑے ہو گئے، لڑکیاں گھر میں سمٹ گئیں، لڑکے پڑھائی میں مصروف ہو گئے، بھاگ دوڑ کھیلنا کودنا چھوٹ گیا، مگر عادت نہیں چھوٹی ارمان کی۔" وہ ایک بار پھر چونک گئی۔

"اس نے ہمیشہ ہی کھیل جاری رکھا، جدا انداز سے، حیلے بہانوں سے، پہلے اپنی محبت کا بہلاوا دے کر گھر کے بڑوں کے جذبات سے کھیلتا رہا، پھر تمہارے جذبات سے کھیلا، پھر تمہاری زندگی سے۔" وہ بولتے جا رہے تھے، ارمین کا منہ کھلا رہ گیا تھا، آنکھیں سکڑ گئی تھیں، وہ ان کا منہ بند کرانا چاہتی تھی وہ انہیں خاموش دیکھنے کی خواہش مند تھی، لیکن اس میں ہمت نہیں تھی، کہ وہ ان کے سامنے ارمان کی حمایت میں ایک لفظ بھی بول سکے۔

"کیوں؟ کیونکہ خود ارمان نے ہی اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا اور آخر میں...... وہ تمہاری محبت اور تمہاری ممتا سے کھیل گیا۔" ارمین کا تنفس تیز ہو گیا، اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے۔

"اب بھی عقل نہیں آئی تمہیں، آنکھیں نہیں کھلتی تمہاری، تم دن رات صبح شام اسی کے بارے میں سوچتی ہو، جو ابو کے انتقال کے بعد ایک بار بھی اپنی ماں کے حال پوچھنے کو گھر کی طرف نہیں پلٹا، جس نے اتنی غلط حرکت کی اور معافی تو دور تم سے ندامت کے دو الفاظ کہنے کے لئے تمہیں ایک فون تک نہیں کیا۔"

"خدا کے لئے بس کریں، مت اسے اتنا برا بھلا کہیں پلیز۔" شاہان مڑ کر بے یقین کیفیت میں اس کا منہ دیکھنے لگے۔

"آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر، میں اسے نہیں سوچ رہی تھی، مجھے اب اس کا خیال نہیں آتا، پلیز مت یاد دلایا کریں مجھے کیسے اس نے مجھے روند ڈالا۔" اس کی آواز بھرا رہی تھی، آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں، وہ التجا آمیز نگاہوں سے شاہان کو دیکھ رہی تھی، شاہان کے دل کو کسی نے جوتے تلے مسل کر رکھ دیا۔

انہیں بے اختیار اس معصوم لڑکی پر ترس آیا جو خود اپنے دل کی کیفیت کو سمجھنے سے انکاری تھی، جس شخص نے سالوں بے لوث محبت کی بھلا یوں چند دنوں میں اس کے اثر سے نکل سکتی تھی وہ۔

مگر وہ کتنی بے بس تھی، اسی ایک شخص کے ہاتھوں، جو اس سے خود کو یاد کرنے کا اختیار بھی چھین لے گیا تھا، اب اگر وہ فکر نہیں کرتی تو اور کیا کرتی، اعتراف کرتی تو سب کی ملامت کا ہدف

بن جاتی، جس طرح شاہان نے اسے بھی لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔

انہوں نے غصے اور بے بسی سے سر جھٹکا پھر ایک نظر اسے دیکھ کر کندھوں پر پڑی شال اتار کر اسے اوڑھا دی۔

''موسم بدل رہا ہے ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' وہ کہتے ہوئے پلٹ کر سیڑھیاں اتر گئے، ارمین نے ایک نظر انہیں دیکھ کر سر جھکا لیا، اس کی آنکھوں سے ابھی بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

نمل کا رشتہ طے پاتے ہی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی، بجھے بجھے انداز میں ہی سہی مگر سب ہی اپنے اپنے طور پر تیاریاں کر رہے تھے، بڑی امی بھی بظاہر تو خوش ہی نظر آئی تھیں، اب ان کے دل کا حال کیا تھا یہ وہ خود جانتی تھیں، یا ان کا رب۔

نمل خود کو عجیب مشکل میں گھرا ہوا پاتی تھی، اس لئے کے تو خوشی کی ہی بات تھی کہ وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے جا رہی تھی، لیکن وہ اپنی خوشی کو کھل کر کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی، سوائے کومل کے۔

وہ جب ارمین کو چپ چاپ کسی کام میں مصروف دیکھتی یا کہیں خاموشی سے اداس پڑا ہوا دیکھ لیتی تو اس کے مسکراتے وجود پر اوس پڑ جاتی۔

اگر حالات پہلے جیسے ہوتے تو اس خوشی کو سب سے زیادہ محسوس کرنے والی اور اس کی خوشی میں خوش ہونے والے یہی دونوں لڑکیاں ہوتیں، کومل اور ارمین، لیکن اب سب کچھ بدل گیا تھا سب کچھ، درحقیقت اسے ارمین کے سامنے جاتے ہوئے بھی یہی دھیان رہتا کہ کہیں اس کے لبوں سے بلاوجہ مسکراہٹ پھوٹ کر اس کی بہنوں جیسی کزن کو اداس نہ کر دے۔

حالانکہ نمل کا کوئی قصور نہیں تھا، جو کچھ بھی ارمین کے ساتھ پیش آیا، وہ ایک فیصد بھی ذمہ دار نہیں تھی، لیکن یہ اس کا حساس دل تھا، جو ارمین کی اداسی میں حصے دار بنا اپنی خوشی بھی ٹھیک سے نہیں محسوس کر پا رہا تھا۔

گھر میں اس کے زیور، کپڑے، برتن، فرنیچر ہر چیز پر بات ہوتی، ایسے میں اگر ارمین وہاں ہوتی تو ویسی ہی چپ چاپ اداس یا پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کسی کے ٹوکنے پر شریک محفل ہو جاتی اور ایک ''ہوں'' کہہ دیتی، امی کا دل اسے دیکھ دیکھ کر روتا اور وہ امی کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں خشک کر لیتی۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد آج ابر آلود موسم دیکھ کر اس نے کچن میں قدم رکھا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر ہی بیسن نکال کر پکوڑوں کے لئے پھینٹنے لگی، امی کچن میں داخل ہوئیں تو اسے دیکھ کر چند لمحے حیرت کے مارے وہیں کھڑی رہیں، اس نے اپنے پیچھے آہٹ بھی محسوس کر لی تھی اور آنے والے کا ردعمل بھی، تبھی اپنے کام میں لگی رہی۔

''کیا کر رہی ہے میری بچی۔'' چند لمحے بعد انہوں نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''موسم بہت اچھا ہے، سوچا پکوڑے بنا لوں سب کے لئے۔'' وہ دانستہ مسکرائی۔

''صرف پکوڑے بناؤ گی، چائے نہیں۔'' جاثم نے کچن میں داخل ہوتے سے اس کی بات سن لی تھی۔

''اگر میرا بھائی پینا چاہے تو ضرور بناؤں گی۔''

''اگر میری پیاری بہن پلائے گی تو ضرور

پیوں گا۔''

اس نے قریب آ کر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، ارمین کو آج محسوس ہوا جاثم عمر میں اسے چھوٹا ہونے کے باوجود کتنا بڑا ہو گیا تھا، کتنا تحفظ تھا اس کے لمس میں اور کتنا پر اعتماد تھا اس کا لہجہ اپنی بڑی بہن کے لئے، جیسے وہ خود سے بڑی بہن بلکہ اپنی ننھی سی گڑیا سی بہن سے بات کر رہا ہو، آنکھوں میں نمی بھرنے ہی لگی تھی، مگر اس نے خود کو بری طرح ڈپٹ دیا۔

''کمل سے کہو آج ٹیرس پر چائے پئیں گے، ہم تینوں مل کر، بہت پیاری ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔''

''ہم تینوں نہیں بلکہ چاروں، شانی بھائی بھی آچکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرا کر کڑاہی میں تیل ڈالنے لگی۔

جاثم کمل کو آواز لگاتا باہر نکل گیا اور وہ بیسن کی بنتی بگڑتی شکلوں کو تیل میں جلبلاتا دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔

اس کا یوں اچانک گھر کے معاملات میں حصہ لینا خود بخود نہیں تھا، اسے یوں پہلے کی طرح کسی سرگرمی میں حصہ لینے پر مجبور کرنے والی کومل تھی، جو ایک دن پہلے شادی ہی کے کسی کام کے سلسلے میں گھر آئی تھی، سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے رہے اور ارمین کیاریوں سے سوکھے پتے چنتی رہی، اسے نہیں پتہ تھا کہ کومل واپس کب تک جائے گی، وہ تو بس خود میں مگن وہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آئی تو کومل کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''خیریت کومل، تم یوں سب کے درمیان سے اٹھ کر کیوں چلی آئیں۔''

''کیوں جب تم گھر آنے والوں سے سرے سے ملنے، سلام دعا کرنے کی روادار نہیں اور تمہیں عجیب بھی نہیں لگتا، تو پھر میرے وہاں سے اٹھ آنے پر اتنی حیرانی کیوں۔'' کومل کا انداز عجیب تھا، اسے اور زیادہ حیرت ہوئی، پھر جیسے کوئی بات سمجھ آئی۔

''آئی ایم سوری کومل، دراصل میرا کسی سے بھی ملنے کو بات کرنے کو......''

''دل نہیں چاہتا ہے ناں۔'' کومل نے اس کی بات کاٹ کر پوری کی۔

''تم تو سمجھتی ہو ناں۔'' وہ اداسی سے مسکرا کر بیڈ پر بیٹھی۔

''میں سب سمجھتی ہوں لیکن تم کب سمجھو گی مینو۔'' اس نے پھر پلٹ کر کومل کو دیکھا۔

''کیا......کیا ہوا......کیا کہا میں نے۔''

''دیکھو ارمین! تم نے کچھ نہیں کیا، جو کچھ بھی تم پر بیتا، ہم سب کو اس کا دکھ بھی ہے اور افسوس بھی، میرا نہیں خیال کہ مجھے یہ بات تمہیں جتانے کی کوئی ضرورت ہے، تم اپنی ذہنی اور اعصابی توڑ پھوڑ کے جس فیز سے گزریں، سب کو اس کا احساس تھا، لیکن اب اب تم جب تک خود کو اس مرحلے سے باہر نہیں نکالو گی، تم نہیں نکل سکو گی میری جان۔'' ارمین نے سر جھکا لیا، وہ پوچھ نہیں سکی کہ میں اس فیز سے باہر نکل کر کروں گی کیا، جاؤں گی کہاں۔

''سب نے تمہارا خیال کر لیا ناں اب تمہاری باری نہیں ہے کہ تم سب کا خیال رکھو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کومل کا منہ دیکھنے لگی۔

''گھر میں شادی ہونے والی ہے، وہ تمہاری بہن ہے ناں، جو اس گھر سے وداع ہو رہی ہے تمہیں اس کا اور اس کی خوشی کا کوئی خیال نہیں ہے، تم کو اس طرح اداس اور خود میں گم دیکھ کر اس کے دل پر کیا گزرتی ہو گی، سوچا بھی۔''

ارمین گھبرا اٹھی، اس نے واقعی نہیں سوچا تھا۔

''کم آن ارمین، اتنے سامنے کی بات مجھے شانی بھائی کو، جاثم کو کیوں کہنی پڑ رہی ہے تم سے بار بار، تم بھول نہیں سکتی ناں اپنا ماضی، تو مت بھولو، یاد رکھو ہمیشہ۔ ارمان نے جو کمینہ پن دکھایا وہ بھلانے لائق ہے بھی نہیں، مگر وہ تو چلا گیا ناں سب چھوڑ چھاڑ کر تو تم کیوں اس کا سوگ خود پر طاری کرکے پھرتی ہو، ہٹاؤ خود پر سے یہ پژمردگی، جتنا سوچو گی اتنی ہی غم زدہ اور نڈھال رہو گی، گھر والے خوش ہونا چاہتے ہیں، لیکن صرف تمہاری وجہ سے خوش نہیں ہو پا رہے، شزاء بڑی ہو رہی ہے، اس کا بھی کچھ خیال کرو، چچا چاہتے ہیں، جاثم کو شزاء کے لئے، لیکن تمہیں دیکھ دیکھ کر وہ بھی شادی اور خاندان سے برگشتہ ہو رہی ہے اور نمل بھی ٹھیک سے خوش نہیں، اسے تمہارا خیال آتا رہتا ہے، تم کیوں نہیں اس دکھ اور غم سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش نہیں کرتیں۔'' کومل نے بات کے آخر میں جھنجھلا کر اسے دیکھا، ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں، اگلے ہی پل کومل ارمین سے بری طرح لپٹ گئی، ارمین پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''میں...... میں...... کیا کروں کومل...... میں کیا کروں۔'' وہ بری طرح روتے ہوئے اسی ایک جملے کی گردان کر رہی تھی، کومل کی اپنی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

''میں جتنا بھولنے کی کوشش کرتی ہوں، وہ اتنا ہی مجھے یاد آتا ہے، میرا خود پر اختیار نہیں ہے، میں کس سے کہوں، کوئی سمجھتا کیوں نہیں، وہ چھ سال میرا شوہر رہا، میرا محبوب شوہر اور اس سے بھی کئی سال پہلے سے......'' اس سے بات مکمل نہیں کی گئی، کومل خود بھی سسکنے لگی تھی۔

''یوں اس کو یاد کرو گی تو گھل گھل کر ختم ہو جاؤ گی، ہم نے اپنے ایک بھائی کو کھو دیا، دوسرا سات سمندر پار چلا گیا، اب ہم تمہیں نہیں کھونا چاہتے ارمین، ہم سب تمہارے احساسات کو سمجھتے ہیں، بہتر ہوگا کہ اب تم خود کو سمجھاؤ، وہ تمہارے لئے ایسا ہی نامحرم بن چکا ہے، جیسے کوئی غیر مرد اور کسی اور غیر، نامحرم مرد سے شادی کر سکتی ہو اسے محرم بنا سکتی ہو، لیکن ارمان سے تمہاری دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی ارمین میری جان وہ تمہیں دوبارہ نہیں مل سکتا، تمہیں اس کو بھلانا ہی ہوگا، نئی زندگی میں قدم رکھو، اپنی خاطر نہیں اپنے گھر والوں کی خاطر، اپنی امی کی خاطر اپنے بھائی کے لئے، اچھی امی کو دیکھا ہے ناں تم نے، تمہاری وجہ سے ان کی کیا حالت ہے تم...... تم......'' اس نے بے انتہا بے چارگی سے ارمین کو بازوؤں سے پکڑا۔

''تم بدل جاؤ ارمین، سمجھ جاؤ، خود کو برباد مت کرو، اس گھر کی خوشیاں مکمل ہونے دو، خدا کے لئے۔'' اب کی بار وہ خود رو پڑی، بھینچ کر ارمین کو گلے لگایا پھر الگ ہو کر آنسو صاف کیے۔

''میں تم سے وعدہ نہیں لیتی، مگر امید کروں گی کہ اگلی بار جب میں آئی تو مجھے وہی پہلے والی نہ سہی، مگر ایک مختلف ارمین ضرور ملے گی، ملے گی ناں۔'' اس نے مان سے ارمین کی نم آنکھوں میں جھانکا، اس نے دھیرے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب سے اب تک اس نے کومل کی باتوں کو ہر زاویے سے سوچا تھا اور اسے صحیح ہی پایا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ خود پر گزرنے والے سانحے کو بھول کر گھر کی خوشیوں میں شامل ہونے کی سعی کرنے لگی تھی۔

ٹیرس پر وہ چاروں ہی تھے، جاثم، شاہان اور نمل یا پھر وہ خود...... بے حد ہلکی بوندا باندی اور

ٹھنڈی یخ نم آلود ہوا نے سردی کو بڑھا دیا تھا، مگر یہ ٹھنڈی ہوا اس وقت اس کے بوجھل اعصاب اور تھکے ماندے ذہن کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔

اس نے ایک اداس نظر ان تینوں پر ڈالی، کومل، ارمان اور ریحان، شزاء، فلاور ہاؤس کے پھول کتنے کم رہ گئے تھے۔

شزاء اور جاثم کے بارے میں چچا کو کیا خوب خیال سوجھا تھا، اسے دلی خوشی محسوس ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں شزاء کو جاثم کے پہلو میں بیٹھا دیکھ رہی تھی، اس کے لبوں پر ایک بھولی بسری مسکراہٹ آن رکی۔

وہ لوگ گانوں کا مقابلہ کر رہے تھے، ارمین محض خیالوں کے گھوڑے دوڑا رہی تھی جب اچانک اسے ایک آواز نے چونکا دیا۔

میں رنگ شربتوں کا، تو میٹھے گھاٹ کا پانی

شاہان بڑے جذب اور بہت دھیمی آواز میں گنگنا رہے تھے، اس نے بے اختیار آس پاس چھا جانے والی خاموشی کو محسوس کیا اور جیسے کہیں دور سے واپس پلٹی۔

جاثم ذرا فاصلے پر کھڑا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا، نمل بھی اپنے سیل پر کوئی میسج پڑھ رہی تھی اور شاہان...... وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے، مگر ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کس کو کہہ رہے تھے۔

تو میٹھے گھاٹ کا پانی ....

وہ جان بوجھ کر چائے کے کپ پر جھک گئی۔

☆☆☆

امی کے کمرے میں بیڈ پر بہت خوبصورت اناری سرخ اور سلور گرے کنٹراسٹ کا کامدار سوٹ رکھا تھا، وہ ایک لمحے کے لئے رکی پھر بے اختیار بڑھ کر اس کا دوپٹہ اٹھا لیا۔

''اف اتنا خوبصورت سوٹ امی، کس کے لئے، نمل کے جہیز میں۔''

''اوں ہونہہ، تمہارے لئے، نمل کی بارات کا سوٹ۔''

''میرے لئے۔'' اس کے مسکراتے لبوں پر حیرت سمٹ آئی۔

''لیکن کیوں اور لایا کون؟''

''شاہان لایا ہے، تم چاروں کے لئے شزاء کے لئے تھوڑا ہلکا ہے، باقی تم تینوں کا ایک جیسا۔''

''اچھا!'' وہ سوچ میں پڑ گئی، لب ابھی تک ستائش آمیز مسکراہٹ آشنا تھے۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ دوپٹہ بیڈ پر ڈال کر واپس پلٹ گئی، زبیدہ بیگم نے ایک گہری سانس لی، وہ شاہان کا نام اور جوڑے کا سرخ رنگ دیکھ کر یقیناً بے آرام ہو گئی تھی، تسلی کرنے گئی تھی کہ نمل اور کومل کے سوٹ واقعی اس جیسے ہیں یا......

انہوں نے گہری سانس لے کر دوپٹے سے اپنے چہرے پر چمکتا وضو کا پانی صاف کیا، ان کا ایک بھتیجا انہیں امتحان میں ڈال گیا تھا اور دوسرا اس امتحان سے نکالنے کے چکر میں مزید آزمائش میں مبتلا کر گیا تھا، وہ جانتی تھی، چند لمحوں میں ارمین واپس آ کر اس سوٹ پر سخت تنقید کرنے کے بعد اسے پہننے سے انکار کرنے والی تھی اور یہی ہوا، وہ واپس آئی تو غصے میں تو نہیں البتہ بے حد سنجیدگی کی لپیٹ میں تھی۔

''امی! آپ سے سوٹ نمل کے جہیز کے لئے رکھ دیں تو زیادہ بہتر ہے، میں نے نمل سے بات کر لی ہے، اس کا سوٹ پیچ کلر کے کنٹراسٹ کے ساتھ ہے، میں وہ پہن لوں گی۔''

''اس سوٹ میں کیا برائی ہے۔''

''اس سوٹ میں ایک نہیں دو برائیاں ہیں، ایک تو بے انتہا گہرا رنگ ہے، جو کسی نئی طلاق یافتہ عورت پر بالکل سوٹ نہیں کرتا اور دوسرے یہ شاہان لے کر آئے ہیں، بڑی امی لاتیں تو اور بات تھی، اب یہ دونوں وجوہات شادی ہال میں مجھے سب کے درمیان چٹ پٹا موضوع بنا دیں گی اور میں بہر حال مزید کسی کی انگلیوں کا اشارہ اور معنی خیز نگاہوں کے نشانہ نہیں بننا چاہتی۔'' زبیدہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''عورت.....طلاق یافتہ؟''

اپنے تئیں اس نے امی کے بولنے کے کوئی بات نہیں چھوڑی تھی اور امی بھی آگے سے کچھ نہیں بولیں، جو بات وہ کرنا چاہتی تھی، اس کے لئے ان کے اندر ہمت نہیں ہو پا رہی تھی اور ارمین سمجھی کہ بس بات ختم ہوگئی، اس نے بارات والے دن کے دوسرا جوڑا دیکھنا شروع کر دیا، نسبتاً سادہ اور ہلکے رنگوں والا، آخر کو وہ ایک طلاق یافتہ تھی۔

الماری میں الٹے سیدھے ہاتھ مارتے اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی، دل میں درد اور آنکھوں میں بہتے آنسو لئے۔

☆☆☆

اور وہ جو یہ سوچ رہی تھی کہ بات ختم ہو چکی ہے تو یہ محض اس کی خام خیالی تھی، کومل اپنے سسرال سے بطور خاص آئی تھی، اس کے کانوں میں صور پھونکنے کے لئے جس نے اس کو منجمد کر دیا۔

کافی دیر جب اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تو کومل کو اسے ہلانا پڑا۔

''اے میں تم سے بات کر رہی ہوں۔''

''میں نے سن لیا ہے.....کومل میں.....میں ایسا.....''

''پلیز انکار کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو ارمین، ہو سکتا ہے، یہ آپشن رد کرنے کے بعد یا تو تمہیں امیدوں کے سہارے ایک بے حد لمبی مایوسی کی سرحد تک جاتی راہ گزر پر لاحاصل مسافت طے کرنی پڑے یا پھر انتظار کی سولی پر عمر بھر کے لٹکنا پڑے۔'' ارمین نے سر جھکا دیا، کومل کی بات نیم چڑھے کریلے جیسی لیکن سچی تھی۔

''میں یہ نہیں کہتی کہ تم میں کوئی کمی ہے، لیکن ہاں ایک لیبل جو اتنی کم عمری میں تم پر لگ چکا ہے وہ.....تم ساری زندگی یوں تنہا تو نہیں گزار سکتی ناں، کسی نہ کسی کا ہاتھ تو تمہیں تھامنا ہی ہوگا، تو اس سے پہلے کہ کوئی بچوں کا باپ یا بڑی عمر کا امیدوار بن کر ایک بار پھر تمہارے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے لئے آئے، تم.....شاہان بھائی کے لئے ہی۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی، ایک ایسی بات جو ادھوری ہونے کے باوجود پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی، جو اس کے ماضی حال اور مستقبل کا احاطہ کر رہی تھی اور جو شاید اب اسے اس کی حیثیت اور اوقات بھی یاد دلا رہی تھی۔

اس نے دور افق کے سرخ پڑتے دہکتے سرخ کناروں کو دیکھا، ایسی سرخ انگار جلن اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی، اس کے اور کومل کے درمیان خاموشی اپنا سیاہ آنچل اوڑھے وچھوڑے کا نوحہ پڑھ رہی تھی۔

اسے خود اپنی حالت اور دھیمی دھیمی چلتی ہوا پر ترس آیا، سرگوشیاں کرتی، نم خنک سرمئی فضا جیسے سرگوشیوں میں اس سے، کچھ کہہ رہی تھی، کچھ سمجھا رہی تھی۔

''یہ تو ہونا ہی تھا۔''

''یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔''

یہ یونہی لکھا تھا، لوح محفوظ پر.....ازل سے

بھی پہلے، شاید تب سے جب ابھی نیک و بد روحوں نے جسم کا لبادہ اوڑھا بھی نہ تھا۔

''لیکن۔ لیکن۔''

''یہ..... یہ سب..... بہت جلدی نہیں ہو رہا کومل۔'' اس کی آواز میں ٹوٹتے، چٹختے، ریت کے ٹیلوں جیسی پیاس تھی، کرلاتی اور بھڑاتی، کومل نے ایک بازو اس کے شانے پر پھیلا دیا، اس نے ننھی بچی کی طرح اس کے کندھے میں منہ چھپا لیا اور تپتے ہوئے شفاف موتی پلکوں سے ہاتھ چھڑا کر کومل کے آنچل کی پناہ میں چلے گئے۔

''ہم زندگی میں بہت سے فیصلے اپنی مرضی سے کرتے ہیں، لیکن بہت سارے فیصلے ہم نہیں بھی کر پاتے، وہ ہوتے ہمارے ہی، متعلق ہیں، ہماری اپنی زندگی سے متعلق لیکن کبھی وہ فیصلے دوسرے لوگ کرتے ہیں اور کبھی ہماری قسمت اور جب قسمت کا لکھا، تدبیر سے ٹکرانے لگے، تو بحث چھوڑ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دینے چاہئیں، کہ فیصلہ چاہے ہماری مرضی کا ہونا ہو، لیکن ہماری بہتری کا ضرور ہو۔'' اس کی نرم آواز اندھیرے اور اجالے کے سنگم میں دھیرے دھیرے لرز رہی تھی۔

پکھیرو گھروں کو لوٹ کر خاموش ہو چکے تھے، ساکن فضا میں ایک عجیب سی بے چارگی تیر رہی تھی، جب کومل نے بڑھتی ہوئی سردی کو محسوس کر گہری سانس بھری اور وہاں سے اٹھنے کا اذن کر کے تمام باتوں کے نچوڑ ایک جملے میں پیش کر دیا۔

''جب یہ طے ہے کہ زندگی کسی نہ کسی کے سہارے ہی گزارنی ہے تو وہ کسی کوئی اور کیوں کوئی انجانا شخص کیوں، شانی بھائی کیوں نہیں۔''

کومل نے ایک بار پھر اسے قائل کر لیا تھا اور وہ کچھ نہ کر سکی تھی، کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

☆☆☆

نمل کی بارات والے دن سرخ اناری کامدار دوپٹہ سر پر ڈالے رکھے اور ڈریسنگ روم میں دلہن کے برابر بیٹھ کر خود بھی نکاح خواں کا انتظار کرتے اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری رہی۔

اسے مسلسل ارمان سے اپنے نکاح والا دن یاد آ رہا تھا، کس طرح اس نے عین وقت پر اپنی مرضی چلا کر اس کی رخصتی کروائی تھی اور اس دن کو یاد کرنے والی وہ اکیلی نہیں تھی، وہاں گھر کے تقریباً ہر فرد کو ہی بار بار وہ دن اور وہ شخص یاد آ رہا تھا، جو چند ماہ پہلے تک ہی اس گھر کا فرد تھا اور آج جانے کہاں تھا۔

نکاح کے لئے رضامندی دیتے ہی ارمین نے بی الفور رخصتی کے بارے میں سختی سے تاکید کر دی تھی کہ ابھی وہ اس بارے میں بات نہیں کرے گی اور دوسرا کوئی سوچے بھی نہیں شاید اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دبی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو ارمان کی طرح شاہان کو بھی فوراً ہی اس کی رخصتی کا بخار چڑھ جائے، مگر اس کی بات بہت آسانی سے مان لی گئی اور اس نے نم ہوتی ہوئی پلکوں کو آہستگی سے صاف کر کے نکاح نامے پر دستخط کر دیئے، وہ خوش تھی یا نہیں، مگر امی اور جاثم کو خوش دیکھ کر مطمئن ضرور تھی۔

''شاید یہ اطمینان، میری خوشی کے لئے پہلی سیڑھی ثابت ہو اور میں پھر سے.....'' خیال در خیال در خیال، وہ بجائے باہر جانے کے اختتام تک وہیں بیٹھی رہی، بڑی امی اور کومل نے اس کی ذہنی حالت کو سمجھتے ہوئے اس سے اصرار نہیں کیا، وہ خود اپنے دل کی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھی، نہ اس کے دل میں اس بات کا ملال ابھر رہا تھا کہ وہ ارمان کی زندگی سے نکل کر ایک دوسرے شخص کی

شریک حیات بن چکی ہے، نہ اس بات کی خوشی تھی کہ وہ دوسرا شخص کوئی اور نہیں شاہان آفریدی ہے، جو نہ صرف اس کے ماضی سے واقف ہے، بلکہ اس کی اپنے پہلے شوہر سے بے پناہ محبت بھرے جذبات بھی جانتا ہے، اس کے باوجود اسے اپنی زندگی میں شامل کر رہا ہے اور وہ یقیناً اس کے حالیہ احساسات کو بھی سمجھتا ہے۔

نکاح کے کافی دیر بعد جب مہمانوں کے لئے کھانا لگایا گیا اور تقریباً سب ہی لوگ کھانے کے انتظامات کی افراتفری میں مصروف تھے، اس وقت چھوٹے چچا، چچی کے ساتھ دوبارہ برائیڈل روم میں داخل ہوئے، اس سے پہلے وہ قاضی صاحب کے ساتھ نکاح پڑھوانے آئے تھے اور ان ہی کے ساتھ کومل اور اس کی رضامندی لے کر چلے گئے تھے۔

اس نے ذرا کی ذرا ان دونوں کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور پھر جھکا لیا، لاشعوری طور پر اس نے بے اختیار اپنے خشک گلے کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کی۔

چھوٹے چچا، بڑے ابو کے جانے کے بعد اپنی تمام تر شوخی بھول کر بے حد سنجیدہ ہو چکے تھے، خاندان کی تمام خواتین اور ہر چھوٹا بڑا گھر کے ہر فیصلے کے لئے اب ان ہی جانب دیکھتا تھا، وہ خود بخود بزرگ کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے اور اس عہدے پر فائز ہونے کی ذمہ داری نبھانا کتنا کٹھن تھا، یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔

شاہان اور ارمین کے نکاح سے پہلے انہوں نے سات دفعہ استخارہ کیا، تب کہیں جا کے ان کے دل کو قرار ملا تھا، ورنہ بھتیجا یہ بھی تھا اور بھتیجا وہ بھی تھا، جس نے ان کی بیٹیوں جیسی بھتیجی کو بسا کر اپنا کر چھ سال بعد ایک لمحے میں اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ بے حد آہستگی سے اس کے برابر میں بیٹھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو انہیں خود محسوس ہوا کہ ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

''صدا خوش رہو، پھولو پھلو، میری بچی خدا تمہیں......'' ان سے بات مکمل نہیں کی گئی، ان کا صرف ہاتھ ہی نہیں آواز بھی کپکپا رہی تھی، جو بات کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے ہی بری طرح لڑکھڑا گئی۔

انہوں نے بے اختیار اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا اور وہ خود پر چڑھے ہوئے سنجیدگی کے لبادے سے نکل کر پھوٹ پھوٹ کر رونی چلی گئی۔

چچی سوں سوں کرتی دھیرے دھیرے اس کا شانہ دبا رہی تھیں، ہاتھ سہلا رہی تھیں۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر اختتام کی جانب گامزن تھا بارات کا تمام ہنگامہ سمیٹ کر گھر آتے آتے کافی دیر لگ گئی، خواتین اور مرد حضرات فوراً ہی چینج کر کے سونے جا چکے تھے۔

پورے گھر پر ایک اداس خاموشی کا راج تھا، شاید بیٹی وداع کر کے واپس پلٹنے والے والدین ہی نہیں، وہ آنگن اور چوبارے بھی روتے ہیں، جہاں ننھی کلیوں کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزرتی ہے، جن ستونوں سے ان کے آنچل لپٹتے ہیں، جن برآمدوں میں ان کی پازیب بجتی ہے، جن کمروں میں ان کے خواب اترتے ہیں اور جس رسوئی میں ان کے ہاتھ کا ذائقہ جنم لیتا ہے۔

ایسی ہی اداسی اس نے کومل رخصتی پر بھی محسوس کی تھی، مگر جب اس کا دھیان بٹانے اور ساتھ دینے کے لئے کومل تھی اور آج کومل بھی پیا سنگ وداع ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور ایک وہ خود تھی۔

اس کی وداعی، اس کی اداسی اور پرایا ہو جانے کے احساس کو صرف اس کی ماں نے ہی محسوس کیا ہوگا، کیونکہ اس کی رخصتی کا عمل تو اسی گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک محدود رہا تھا، وہ ایک نہیں دو بار اس گھر سے رخصت ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی اس ہی گھر میں واپس آئی تھی، پہلی بار بھی اور اب دوسری۔

دروازے پر دستک کے ساتھ کسی نے کومل کو پکارا، وہ ڈریسنگ کے سامنے کھڑی لایعنی سوچوں میں جانے کب تک الجھی رہتی، لیکن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے شاہان کو دیکھ کر اس کا پورا جسم بے جان سا ہو گیا، ایک فطری حیا کے احساس نے اسے بے ساختہ چھوا تھا۔

شاہان پکار تو کومل کو رہے تھے، لیکن اسے دیکھ کر بھول ہی گئے کہ وہ کس کام سے اور کس کے پاس آئے تھے۔

بے حد آہستگی سے دروازہ بند کر کے وہ آگے بڑھ آئے، شاید انہیں امید نہیں تھی کہ ارمین یوں اکیلی مل جائے گی، وہ بھی اس لباس میں جو انہوں نے اس کے لئے بہت شوق اور سوچ بچار کے بعد خریدا تھا۔

ارمین کے پیچھے مڑ کے دیکھنے اور یکدم گردن واپس گھمانے کی وجہ سے کامدار بارڈر والا بھاری دوپٹہ سر سے پیچھے کی طرف کھسک چکا تھا۔

وہ جس انداز میں اپنی کلائی میں بھری سرخ اور سنہری چوڑیاں اتار رہی تھی، اسی انداز میں رک گئی تھی، یوں کہ تین چوڑیاں ابھی بھی اس کی کلائی سے کچھ آگے پھنسی ہوئی تھیں اور وہ لحہ بہ لحہ خود سے قریب آتے شاہان کی موجودگی کو پوری جان سے محسوس کرتی، لاشعوری طور پر دوسرے ہاتھ سے پھنسی ہوئی چوڑیوں کو محض بے دلی سے ہلا رہی تھی۔

''ارمین!'' انہوں نے بالکل سامنے ٹھہر کر دھیرے سے اسے پکارا، ارمین کے ہاتھ کی حرکت رک گئی، مگر اس نے نظر نہیں اٹھائی۔

''تم نے آج بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔'' ان کی بات بہت غیر متوقع تھی اور لہجہ بھی بے حد سادہ، اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔

''جی..... زیادتی؟''

''ہم..... م۔'' انہوں نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ میں پھنسی چوڑیوں کو واپس کلائی کی طرف سرکا دیا، چوڑیوں میں مدھم سی جھنکار پیدا ہوئی۔

''کیا میرا اتنا سا بھی حق نہیں تھا کہ میں تمہیں..... اپنی دلہن کو نکاح کے بعد ایک نظر دیکھ ہی لیتا، تم ڈریسنگ روم میں ہی بیٹھی رہیں، باہر ہی نہیں آئیں اور..... مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ میں خود تم سے مل لیتا۔'' بہت دھیمے لہجے میں اور بہت ملائم انداز میں وہ ڈریسنگ پر اتار کر رکھی ہوئی باقی چوڑیاں اس کی کلائی میں ڈال رہے تھے۔

ارمین کا تنفس گم ہو چکا تھا، سب کچھ نیا تھا، بے حد سادہ ہونے کے باوجود ان کا لہجہ، بہت معمولی ہونے کے باوجود ان کی حرکت بہت روایتی ہونے کے باوجود ان کی فرمائش اور بے حد قدرتی ہونے کے باوجود ان سے محسوس ہونے والی، جھجک یا پھر شاید کچھ بھی نیا نہیں تھا، سوائے اس رشتے کے جو چند گھنٹوں پہلے ان کے درمیان بندھا تھا۔

چوڑیاں پہنا کر انہوں نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دیا، وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑی تھی، پھر انہوں نے سر سے پیچھے کھسک جانے والے آنچل کو دھیرے سے ذرا سا آگے کھینچا، وہ کچھ اور سمٹ گئی۔

اب وہ بنا کچھ کہے اپنے کرتے کی سائیڈ والی جیب سے اپنا سیل نکال رہے تھے، ارمین خاموشی سے دیکھتی رہی، انہوں نے اس کا چہرہ ذرا سا اوپر اٹھایا، کلک کی آواز ہوئی اور اس کا روپ ان کے موبائل میں قید ہوگیا۔

''رات بہت ہوگئی ہے اب سو جاؤ، تم بھی تھک گئی ہوگی۔'' اسے دیکھ کر مسکرائے پھر اس کی تصویر دیکھی اور اسے دوبارہ دیکھا۔

''تم بہت اچھی لگ رہی تھیں آج۔'' ان کے لہجے نے ذرا کی ذرا گھمبیرتا پکڑی اور ارمین کی دھڑکنوں نے رفتار، لیکن وہ اسی وقت واپس پلٹ گئے۔

''گڈ نائٹ۔'' وہ ان کے جانے کے بعد کتنی دیر کمرے میں ان کی موجودگی کو محسوس کرتی رہی۔

٭٭٭

اگلے دن صبح ناشتے کے لوازمات دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی، کیونکہ نمل کے لئے ناشتہ لے کر جانا تھا، کومل تیار ہوچکی تھی، وہ شاہان جاشم اور ارمین اسے لینے جارہے تھے، لیکن اس کے جھینپنے کی وجہ یہ تھی کہ کومل نے اس کے اور شاہان کے لئے بھی ایسے ہی اہتمام سے ناشتہ ڈائننگ پر سجایا ہوا تھا، جیسے وہ ایک دن کی دلہن ہو۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے کومل، تم تو ایسے بی ہیو کر رہی ہو، جیسے میں کوئی دلہن ہوں۔'' کچن میں آ کر اس نے کومل کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

''تو.....؟ دلہن ہی تو ہو۔'' کومل بے نیازی سے بولی، اس نے ایک حیا آمیز نگاہ پاس کھڑی بڑی امی پر ڈالی۔

''لیکن ابھی میری رخصتی نہیں ہوئی ہے سمجھیں۔'' وہ دبی آواز میں بولی، کچن میں داخل ہوتی شہزاء نے اس کی بات سن لی تھی۔

''اوہو......و......کومل آپی، آپ نے کچھ سنا، اری آپی کو کتنا برا لگ رہا ہے کہ ان کی رخصتی نہیں ہوں۔''

ایکدم بوکھلا کر پلٹی، شہزاء اکیلی نہیں تھی، اس کے معصوم شرارت سے چمکتے چہرے کے پیچھے شاہان بھی تھے، انہوں نے شہزاء کی بات سن لی تھی، لیکن وہ اس قدر جلدی میں تھے کہ دھیان دیئے بغیر سیدھے بڑی امی کی طرف بڑھ گئے اور بے حد دھیمی آواز میں ان سے کچھ بول کر جتنی تیزی سے آئے تھے، اتنی ہی تیزی سے واپس نکل گئے۔

''جاؤ اب تم جلدی سے شانی بھائی کے ساتھ ہی ناشتہ کر لو۔'' کومل نے فضول کی افراتفری دکھائی۔

''جی نہیں، میں نمل کے سسرال جا کے اس کے ساتھ ہی ناشتہ کرونگی۔'' کومل منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

''جی! ابھی میں اتنی بھی حواس باختہ نہیں ہوئی جتنا تم نے سمجھا اور میں ذرا اس کی خبر تو لوں، بہت زبان چلنے لگی ہے میری گڑیا کی۔'' اس نے جا کے شہزاء کے کان پکڑے، وہ بجائے کچھ کہنے کے ہنسنے لگی، ارمین چند لمحے اسے گھور کر دیکھتی رہی، پھر خود بھی ہنس دی۔

''ارے چھوٹی امی کو بلا لاؤ کومل۔'' بڑی امی نے کچن سے نکلتے ہوئے کہا، کومل، ارمین کے پاس رکی۔

''اور اب کان کھول کر سن لو، چاہے کچھ بھی ہو جائے، تمہاری یہ ہنسی رکنی نہیں چاہیے کبھی بھی، تم نے میری بات مان کر مجھے جو اعتماد اور بھروسہ دیا ہے، اسی کے بل بوتے پر کہہ رہی ہوں۔''

''ارے آپی آپ بھی ناں، اس طرح تو شانی بھائی ارمین آپی کو بہت جلدی پاگل خانے

چھوڑ آئیں گے۔"

"کیوں؟" ارمین نے پھر اسے گھورا۔

"بھئی اگر آپ کی ہنسی نہ رکی تو۔" اس نے کندھے اچکا دیے، کومل اور ارمین کھلکھلا کر ہنس دیں۔

☆☆☆

دو ہفتے اسی نئے احساس کی خوشبو تلے مہکتے ہوئے، کیونکہ شاہان نے ان دو ہی ہفتوں میں اسے بہت اہمیت دی، اپنی ذات پر سے کھویا ہوا اعتماد اور بے قدری کے احساس سے بنا خول چٹخنے لگا، ماضی کو بھول کر نئی ڈھب سے جینے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی، امی اسے ہنستا مسکراتا دیکھ کر خوش تھیں اور وہ خود کو پھر سے پہلے والی ارمین جیسا بنتا دیکھ کر حیران۔

"کتنی جلدی میں اپنی پچھلی زندگی کو بھول رہی ہوں کومل؟" ایک دن اس کے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں تو یاد رکھنے لائق ... بھی کیا اس میں، جتنی جلدی بھلا دو اتنا ہی بہتر ہے اور ... جلدی بولنے کی نہیں، کسی بھی شخص کے دیئے ہوئے زخم بھرنے کے لئے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کا مرہم ہی چاہیے ہوتا ہے اور جلدی یا دیر سے، گھاؤ بھر ہی جایا کرتے ہیں۔" اس نے ممنون نگاہوں سے کومل کو دیکھا، پھر تخت پر دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹی چھوٹی امی کو۔

"چھوٹی امی کتنی خاموش سی ہوگئی ہیں ناں کومل؟" اب اس کی نظروں میں ترحم اور تاسف تھا۔

"ہوں، ظاہر ہے، اولاد کا دکھ والدین کو یوں ہی پاگل سا کر دیتا ہے۔"

"ریحان بھائی نے بھی تو حد ہی کر دی، گئے تو ایسا گئے کہ واپس پلٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

"اونہہ، ابھی سے کہاں، ابھی تو دو سال بھی نہیں گزرے، وہ تو اگلے کئی سال تک نہیں مڑنے والے۔" اس نے افسردگی سے گرم شال کو اپنے گرد لپیٹا اور اجڑی ہوئی کیاریوں پر نظریں جما کر بولی۔

"اگر ارمان نے میرے ساتھ اتنی زیادتی نہ کی ہوتی تو شاید میں اس کی ہر غلطی معاف کر کے اسے گھر لے آتی، کم سے کم چھوٹی امی کے دل کو قرار تو مل جاتا۔" کومل نے نظریں ترچھی کر کے عجیب سے انداز میں اسے دیکھا، لیکن وہ محسوس نہیں کر سکی، وہ کہیں اور کسی اور کے خیالوں میں گم تھی، کومل نے سوچا۔

"شاید ارمان کے ہی خیالوں میں۔"

☆☆☆

جنوری کا مہینہ آیا اور خاموشی سے گزر بھی گیا، پچھلے کئی سالوں میں جنوری کے مہینے میں صرف شزاء کی سالگرہ منائی جاتی تھی، ارمان اور ارمین کی شادی کے بعد کے سالوں میں سالگرہ کی دلچسپی کم ہوتے ہوتے ختم ہی ہوگئی تھی، اس کی جگہ ان کی شادی کی سالگرہ نے لے لی تھی، لیکن اس سال تو شزاء نے بھی کوئی دلچسپی نہیں لی، اس کا کہنا تھا کہ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور بچوں کی طرح سالگرہ منانے کے لئے اس کا چھوٹا بھائی ہی کافی ہے، ارمین شاہان اور کومل نے پھر بھی اس کو گفٹس دیئے اور ارمین نے اس کے لئے مزیدار سا کیک بھی بیک کیا۔

نمل ہنی مون کے لئے جا چکی تھی۔

شزاء کی سالگرہ کا کیک اور ریفریشمنٹ گرما گرم کافی کے ساتھ انجوائے کرتے ہوئے وہ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے، بڑی، چھوٹی اور اچھی امی بھی وہیں موجود تھیں، جب ایکدم شاہان نے سب کو مخاطب کر لیا۔

''مجھے آپ سب لوگوں سے کچھ کہنا ہے۔''
ان کے یوں بولنے سے ماحول پر ایکدم ہی خاموشی چھا گئی، ارمین بھی ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی، انداز بتا رہا تھا کہ بات یقیناً خاص ہے۔

''میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے اسلام آباد اور میں چاہتا ہوں۔'' انہوں نے حاضرین محفل پر ایک نظر ڈالی اور ایک لمحہ رک کر بولے۔

''میرے جانے سے پہلے میں ارمان کو گھر میں واپس بلا لوں۔'' محفل پر چھایا سکتہ طویل ہو گیا، ہر کوئی اسی ادھیڑ بن میں لگ گیا کہ بھلا اس خبر پر ردعمل کیا دے۔

سب سے پہلے اچھی امی کے وجود میں جنبش ہوئی، انہوں نے بے حد آہستگی سے ڈائننگ ٹیبل پر پھیلے گندے برتن اکٹھے کرنے شروع کر دیئے، شاہان نے چند لمحے انہیں دیکھا۔

''میرا نہیں خیال کہ اب آپ لوگوں کو اس کی واپسی پر کوئی اعتراض ہونا چاہیے، وہ اس گھر کا ہی فرد ہے، اس سے غلطی ہوئی میں مانتا ہوں مگر اب ہم سب کو اسے معاف کر دینا چاہیے، کیونکہ میرے خیال میں ہم نے اس کی کی ہوئی غلطی کی ایک حد تک تلافی کر دی ہے۔'' سب لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ اڑتی ہوئی، ارمین کے چہرے پر آ کر ٹھہری، جو بت کی طرح ساکت و جامد شاہان کو دیکھ رہی تھی۔

''چھوٹی امی کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے، ایسے میں بہتر یہی ہے کہ ان کے بچوں میں سے کوئی تو ان کے پاس ہو۔''

چھوٹی امی نے اچانک رونا شروع کر دیا، شاہان نے اٹھ کر انہیں خود سے لگا لیا، ارمین نے چند لمحے یہ منظر دیکھا، پھر تیزی سے بنا کچھ بولے اٹھ کر باہر نکل گئی، چھوٹے چچا اور چچی سمیت سب لوگوں نے بطور خاص اس کا یوں جانا محسوس کر لیا تھا، اسے یقیناً شاہان کی بات پسند نہیں آئی تھی اور نہ وہ اس بات سے اتفاق کرنے والی تھی۔

چھوٹے چچا اٹھے اور گہری سانس لے کر شاہان کا کندھا تھپتھپانے لگے، اس نے یقیناً اپنی چھوٹی امی کے جذبات کو سمجھ کر ہی یہ مشکل فیصلہ کیا تھا، ورنہ کیا آسان تھا، اپنی منکوحہ کے سابقہ شوہر کو اپنے ہی گھر واپس بلا لینا، وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ خود گھر چھوڑ کر اسلام آباد جا رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی منکوحہ اور اس کا سابقہ شوہر ماضی میں صرف میاں بیوی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے محبوب بھی رہے ہیں۔

☆☆☆

بھیگے سرد جنوری کی ایک سرمئی دھند بھری شام تھی اندھیروں اجالوں کے سنگم کنارے کھڑی وہ پتھر آنکھوں سے اس ستمگر کو اپنی ماں کے گلے لگ کر روتا ہوا دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ آنسو پچھتاوے کے ہیں یا واپس آنے کی خوشی کے ہیں۔

بڑی امی، چاچو اور چاچی، بہت رسمی اور سرد انداز میں اس سے مل رہے تھے، جاثم اور امی نے اسے دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی، اس نے گہری سانس لے کر کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

دو دن پہلے جب شاہان نے اس کی واپسی کا بتایا تھا تو وہ غم و غصے سے کھولتی ہوئی ان کے پاس گئی تھی، یہ پوچھنے کے لئے کہ۔

''جب میں نے خود کو خوشیوں کی طرف موڑنا چاہا ہے، تو آپ کیوں میرے راستے میں ایسی دیوار کھڑی کر رہے ہیں جو ہمیشہ میرے دل کی خوشی اور میرے درمیان رکاوٹ بنی رہے گی اور میں اچک اچک کر اس کے پار نظر آنے والی

کی مسرتوں کا چہرہ تو دیکھوں گی، لیکن انہیں چھو کے محسوس نہیں کر پاؤں گی۔''

''تم نے چھوٹی امی کا کرب محسوس نہیں کیا ارمین، دو ہی تو بچے ہیں ان کے اور دونوں ان سے دور چلے گئے، شوہر کا انتقال ہو گیا، وہ کتنی اکیلی رہ گئی ہیں، یہ بات وہ خود ہی جانتی ہیں، ہم اندازہ تو کر سکتے ہیں ناں، ہر وقت ان کی شوگر بڑھی رہتی ہے، ظاہر ہے اپنے بیٹے کو یاد کر کر پریشان اور غم زدہ رہنے سے ناں، گھر کے سب لوگ مل کر کوئی خوشی مناتے ہیں، اس میں ان کے بیٹے شامل نہیں ہوتے تو......''

''ان کے بیٹے اگر ان سے دور ہیں تو اپنی مرضی سے یا اپنے کیے کی وجہ سے۔'' اس نے بات کاٹی۔

''ہاں لیکن ارمان کو اپنی غلطی کی کافی سزا مل چکی ہے ارمین، وہ مہینوں گھر سے اور گھر والوں سے دور جگہ جگہ بھٹکتا رہا ہے اور بہت بیمار بھی ہے وہ اب مزید اس گھر سے دور نہیں رہ سکتا اور یہ اس کی پشیمانی ہی ہے، جو وہ ایک بار کے بعد دوبارہ پلٹ کے نہیں آیا، ورنہ اگر وہ آنا چاہتا، تو اس گھر پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا میرا یا تمہارا۔'' بہت دھیمے اور مدلل انداز میں انہوں نے گفتگو سمیٹی۔

''کیا تم اس کے یہاں آنے سے خوفزدہ ہو۔'' وہ ان کی بات پر چونک گئی، وہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے، جیسے دل میں اٹھتی سوچ کی لہروں تک رسائی چاہتے ہوں۔

''میں خوف زدہ کیوں ہوں گی، مگر میں اپ سیٹ ضرور ہوں۔''

''اگر اتنی اپ سیٹ ہو تو چلو اسلام آباد میرے ساتھ۔'' انہوں نے بہت سرسری لہجے میں کہہ کر ڈرائنگ ٹیبل پر رکھی کتابوں پر دو چار ہاتھ مارے، پھر ذرا کی ذرا ترچھی نگاہوں سے اس کے تاثرات دیکھے، وہ اپنی مسکراہٹ لبوں میں دبا کر روکے ہوئے تھی، یہی حرکت شاہان نے کی۔

''میں امی کے پاس جا رہی ہوں۔'' کوئی جواب نہ پا کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی، شاہان جو خود بھی دل ہی دل میں متفکر تھے، مگر اس پل دھیرے سے ہنس دیئے۔

☆☆☆

جب سے ارمان نے گھر میں قدم رکھا تھا، ارمین اپنے کمرے میں بند تھی، وہ کسی طور اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی اور ایک وہ تھا، دبے لفظوں میں کھلے لفظوں میں، سرگوشی میں آواز میں کتنی ہی بار اپنی ماں سے اس کا پوچھ چکا تھا۔

''کہہ تو دیا مجھے نہیں معلوم کہاں ہے اور جہاں بھی ہے تم سے مطلب۔'' ہر بار وہ اسے یونہی جھڑک دیتیں اور وہ دل ہی دل میں سوچتا۔

''اب کوئی مطلب ہو بھی کیا۔''

''امی میں اس سے ایک بار صرف ایک بار مل کر معافی مانگنا چاہتا ہوں، وہ کہاں ہے اس سے کہیں میرے سامنے آئے، مجھے موقع تو دے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا، ایک بار امی۔'' نمل اور کومل بھی اس سے ملنے آتیں، پہلے کی طرح مسکرا کر، میٹھے لہجے میں بات چیت ہوتی رہی۔

''کومل میں ایک بار ارمین سے ملنا چاہتا ہوں، پلیز اس سے کہو کہ......'' کومل اور نمل کے چہروں سے ہنسی جتنی تیزی سے غائب ہوئی، اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''کیا کرو گے اس سے مل کر، کیا ملے گا معافی مانگ کے۔'' کافی دیر کے بعد کومل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''دلی سکون، ضمیر کی آوازوں سے چھٹکارا۔'' اب کی بار اس کا لہجہ بہت طنزیہ تھا،

ارمان سر جھکا کر رہ گیا۔

''دیکھو ارمان، میری باتیں تمہیں بہت ہی کڑوی لگیں گی، لیکن میں تم پر واضح کر دوں، وہ اب تمہاری نہیں، میرے بھائی کی بیوی ہے، وہی بھائی جو تمہیں سب کی مخالفت مول لے کر اس گھر میں واپس لایا ہے اور وہ بھی یہ بات برداشت نہیں کرے گا کہ تم اب اس کی بیوی سے کسی بھی قسم کی کوئی بھی بات کرو اور جس ذہنی اور دلی سکون کو پانے کے لئے تم اس سے بات کرنا چاہتے ہو، وہ اس سے بات کرنے کے بعد تمہیں تو مل جائے، مگر اسے اتنے عرصے بعد جو تھوڑا بہت قرار نصیب ہوا ہے، وہ بھی شاید اس سے چھن جائے گا، یہ کوشش بیکار ہے، تم آئندہ ایسی بات نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔'' کومل نے بات مکمل کر کے نمل کو اشارہ کیا اور دونوں وہاں سے اٹھ گئیں۔

باہر شاید آندھی آ رہی تھی، کھڑکی کے پٹ زور دار آوازوں سے بج اٹھے، پورا کمرہ سرد ہواؤں اور گرد سے اٹ گیا، لیکن وہ کتنی ہی دیر ایسے سر جھکائے بیٹھا رہا، جیسے اسے گرد و پیش کے کچھ ہوش نہیں، اس کے کانوں میں ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔

''وہ اب تمہاری نہیں، میرے بھائی کی بیوی ہے، میرے بھائی کی بیوی ہے، میرے بھائی..... شاہان..... شاہان آفریدی کی بیوی.....ارمین.....'' گرم گرم خون لاوے کی طرح اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارتا رہا اور وہ جبڑے بھینچے کتنی دیر وہیں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت کھانے کے بعد گھر میں سب کے سونے کی وجہ سے سناٹا سا ہو جاتا تھا، اس نے سوئیٹر اتار کر شال لپیٹ لی۔

کراچی میں سردی آنے اور آ کر چلے جانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے، اس وقت بھی ایسے کمرے میں حبس اور گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی، وہ بہت دن بعد اپنے کمرے سے باہر نکل کر کچن تک آئی، گھر پر حسب معمول دوپہر کا سناٹا تھا، اس نے اپنے لئے مگ میں کافی نکالی اور دھیرے دھیرے بنا آواز کیسے پھینٹنے لگی، چولہے پر رکھے دودھ میں ابال آنے لگا تو اس نے احتیاط سے پکڑا اور کپ میں انڈیلنے ہی لگی تھی کہ کسی نے پکارا۔

''ارمین!''

آواز اتنی غیر متوقع تھی کہ اس کا ہاتھ لرز گیا، گرفت ذرا ڈھیلی پڑی اور گرم دودھ کی دیگچی سلیپ پر آ رہی، گرم گرم کھولتا ہوا دودھ اس کا ہاتھ اور پیر جلا گیا، اس نے مڑ کے دیکھے بنا ہی اپنا ہاتھ ''سی'' کی آواز کے ساتھ پکڑ لیا اور یونہی کھڑی رہی، ایسا لگتا تھا، اگر آج مڑ کر دیکھا تو پتھر کی ہو جائے گی، بے جان، بے روح، بے موت ماری جائے گی، کبھی زندہ نہ ہونے کے لئے۔

کبھی یہ آواز یہ پکارا دل کے دھڑکنے کا سبب تھی اور آج دل کے رکنے کا باعث بن رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ جل گیا ہاتھ اور پیر بھی، چچ۔'' وہ تیزی سے آگے آیا، کوکنگ آئل نکال کر دو انگلیاں بھگوئیں اور بالکل غیر ارادی طور پر اس کے سرخ ہاتھ پر ملنے لگا۔

ارمین کے اندر مذاحمت دم توڑ چکی تھی، وہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، حلقوں زدہ، زرد کمزور بڑھی ہوئی شیو والا چہرہ، جیسے کتنے دن سے بیمار رہا ہو۔

آئل لگاتے ہوئے ارمان نے سر اٹھایا اور

اسے جیسی کسی بہت پرانے طلسم نے پھر سے اپنے سحر میں جکڑ لیا، وہ......وہی تھی، وہی تو تھی، بالکل ویسی ہی جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

وہی آنکھیں، وہی ہونٹ اور جڑی جڑی نم آلود پلکیں، جن کے تصور نے ہمیشہ ہی اس کی نیندیں حرام کی تھیں۔

''ٹن ٹن ٹن۔'' لاؤنج میں لگی وال کلاک نے سہ پہر ہونے کا اعلان کیا۔

دونوں ہی چونک کر کسی جادو کے اثر سے آزاد ہوئے، ارمین نے لمحہ بھر میں اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اس کے چہرے پر برہمی اور سختی چھا گئی۔

''مسٹر ارمان! آئندہ مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''ارمین......میں......''

''بس میرا نام بھی لینے کی ضرورت نہیں، یہ اختیار آپ کھو چکے ہیں مسٹر آپ آئندہ......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی، کچن میں بالکل اچانک بڑی امی داخل ہوئی تھیں، خاموشی سے بنا آہٹ کیے، ان کی چبھتی ہوئی نظریں، ارمین اور ارمان کے وجود پر جمی تھیں۔

ارمین ایک جھٹکے سے بنا کچھ کہے باہر نکل گئی، ارمان سنک میں اپنے ہاتھ دھونے لگا، بڑی امی نے کہا تو کچھ نہیں تھا، مگر وہ دونوں ہی ان کی نظروں کا مفہوم جان چکے تھے، جواب بنا ہاتھ لگائے بڑی جتاتی نظروں سے کافی کے مگ اور سلیپ کے نیچے گرے دودھ کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

چاند کا سفر اختتام کی جانب گامزن تھا، لیکن سوچوں کا سفر لامتناہی حدود پر پھیلا ہوا، سمٹاؤ سے مبرا دکھائی دیتا تھا۔

بالکونی کی منڈیر پر رکھا کافی کا مگ ان کے اپنے ہاتھوں کی طرح یخ ہو چکا تھا، مگر نہ کافی کے مگ کو عزت بخشی گئی تھی، نہ منڈیر پر جمی ہتھیلیاں سرکنے کو تیار تھیں، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سردی کی ایک لہر پورے جسم میں سرائیت کرتی، ان کے ساکت وجود میں جنبش پیدا کرنے کی ناکام کوشش کے بعد دم توڑ دیتی۔

''جتنی جلدی ہو سکے گھر واپس آؤ اور اپنی امانت کو لے کے جاؤ شاہان، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ......''

''کہ؟......کہ کیا؟'' وہ پوچھ نہیں سکے تھے، امی بول نہیں سکی تھیں، زبان رک رک جاتی تھی، مقابل کوئی اور نہیں ان کی اپنی سگی اولاد تھی اور ذکر خیر کسی اور کا نہیں، ان کی اپنی سگی بھتیجی کا تھا، جو اب کی بہو بن چکی تھی۔

وہ کس منہ سے کہہ دیتیں کہ ارمان کی واپسی کسی بہت بھیانک طوفان کی آمد کا سبب بن سکتی ہے، وہ ارمین کے دل میں دفن مردہ جذبات کی قبریں کھود کر ان کو واپس زندہ کر دے گا اس کے دماغ میں فتور سما گیا تو ایک بار پھر گھر بھر کو مجبور ہونا پڑے گا اور بہت ممکن تھا اس بار وہ اپنی بات منوانے کے لئے تنہا نہ ہوتا، بلکہ ارمین اس کے ساتھ ہوتی، کتنی ان کہی باتوں نے شراروں کا روپ دھار کر بند ہونٹوں سے اس کی سماعتوں پر آبلے ڈال دیئے تھے۔

یقین تو خود بڑی امی کو بھی نہیں تھا، لیکن جو کچھ وہ دیکھ چکی تھیں اور جو کچھ وہ سن چکی تھیں، انہیں بوکھلا دینے کے لئے کافی تھا۔

رہ رہ کر ان کی نظروں کے سامنے سلیب پر گرا دودھ اور سلیب سے ٹپکتے قطرے گھوم جاتے، ارمین کا جلا ہوا ہاتھ اور اس کے الفاظ۔

''یہ اختیار آپ کھو چکے ہیں مسٹر!''

وہ کون سا اختیار تھا جو ارمان استعمال کرنا چاہتا تھا اور ارمین اسے روک رہی تھی، پل بھر

میں شوہر کے ہزاروں حقوق ان کی آنکھوں میں بجلی بن کر چمکتے اور وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ جاتیں، بیٹھی ہوتیں تو کھڑی ہو کر ٹہلنے لگتیں۔

''کاش یہ منظر میرے بجائے زبیدہ دیکھ لیتی، تو اپنی بیٹی کو پہلی فرصت میں اسلام آباد روانہ کر دیتی۔''

وہ خود کو بے بسی کی انتہا پر پاتی تھیں، کیونکہ ''اچھی امی'' سے اس بات کا ذکر کرنا، ان کی نظر میں ان کی بیٹی پر الزام تراشی کرنا تھا، زبیدہ اس بات پر صرف ناراضگی کا اظہار نہیں، بلکہ ٹھیک ٹھاک واویلا کر سکتی تھیں، ٹھوک بجا کر، سوچ سمجھ کر ایک آخری خیال یہی تھا کہ ڈھکے چھپے الفاظ میں شاہان کو صورت حال سنگین ہونے سے پہلے ہی اس کی سنگینی کا احساس دلایا جائے، کھلے لفظوں اور تلخ انداز یوں خطرناک تھا کہ، تھا تو شاہان بھی مرد ہی ناں۔

وہ نہیں چاہتی تھیں اس حوالے سے کوئی بھی شرمناک بات گھر والوں کے سامنے ڈسکس کی جائے، ان کے لئے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا اور شاہان کے لئے، یا جاشم کے لئے، اس سے آگے ان کی سوچ کے پرندے اڑان بھرنے سے انکار کر کے بے دم گر پڑتے تھے۔

کون نے گھر واپس جاتے جاتے یہ بات بھی ان کے کانوں میں ڈال دی تھی کہ، ارمان اب معافی تلافی کے لئے ارمین سے بات کرنے کا خواہشمند ہے، حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا مگر اس عقل کے اندھے کو کون سمجھاتا۔

جبھی ہر طرف سے ہار کر انہوں نے شاہان کو فون کیا اور جو جواب شاہان نے دیا، اس کے بعد انہیں عقل کے اندھے کا خطاب ارمان کے بجائے شاہان کے لئے زیادہ مناسب لگنے لگا۔

''وہ جو کر رہا ہے اسے کرنے دیں امی بلکہ وہ دونوں جو بھی کر رہے ہیں انہیں کرنے دیں، ارمین اگر میری ہوئی تو ارمان کو دھتکار دے گی اور اگر اسی کی ہوئی تو پھر ارمان سے ملنے کے لئے اسے حلالہ بھی کرنا پڑا تو وہ راضی ہو جائے گی۔''

یہ الفاظ انہوں نے کس طرح ادا کیے تھے، وہ خود ہی جانتے تھے، اس وقت ان کے دل میں ایسا درد ہو رہا تھا، جیسا دل کے مریضوں کے دل میں ہوتا ہوگا، وہ بھی دل کے مریض ہی تھے، مریض محبت تھے، سواب یہ درد ان کو جھیلنا ہی تھا، تب تک جب تک کہ دست مسیحا ان کی چارہ جوئی کے لئے دل تک نہ آ جاتا۔

وہ اپنی محبت کو آزاد چھوڑ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔

عشق مجازی دنیا کا وہ واحد رشتہ ہے جس میں کوئی حق دھونس زور زبردستی اور مان چلتا ہے، نہ بلیک میلنگ۔

اس کی اپنی منزلیں ہیں، اس کا اپنا راستہ ہے، اس کے اپنے سنگ میل ہیں، اس کی اپنی کہکشائیں ہیں، اس کی راہ میں آنے والے پتھر، پھول لگتے ہیں اور آزمائش تحفہ محبت، زخم نشانی محبوب اور ان سے رستا ہوا لہو، میٹھے گھاٹ سے بہنے والے ٹھنڈے شفاف پانی کی طرح...... معطر، ملائم، جس کی پھوار میں تن من ہر وقت بھیگتے رہنے کو چاہیں۔

ان کا دل بھی اس میٹھے گھاٹ سے ابلنے والے ٹھنڈے پانی کی پھوار میں بھیگنا چاہتا تھا، لیکن بدلتے موسموں نے محبت کے جھرنے کا راستہ بھی بدل ڈالا تھا اور گھاٹ تک جانے والی پگڈنڈی بدگمانی کی دھند میں اٹ رہی تھی۔

☆☆☆

بڑی امی کے مسلسل اصرار سے تنگ آ کر انہوں نے کراچی کا قصد کیا تھا، ورنہ حقیقت یہ تھی

کہ ان کا دل کراچی جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

بڑی امی کو ارمان کی رفتہ رفتہ گھر میں بڑھتی مداخلت اور بے تکلفی ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی، جاثم صبح کا گیا شام میں آتا اور آتے ہی کمرے میں بند، یہی حال چھوٹے چچا کا تھا، امی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں، چچی اپنے بچوں میں مصروف۔

ایسے میں ارمان کو آفس سے واپسی پر صرف چھوٹی امی سواگت کے لئے ملتیں، یا بہت کم کبھی کبھار ارمین سامنے ہوتی تو اسے دیکھتے ہی اپنے کمرے میں چلی جاتی، لیکن بڑی امی نے جو منظر اس دن اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے بعد ان کو ارمین کی ارمان کی طرف اٹھتی ہر نگاہ معنی خیز لگتی، رات کے کھانے پر اگر سب جمع ہوتے تو ان کی نگاہ صرف ارمین اور ارمان کی چوکیداری کرتی رہتیں۔

ذرا سی غلط فہمی سے دل میں پھوٹنے والی شک کی کونپل کو وہ خود ہی بدگمانی کا پانی دے دے کر تناور درخت بنا رہی تھیں، ہفتے میں دو بار ضرور شاہان کو فون کر کے کہتیں کہ جلدی سے کراچی آ کر معاملات سنبھال لو، ایسا نہ ہو وقت ہاتھوں سے نکل جائے، شاہان ان کی فون کالز اور شک بھری باتوں سے عاجز آ چکے تھے، دوسری جانب ارمین کا رویہ بھی مبہم سا تھا، وہ فون کرتے تو بھی ریسیو کرتی کبھی نہیں بھی کر پاتی، لیکن اس نے خود سے انہیں کبھی فون نہیں کیا، وجہ چاہے جو بھی ہو، چاہے پہلے کبھی شاہان نے محسوس بھی نہ کیا ہو، لیکن آج انہیں اس کی خاموشی بے طرح کھل رہی تھی، وہ انہیں خود بخود بہت فاصلے پر دکھنے لگی تھی اور وہ یہ فاصلہ ختم کرنا چاہتے تھے، اپنی دور جاتی محبت کو واپس اپنے پاس کھینچ لیتا

چاہتے تھے۔

چند دن پہلے انہوں نے چھوٹی امی کے بڑھاپے کی تنہائی پر ترس کھایا تھا اور اب ان کو اپنی تنہا جوانی سے خوف آ رہا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جوانی میں ہی لوگوں کے لئے قابل رحم بن جائیں۔

اپنے کراچی آنے کے فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے وہ آخری لمحے تک اپنے اس پیغام کے جواب کے منتظر ہی رہے، جو پہلی بار انہوں نے ارمین کے نام لکھا تھا۔

''میں تمہیں یہاں تنہائی میں بہت مس کرتا ہوں ارمین! کیا میں تمہیں لینے کراچی آ جاؤں، کیا تم میری تنہائی بانٹ سکتی ہو؟''

ان کے سیل پر کوئی جوابی پیغام موصول نہیں ہوا، فون خاموش تھا اور خاموش ہی رہا۔

☆☆☆

موسلادھار مینہ برس رہا تھا، رات میں جانے کس وقت دھول مٹی کی تیز آندھی کے بعد بوندیں پڑنا شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش کی شکل اختیار کر گئیں، اس نے شاہان کا میسج بہت دیر رات میں پڑھا تھا، تبھی جواب کل پر اٹھا کر سونے لیٹ گئی تھی۔

جس وقت اس کی آنکھ کھلی بارش پورے زور و شور سے برس رہی تھی، اس نے تیزی سے امی کو جگا کر بتایا۔

''میں چھت پر سے کپڑے اتار کر لاتی ہوں، اب تک تو سب ہی بھیگ گئے ہوں گے۔''

چھت پر قدم رکھتے ہی تیز بوچھاڑ نے اس کا استقبال کیا، وہ لمحوں میں بھیگ گئی، تیزی سے الگنی پر پھیلے کپڑے گھسیٹ کر بازو پر ڈالتے اس نے ایک دوپٹہ کھینچا، دوپٹہ ہٹتے ہی سامنے چھت کی منڈیر پر ارمان بیٹھا نظر آیا، اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا، وہ حرکت نہیں کر سکی۔

وہ سردیوں کی بارش تھی، ٹھنڈی یخ بوندیں جسم میں سوراخ سی کرتی محسوس ہو رہی تھیں، اس قدر یخ بستہ بارش میں ارمان بالکل بے حس و حرکت بھیگ رہا تھا، اپنے جسم پر طاری کپکپی بھول گئی، وہ فراموش کر گئی کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی، رات کا کون سا پہر ہے، کیا موسم ہے اور کیا رشتہ ہے اس کے سامنے بیٹھے شخص سے۔

یاد رہا تو بس یہ کہ کبھی وہ اس شخص کے لئے جیتی اور مرتی تھی، اس کے بازو ڈھلک گئے، سارے دھلے بھیگے کپڑے زمین پر بہتے گندے پانی میں گر گئے۔

جس طرح ارمان بے حس و حرکت اسے دیکھ رہا تھا، ویسے ہی وہ بھی منجمد و ساکت بس یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

فضا میں برستی بارش کے سوا کسی چیز کا شور نہ تھا، آواز نہ تھی، یہ شاید آواز تھی، ان کی جدائی کا نوحہ بڑھتی آواز بارش کی بوندوں میں گونج رہی تھی۔

تڑ، تڑ، تڑ، تڑ..... ایک بارش باہر برس رہی تھی، ایک اس کے اندر ہو رہی تھی، ایک آندھی ذرا دیر پہلے آئی تھی، ایک آندھی چند مہینوں پہلے آئی تھی، اس کے خواب، خواہشیں، آرزوئیں سب پر مٹی دھول پڑ گئی تھی۔

بارش کی بوندیں اس کے سر پر گرتی پھسلتی چہرے سے گردن گردن سے سینے اور سینے سے پیروں تک جا رہی تھیں، زمان و مکان ساکت تھے، وقت ٹھہرا تھا، زندگی رک گئی تھی، حرکت میں تھا تو بس ایک دل یا پھر موسم۔

تبھی سامنے منڈیر سے ٹک کر بیٹھے وجود میں جنبش ہوئی، وہ ویسی ہی کھڑی رہی، پھر وہ وجود ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے سامنے آ ٹھہرا۔

وہ دونوں بنا کچھ کہے بولے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور وہ سوچ رہی تھی۔

یہ چہرہ کبھی اس کے لئے خوشیوں کا ضامن تھا، اس کے مستقبل کا ضامن تھا، اس کے خوابوں کی تعبیر تھا، اس کی زندگی کا مرکز تھا، اس کی سوچوں کا حاصل تھا، پھر...... پھر منظر بدلنے لگا۔

اس نے ارمان کے شانے کے عقب میں کسی اور کو ابھرتے دیکھا، اس نے وہاں ایک نگاہ ڈالی لیکن وہ اپنے حواسوں میں کب تھی، اس کے اوپر تو اس چہرے کا پہرہ تھا۔

جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا آزار بن گیا، سب سے بھاری دکھ، سب سے جاں گسل لمحہ اور سب سے بڑا غم، معاً وہ چونکی۔

جیسے کسی خیال سے جاگی، اس کی نظریں بے خیالی میں یہاں وہاں دوڑیں، پھر ارمان کے عقب میں گئیں، اس کا شانہ خالی تھا، وہاں کوئی نہ تھا، شاید آنے والا جا چکا تھا۔

اس کے حواس جاگ گئے، اس کے اندر نیم مردہ زندگی جاگ اٹھی، اس کی سانسیں، اس کی حسیات، اٹھ بیٹھیں۔

''کیا..... کیا شاہان آئے تھے۔'' وہ لمحہ بھر کے لئے دھیرے سے بڑبڑائی۔

اس پل ارمان نے اس کے بازو تھامے، بہت آہستگی سے، بہت دھیرے سے، وہ ساکت ہوئی۔

''تم..... تمہیں ارمین..... صرف اور صرف ..... شاہان ہی ملا شادی کرنے کے لئے۔''

اسے لگا اس کے بازوؤں کو کسی نے دو انگاروں سے داغ دیا، اس نے یکدم اس کے بازو جھٹکے اور دیوانہ وار نیچے کی طرف بھاگی۔

(مجھے صرف شاہان نہیں، مجھے تم بھی ملے تھے، اب خیال آتا ہے، واقعی صرف وہ ملتے تو اچھا ہوتا)۔

زینہ خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

''شاہان!'' اس نے بے ساختہ پکارا۔

اس کی تیز آواز خالی زینے پر دوسری منزل سے نیچے تک گونجتی چلی گئی، وہاں کوئی نہیں تھا، وہ تیزی سے سیڑھیاں اتری لاؤنج تک آئی لیکن لاؤنج خالی نہیں تھا، لاؤنج بھرا ہوا تھا، وہ آخری سیڑھی پر ذرا کی ذرا ٹھہر گئی۔

وہاں سب ہی موجود تھے، لاؤنج کی ساری لائٹیں روشن تھیں، وہ بھی جو عام دنوں میں نہیں جلائی جاتی تھیں، وہاں بے حد تیز روشنی تھی اور سب لوگ اس طرح کھڑے تھے جیسے چند لمحوں بیشتر کوئی سویا ہی نہ تھا۔

''شاہان آئے تھے، امی شاہان آئے تھے۔'' اس نے سب کچھ نظر انداز کر دیا، وہ روشنی سب لوگوں کی موجودگی، ان کی چبھتی ہوئی نگاہیں، سوال کرتے چہرے سب کچھ، کیونکہ سب کے ہونے کے باوجود وہاں وہ شخص نہیں تھا، جس کے گمان میں وہ اوپر سے بھاگتی ہوئی نیچے آئی تھی اور جس کا انتظار وہ تب سے کر رہی تھی جب سے اس کا میسج پڑھا تھا۔

وہ جواب نہیں دے پائی تھی، اسے حیا آ گئی تھی، کیونکہ اس نے شاہان سے کبھی اس طرح کی باتیں نہیں کی تھیں، وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں آپ کی تنہائی بانٹ لوں گی، آپ آئیں تو سہی لیکن کہہ نہیں سکی تھی، کیونکہ اسے تنہائی بانٹنے کا مطلب پتا تھا، وہ صرف تنہائی نہیں، ان کا سب کچھ بانٹنے کے لئے دل و جان سے تیار تھی، لیکن..... لیکن۔

''وہ آئے تھے امی، لیکن وہ ہیں کہاں؟''

''چلا گیا ہے واپس۔''

''واپس..... کہاں..... کیوں؟'' اسے لمحہ لگا

تھا ایک ایک کا چہرہ دیکھ کر صورت حال بھانپنے میں۔

''انہیں روکیں روکو انہیں جاثم جاؤ تم ہی۔''
وہ بدحواسی سے جاثم کی طرف پلٹی، دفعتاً شزاء نے لاؤنج کا پردہ ہٹا کر جھانکا اور پلٹ کر چلائی۔

''ابھی شانی بھیا باہر نہیں نکلے ارمین آپی، جلدی جائیں، وہ جا رہے ہیں۔'' وہ لمحے بھر میں باہر کی طرف لپکی۔

جاتی سردیوں کی ٹھنڈی ٹھار بارش کی رفتار جوں کی توں تھی، موٹی موٹی بوندیں ایک تواتر سے اسی طرح برس رہی تھیں۔

وہ بیرونی دروازے کے اوپر بنے چھوٹے سے شیڈ کے نیچے کھڑے اپنا سیل فون دیکھ رہے تھے، چمکتی ہوئی اسکرین پر سرخ دوپٹہ اوڑھ کے کھڑی ایک دلہن کی تصویر تھی۔

یہ دلہن ان کی خوابوں کو آباد کرنے والی، ان کی اپنی دلہن کی تصویر تھی، جس کی تصویر انہوں نے اسے وقت دل میں اٹھنے کتنے ہی جذبوں پر بندھ باندھ کر کھینچی تھی، جس وقت انہیں اس دلہن پر پوری دسترس اور حقوق حاصل تھے، جب وہ ان کے لئے جائز کر دی گئی تھی، وہ ان کی محبت تھی، ان کی پسند تھی، ان کا انتخاب تھی اور آج انہیں اپنی پسند اپنے انتخاب پر افسوس ہو رہا تھا۔

کتنے کچے ارادوں کی عورت کو انہوں نے زندگی بھر کا ساتھی چن لیا، جس پر مکمل اختیار رکھتے ہوئے انہوں نے خود کو بے اختیار نہیں ہونے دیا کہ کہیں وقت سے پہلے اپنے جذبوں کے اظہار پر وہ کسی جذباتی یا اعصابی شکست وریخت کا شکار نہ ہو جائے، انہیں اور ان کی محبت کو فقط جسمانی ضرورت کا نام نہ دے دے، آج وہی عورت کسی اور کے پاس کھڑی تھی، جو ان سے نکاح کے بعد نگاہیں نہیں ملاتی تھی، وہ اپنے سابقہ شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی اور وہ بھی طلاق کے بعد۔

چند لمحوں سے زیادہ یہ منظر دیکھنے کی تاب نہیں تھی ان کے اندر، خاص طور پر اس صورت میں جبکہ ارمین نے انہیں دیکھنے کے ان دیکھا کر دیا تھا، ان کے رشتے اور حیثیت پر ایک بار پھر ارمان غالب آ گیا تھا، اس کی موجودگی میں اس نے کس طرح شاہان کو نظر انداز کر دیا تھا، لمحہ لمحہ وہ منظر یاد آ کر ان کی بصارتوں میں، ان کے تخیل میں خنجر سا اتار دیتا ہے۔

وہ شاید انجانے میں کوئی غلطی کر بیٹھے تھے، وہ اپنی محبت پر اندھا اعتماد کر بیٹھے تھے، ایک خالص سچی اور بے لوث محبت کی یہی غلطی ہوتی ہے اور انہیں جو سزا مل رہی تھی، وہ بھی بالکل درست تھی۔

بارش کے قطرے ان کے سیل اسکرین کو بھگو رہے تھے، اسے ناکارہ کر رہے تھے، تصویر کو دھندلا رہے تھے، ان کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، لیکن صرف بارش کی بوندوں سے نہیں، وہ تو چھپر کے نیچے تھے، بارش تو باہر کی طرف ہو رہی تھی، ان کی آنکھیں کسی اور چیز سے بھری تھیں۔

''شاہان!'' معاً انہوں نے اپنے عقب میں آواز سنی۔

وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں پلٹے اور کوئی ہیولہ سا تیزی سے خود کی طرف بڑھتے دیکھا، صحن میں اندھیرا تھا بے حد دھیمی ہلکی بادلوں کی سرخ سرمئی دھند تھی میں انہوں نے بے اختیار دو قدم آگے کی طرف بڑھائے، وہ شیڈ سے باہر نکل آئے تھے پانی کی دھاریں ان پر پھسل رہی تھیں، ہیولا نزدیک آ کے واضح ہوتا گیا۔

وہ کوئی اور نہیں ارمین تھی، جو ان ہی کی طرف آ رہی تھی، ان ہی کی طرح بھیگتی لیکن کانپتی

ہوئی، وہ متعجب اور قدرے خوفزدہ نظروں سے اسے خود سے نزدیک ہوتے دیکھنے لگے، ذہن میں صرف ایک سوال ادھم مچا رہا تھا۔

وہ کیا کہنے آئی تھی، جا کیوں رہے ہیں؟ یا آئے کیوں تھے؟

کیا مانگنے آئی تھی، وصل یا جدائی، کیا دینے کے لئے آئی تھی؟ دھوکہ یا اعتماد، اعتبار، مگر وہ ان سے بالکل قریب فقط ایک قدم کے فاصلے پر آکے رک گئی، بنا کچھ کہے، بنا کچھ بولے، بنا کچھ مانگے، بنا کچھ دیئے۔

اب وہ اسی طرح ان کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے چند لمحے پہلے اور شاہان نے اعتراف کیا۔

ان نظروں میں جو کچھ اب دیکھا تھا، وہ یقیناً انہوں نے تب نہیں دیکھا تھا، ان نظروں میں شکوہ تھا، نفرت تھی، غصہ تھا، شکایت تھی اور ان نظروں میں اضطراب تھا، تڑپ تھی، انتظار تھا، چاہ تھی، حیا تھی۔

چند لمحے یونہی دبے پاؤں بدلی سے برس کر بوندوں کی طرح دونوں کے درمیان سے بہہ کر وقت کے دھارے میں گھل مل گئے، پھر اس کے لب ہلے۔

''آپ شاہان...... آپ...... آپ تو......''
شاہان کا دل سکڑ کر پھیلا، پھر سکڑا، پھر تیز تیز دھڑکنے لگا، سماعتوں میں بصارتوں میں، روم روم میں۔

''آپ تو خود اپنی تنہائی بانٹنے آئے تھے اور مجھے تنہائیوں کے حوالے کر کے جا رہے ہیں۔''

''آہ۔'' کب کی سینے میں تھم کے بیٹھی سانس نے جسم کی دہلیز سے باہر قدم نکالا۔

ان کا منوں بوجھ تلے دبتا ہوا وجود آزاد ہوا، دل پر سے کسی نے ہجر کا بھاری پتھر اٹھایا۔

انہوں نے کوئی جواب دیئے بنا عرش سے برستے پانی کے آبشار کی طرف منہ اٹھایا، پھر دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر آنکھوں میں مچلتی نمی کو بارش کے پانی کے بہانے صاف کیا۔

وہ ابھی تک آنکھوں میں امید و ہراس کے پردے کی اوٹ لے کر انہیں دیکھ رہی تھی، انہوں نے کھل کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور دونوں بازو کھول دیئے، ارمین نے ان کے چوڑے سینے کے گرد بازو لپیٹے اور اپنا سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

میں رنگ شربتوں کا تو میٹھے گھاٹ کا پانی
مجھے خود میں گھول دے تو میرے یار بات بن جانی

شربتوں کے رنگ میں، میٹھے گھاٹ کا پانی گھل رہا تھا، کبھی جدا نہ ہونے کے لئے، دور اوپر منڈیر سے کسی نے بارش کے قطروں کی اوٹ سے من کا موسم دیکھا اور دل میں تاسف، پچھتاوے اور ندامت کے رنگ لئے پیچھے ہٹ گیا، آج شاہان کی تنہائی ختم ہو گئی تھی، دل کی بنجر پڑی سرزمین پر محبت کا جھرنا پھوٹ پڑا تھا۔

☆☆☆

چوتھی قسط

فرحت شوکت

خود کو بھلانے کی سعی میں وہ بزنس میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہا تھا اور وہ ایسا کیوں کر رہا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا مگر اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش میں غلطاں تھا۔

اسے اپنی زندگی میں کوئی خوبصورتی ہی محسوس نہیں ہوئی تھی جس کی بناء پر وہ زندگی کو پہلے کی طرح بھرپور طریقے سے جینے کی خواہش کرتا۔

بالکل بے معنی سی زندگی ہو کر رہ گئی تھی اس کی، بے مقصد دن تھے اور بے مقصد راتیں تھیں جن میں نہ کوئی موسم تھا نہ کوئی کشش تھی، اسے نہ لوگوں میں دلچسپی رہی تھی نہ ہی لوگوں کے

ناولٹ

معاملات سے، اس کا سرکل جہاں بہت محدود تھا وہ اب بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

''تم ابھی تک جاگ رہے ہو بیٹا؟'' اس وقت رات کے دو بجے تھے، وہ ٹی وی لاؤنج میں بری طرح گم تھا جب صبور آنٹی کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر ایک نظر انہیں دیکھا پھر سر جھکا گیا اور گویا ہوا۔

''جی آفس کا کچھ کام تھا بس وہی کمپلیٹ کر رہا تھا۔'' انہیں جواب دے کر وہ دوبارہ تیزی سے قلم چلانے لگا تو وہ اس کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھیں اور بغور اسے دیکھنے لگیں جو روز بروز بہت کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

''اتنا کام مت کرو بیٹا، اپنی صحت کا بھی خیال رکھو بہت ویک ہو رہے ہو لگتا ہے کھانا بھی وقت پر نہیں کھاتے اور نہ نیند پوری کرتے ہو، کیا روز رات کو اسی طرح دیر تک جاگتے ہو؟'' ان کے سوال پر وہ خاموش ہی رہا، انہیں کیا بتاتا کہ نجانے کتنی راتوں سے نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔

''تم نے سبرین کے متعلق کچھ سوچا بیٹا؟''

اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے قدرے جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا مبادا اسے برا نہ لگ جائے۔

''جی نہیں۔'' ان کے سوال پر اس نے مختصر جواب دیا۔

''پلیز بیٹا ایسے مت کرو، آخر کب تک انکار کرو گے کل کو کسی نہ کسی سے شادی تو کرنی ہی ہے ناں تو پھر سبرین کیوں نہیں، تم ایک بار، صرف ایک بار اس سے مل کر دیکھ لو اگر تمہیں پسند نہ آئی تو آئی پرامس بیٹا میں دوبارہ اس کا نام تک نہیں لوں گی تمہارے سامنے۔''

گزرتے وقت کے ساتھ ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور وہ مسلسل انکار کیے جا رہا تھا لیکن اب...... وہ بھی کیا کرتا جسے خود نہیں پتہ تھا کہ وہ کب تک ہر کسی کو رد کرتا رہے گا اور کیوں؟ کیونکہ وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس کا سانس اب اکھڑنے لگا تھا اور جسم نڈھال سا رہنے لگا تھا، یوں جیسے جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی نکلتی جا رہی تھی، وہ جتنا اس سے دور ہونے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ اس کے اندر اترتی جا رہی تھی۔

اس نے اسے کبھی پانے کی چاہ نہیں کی تھی اور نہ کرنا چاہتا تھا کہ ایسی صورت میں وہ اس کی نظروں میں بے اعتبار ہو جاتا وہ بھی ہمیشہ کے لئے اور پھر...... وہ اسے کھو دیتا اور اسے کھونے کا حوصلہ ہی تو نہیں تھا اس میں۔

''کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟'' اسے مستقل خاموش دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا تھا جس کے چہرے پر نجانے کیسا کرب تھا جس میں وہ اندر تک تڑپتا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ جانتی تھیں وہ ان سے بھی کچھ نہیں بتائے گا سو چپ ہی رہیں۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور پھر دوبارہ فائل پر نظریں مرکوز کر دیں۔

''پلیز بیٹا ایک بار سبرین سے مل لو پھر دوبارہ کبھی نہیں کہوں گی، زندگی کو تنہا گزارنا بہت مشکل ہے بہت تکلیف ہوتی ہے اکیلے جینے میں۔'' اتنا کہہ کر صبور آنٹی اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دبانے کی کوشش کرنے لگا مگر درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، یکدم اس نے سر صوفے کی پشت پر گرا لیا اور اپنی بے بسی پر تلخی سے مسکرا اٹھا۔

کیا کرتا وہ اپنے سینے میں دھڑکتے دل کا جو صرف اسی کا ہو کر رہنے پر مصر تھا، کیا کرتا وہ جسے پوری دنیا میں ایک وہی عورت بھائی تھی، کیا کرتا وہ جسے کسی تکلیف میں نہ دیکھنے کی خاطر خود اذیت برداشت کیے جا رہا تھا، اس کی ذات کی نفی اور وجود کو مسلسل نظر انداز کرنے کی کوشش کیے جا رہا تھا اور وہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کر رہا تھا۔

وہ خود کو کسی دلدل میں پھنسا محسوس کر رہا تھا جتنا ہاتھ پاؤں مارتا مزید پھنستا جا رہا تھا، وہ خود بھی اس سے باہر نکلنا چاہ رہا تھا مگر پہلے سے زیادہ پھنسا محسوس کر رہا تھا، وہ جس اذیت میں بتلا تھا اس اذیت سے اس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

وہ تو بالکل پہلے کی طرح اس سے ملتی تھی، بات کرتی تھی، خیال رکھتی تھی لیکن وہ بالکل بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا اس کے احساسات اس کی سوچ اس کا رویہ سب بدل گیا تھا، تبدیلی اس کے اندر آئی تھی اور وہ اپنے اندر کی اس تبدیلی کی سزا اسے دینا نہیں چاہتا تھا اسی لئے اس سے دور رہنے سے گریز کرتا کہ اگر قریب رہا تو شاید سب کچھ ختم کر دے تمام ضبط اور تمام حدیں۔

☆☆☆

آج انعم اور عباد کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا، آج انعم رخصت ہو کر عباد کے گھر آ رہی تھی، تمام انتظامات انعم کے گھر پر ہی کیے گئے تھے، ریفرشمینٹ کے بعد انعم اور عباد کو اسٹیج پر لایا گیا تھا، جہاں ان کے اردگرد سب بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے جب اسٹیج پر انعم اور عباد سے ملنے کے لیئے آنے والے مہمانوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا، وہ انعم سے گلے مل کر اسٹیج سے نیچے اتر آئی، اسی اثناء میں اس کا پاؤں اسٹیج کے آخری اسٹیپ پر رکھتے ہوئے اتنی بری طرح مڑا کہ وہ گرتے گرتے بچی تھی اور یہ وہی لمحہ تھا جس وقت وہ گرنے لگی تھی تو ایک مضبوط ہاتھ میں اس کا نازک سا ہاتھ قید ہو گیا تھا جس وجہ سے وہ محض لڑکھڑائی تھی اور گرنے سے بچ گئی تھی۔

اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے اس کے دل کی حالت یکسر تبدیل ہو گئی تھی، وہ اس سے محض بالشت بھر کے فاصلے پر تھی یعنی وہ اس کے اتنی قریب تھی کہ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو آنکھوں کے رستے دل میں اترتا محسوس کر رہا تھا، اس کے ہاتھوں کا نرم سا لمس اور اس کی قربت کا احساس اسے ہر شے سے بے نیاز کر رہا تھا، بے اختیار سانس روکے وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا، اس لمحہ وہ سب کچھ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس کے سامنے ہے، وہ صرف اریج عباس ہی نہیں بلکہ اس کی سب سے عزیز دوست بھی ہے۔

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا جب احساس ہو جانے کے باوجود اس کا ہاتھ اب تک اس کے ہاتھ کی گرفت میں تھا، اس کے اندر سنسنی سی دوڑ رہی تھی، جو اسے خود سے بھی بیگانہ کر رہی تھی، لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس کا ہاتھ اپنے

ہاتھ سے آزاد نہیں کر پا رہا تھا، اسے عجیب سا قرار مل رہا تھا، سکون مل رہا تھا، ایسے جیسے کسی پیاسے کو ایک بوند مل جاتی ہے اور وہ جی اٹھتا ہے موت کو بھلا کر۔

اسے بھی گویا زندگی مل رہی تھی اس کی قربت اس کے اندر کے جلتے ایندھن کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

تیز تیز چلتی دھڑکنوں کا تلاطم تھم گیا تھا وجود پر بکھری تھکان اب قدرے کم ہو رہی تھی، کتنا اثر تھا اس کی قربت میں کہ وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہا تھا، نجانے وہ کتنی لمبی مسافت طے کر کے آیا تھا کہ اس ایک لمحے نے اس کی تمام بے چینی اور بے سکونی کو ختم کر ڈالا تھا اس کے اندر کی۔

"تھینکس ہنید اگر تم نہ ہوتے تو میں بہت بری طرح گرتی۔" ایک لمحہ میں وہ کتنے برسوں کی زندگی جی آیا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

"تم نے ہمیشہ اسی طرح قدم قدم پر میری ہر مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا ہے ہنید تم بہت اچھے دوست ہو، میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے تم جیسا دوست دیا۔"

نجانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھی بس اتنا پتہ تھا کہ وہ اسے مار رہی ہے اندر تک ختم کر رہی ہے اس پر اعتبار کر کے، اس پر یقین کر کے اور وہ......

وہ کتنے آرام سے اس کا بھروسہ توڑنے جا رہا تھا، وہ بھروسہ جس کا اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کبھی بھی نہ توڑنے کا، وہ کیا کر رہا تھا اپنے ساتھ، اس کے ساتھ؟ بہت کچھ ختم کرنے جا رہا تھا وہ، اگر اسے اس پل ذرا سی بھی شک ہو جاتا تو شاید وہ اسے اسی لمحے ہمیشہ کے لئے کھو دیتا، اس نے اگلے ہی پل بنا کسی تاخیر کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کی قید سے آزاد کر دیا گویا اس سے کوئی جرم ہو گیا بہت بڑا جرم۔

انعم کو رخصت کر کے عباد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا دیا گیا تھا، اریج اور زیاد انہیں سی آف کر رہے تھے جبکہ وہ گیٹ کے پاس ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ کھڑا تھا، وہ سب کو گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوتے دیکھ رہا تھا لیکن خود ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہیں تھا۔

"ہنید کم آن یار ہم بھی چلتے ہیں۔" زیاد کی آواز پر اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوری یار میں، میں عباد کے گھر نہیں جا سکتا تم لوگ چلے جاؤ۔" اس کا لہجہ انتہائی کمزور تھا۔

"کیوں، کیوں نہیں جا سکتے تم؟" وہ اس کے سامنے سوالیہ انداز میں آ کھڑی ہوئی۔

"مجھے آفس کے ایک ضروری کام سے لاہور جانا ہے آدھے گھنٹے بعد میری فلائیٹ ہے۔"

پتہ نہیں کیوں وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا اس کی طرف دیکھ کر بات کرنا اس سے دشوار ہو رہا تھا۔

"تم نے لاہور جانا ہے اور تم اب بتا رہے ہو؟" زیاد بھی شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں یار مجھے ابھی ابھی آفس سے کال آئی ہے وہاں کوئی پرابلم ہو گیا ہے اس لئے مجھے جانا ہو گا۔" زیاد سے گلے مل کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تو وہ دونوں بھی عباد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"بیٹا اتنا ضروری تو نہیں تھا آج جانا تم کل بھی جا سکتے تھے۔" اسے یوں اچانک لاہور کے لئے جاتا دیکھ کر صبور آنٹی نے حیرت سے کہا۔

"نہیں آج بہت ضروری ہے میں کل واپس آ جاؤں گا۔"

پتہ نہیں وہ خود سے فرار چاہ رہا تھا یا واقعی

اس کا جانا اتنا ہی ضروری تھا جتنا وہ بتا رہا تھا، اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔"

☆☆☆

''ازاٹ رئیلی آنٹی؟'' بھرپور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہ آنٹی کے گلے جا لگی۔

''ہاں بیٹا اور میں بتا نہیں سکتی میں کتنی خوش ہوں ایسے لگ رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ میرے کندھوں سے اتر گیا ہو۔'' فرط جذبات سے صبور آنٹی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

''ارے یہ کیا اتنی بڑی خوشی ملی ہے اور آپ آج بھی رو رہی ہیں بہت غلط بات ہے آنٹی۔'' وہ بڑے پیار سے ان کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے لاڈ سے بولی تو وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں بیٹا۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''آپ کو بہت بہت مبارک ہو آنٹی لیکن میں ہدید کو چھوڑوں گی نہیں، اس نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی ہے بلکہ میں ابھی جاتی ہوں اس کے آفس اور اس کی خوب اچھی طرح خبر لیتی ہوں۔'' وہ ٹیبل پر رکھی اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھائے صبور آنٹی سے گلے مل کر باہر نکل آئی اور پھر بیس منٹ بعد ہی وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو راز رکھو گے۔'' وہ اپنی سیکرٹری کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا جب وہ سیدھی اس کے آفس میں جا پہنچی تھی۔

''آپ باقی تمام تفصیلات اکبر صاحب کو سمجھا دیجئے گا میں کچھ دیر تک آپ کو کال کرتا ہوں۔'' اسے یوں اچانک اپنے آفس میں دیکھ کر اس نے فوراً سیکرٹری کو ہدایات دیں پھر اس کے جاتے ہی سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگ گیا۔

''کیا ہوا اتنے غصے میں کیوں ہو؟'' اس کی طرف زیادہ دیکھنا اسے محال لگ رہا تھا اسی لئے فوراً اس پر سے نظریں ہٹا کر ٹیبل پر رکھی فائل پر جما دیں۔

''دو دن بعد تمہاری انگیج منٹ ہے اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تم سبرین کو پسند کرنے لگے ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' وہ بظاہر غصہ کر رہی تھی مگر اس کے ہر انداز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

''بس سب کچھ بہت اچانک ہوا مجھے خود بھی پتہ نہیں چلا کہ کب سب کچھ طے پا گیا۔'' وہ حتی الامکان اسے دیکھنے سے گریز کر رہا تھا، اسی لئے مسلسل لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''اٹس اوکے، چلو یہ بتاؤ سبرین سے ملے ہو، کیسی ہے وہ؟'' تمام ناراضگی بھلائے بڑے اشتیاق سے اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں سبرین سے نہیں ملا۔'' اس نے آرام سے بتایا۔

''وہاٹ؟'' کتنی ہی دیر تک وہ شدید حیرت کے عالم میں اسے دیکھتی رہی پھر دوبارہ گویا ہوئی۔

''کیا مطلب ہدید، تم ایسی لڑکی سے منگنی کرنے جا رہے ہو بلکہ ساری زندگی گزارنے جا رہے ہو جس کو تم نے دیکھا تک نہیں ہے، اوہ مائی گاڈ اٹس مین تم تو بہت مشرقی لڑکے ثابت ہوئے ہو۔'' بات کرتے کرتے اسے ہنسی آ گئی تھی مگر وہ ضبط کر گئی۔

''چائے لو گی یا کافی؟'' اس کی بات کو مکمل نظر انداز کر کے اس نے انٹرکام کان سے لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''چائے کافی کچھ نہیں، میں نے کھانا کھانا ہے تمہارے ساتھ وہ بھی کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں، پھر پتہ نہیں اپنی منگنی کے بعد تم مجھے یاد بھی رکھ پاؤ گے یا نہیں کیونکہ تم تو بزنس جوائن کر کے ہی بھول گئے ہو تو شادی کے بعد پتہ نہیں کیا کرو گے، لیکن میں بھی تمہیں بتا رہی ہوں اگر تم مجھ سے دور ہوئے، تو میں بھی تمہیں کبھی نہیں ملوں گی۔'' اس کا انداز دھمکی آمیز تھا جواباً کچھ نہ بولا۔

''ابھی میری ایک امپورٹنٹ میٹنگ ہے اس وقت بہت مشکل ہے کہیں جانا ہے لیکن کھانا مجھ پر ڈیو ہے میں پھر کسی دن کھلا دوں گا اوکے؟'' اس نے وجہ بتائی تو فوراً مان گئی تھی۔

''اوکے پھر چائے پلا دو۔'' اس کے کہنے پر اس نے چائے آرڈر کر دی اور زیادہ سے زیادہ خود کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ وہ اکتا کر چلی جائے۔

وہ اس سے مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی جبکہ وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فائل کھولے بیٹھا تھا۔

''میرا بہت دل کر رہا ہے سبرین سے ملنے کو، پتہ نہیں وہ کیسی ہو گی تمہاری اور میری دوستی کو سمجھ پائے گی یا نہیں؟ لیکن میں اس کو بھی اپنی دوست بنا لوں گی تم دیکھنا۔'' وہ اپنے خدشے خود بتا رہی تھی اور خود کو مطمئن بھی کیے جا رہی تھی۔

''ہدید پلیز کیا ہر وقت فائلوں میں گھسے رہتے ہو تم مجھ سے بات نہیں کر سکتے کیا؟'' اس کے سامنے سے فائل اٹھا کر بند کرتے ہوئے اس نے خفگی سے کہا۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ کتنا خوفزدہ تھا کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس نہ دیکھ لے۔

''ایسا کچھ نہیں ہے یار تمہیں پتہ تو ہے آفس کا کتنا کام ہوتا ہے۔'' وہ کمپیوٹر آن کرتے ہوئے بولا۔

''دیٹس ناٹ فیئر ہدید۔'' اس نے ناگواری سے کمپیوٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار پلیز اریج میں کہا ناں آج امپورٹنٹ میٹنگ ہے اس کے لئے ایک اسائنمنٹ تیار کر رہا ہوں مائنڈ مت کرو۔'' کمپیوٹر اسکرین پر مسلسل نظریں جمائے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو وہ سمجھنے والے انداز میں گویا ہوئی۔

''ہوں آئی نو یہ کام بھی بہت ضروری ہے بٹ میرا بہت دل کر رہا ہے آج تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو، کیا کروں؟ اچھا یہ بتاؤ تم اسی وقت گھر کیوں آتے ہو جب میں گھر پر موجود نہیں ہوتی پرسوں بھی تم گھر آئے اور میرا ویٹ کیے بغیر چلے گئے؟''

''ہاں میں جلدی میں تھا اس لئے انتظار نہیں کر سکا تھا اور ہاں میں نے ڈاکٹر سے انکل کا ٹائم لیا ہے انہیں نیکسٹ ویک چیک اپ کے لئے لے کر جانا ہے یاد رکھنا اور مجھے بھی یاد دلانا میں انہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' وہ بالکل عام سے لہجے میں اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے اندر گویا ایک طوفان بپا تھا جو اسے دیکھتے ہی شروع ہوا تھا اور اب تک تھما نہیں تھا۔

''تھینکس ہدید، تم کتنے اچھے ہو ناں، میرا کتنا خیال رکھتے ہو، سچ اگر تم نہ ہوتے تو کون یہ سب دیکھتا، مجھے تو کچھ بھی نہیں پتہ کہ کون سا کام کیسے ہوتا ہے، تم نے میری زندگی کی سب سے بڑی کمی کو پورا کیا ہے ہدید، یو آر گریٹ۔'' اس

نے تشکر آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
''اب ایسا بھی کچھ نہیں ہے تم تو شرمندہ کر رہی ہو مجھے۔'' وہ اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔
''اچھا تم مائنڈ نہ کرو تو مجھے ایک میٹنگ کے لیے جانا تھا۔'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا کہیں اسے برا نہ لگ جائے مگر صد شکر تھا کہ وہ بالکل بھی برا نہیں مان رہی تھی۔
''اوہ ہاں میں تو بھول ہی گئی کہ تم نے میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے، میں بھی چلتی ہوں حرا کی بکس ایشو کرانی ہیں لائبریری سے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
اس کے آفس سے نکلتے ہی وہ دوبارہ اپنی چیئر پر بیٹھ گیا اور اپنے آپ کے بارے میں سوچنے لگا جو اب اس کا سامنا کرنے سے اتنا کترانے لگا تھا کہ پے در پے جھوٹ بولنے لگا تھا۔
وہ شدید تاسف میں گھرا ہوا تھا جو اس سے نہ ملنے کی خاطر بہانے گھڑنے لگا تھا۔ آج بھی اسے کسی میٹنگ میں نہیں جانا تھا، اس کا سامنا نہ کرنے کی خاطر وہ جھوٹ بولنے لگا تھا وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔
پھر کیا کرے وہ، کیسے دور رہے اس سے کہ جب وہ پاس آتی تھی تو اس کے دل کی حالت بدلنے لگتی تھی اس کا روم روم کھڑا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں اسے دیکھنے کے بعد واپس پلٹنا بھول جاتی تھیں اور ایسے میں وہ ڈر جاتا تھا کہ کہیں وہ اس کے کسی احساس کو محسوس کر کے بدظن نہ ہو جائے اور اسی کوشش میں وہ اسے بہت زیادہ نظر انداز کرنے لگا تھا اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔

☆☆☆

صبور آنٹی کی خواہش تھی کہ منگنی کی تقریب کا اہتمام پہلے ان کے گھر پہ ہوگا پھر مسز نعمان اپنے گھر پہ رسم کریں گی جس پر مسز نعمان بہت خوش تھیں جو اتنے ارمان اور چاؤ سے سبرین کو اپنی بہو بنا رہی تھیں۔
منگنی کی تمام تیاریاں ان سب نے صبور آنٹی کے ساتھ دل کھول کر کی تھیں، صبور آنٹی کی خوشی کی تو کوئی انتہا نہ تھی، وہ تو جیسے اپنی پوری زندگی اس وقت کی منتظر تھیں لہٰذا تمام ارمان آج ہی پورے کر لینے پر مصر تھیں۔
پورے گھر کو ننھے ننھے برقی قمقموں اور تازہ خوبصورت پھولوں سے سجایا گیا تھا، کشادہ بدن میں تقریب کا اہتمام بڑے پروقار انداز میں کیا گیا تھا، مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، مختلف دلفریب خوشبوئیں فضا میں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔
سب کچھ بے حد اچھا لگ رہا تھا ہر چہرہ کھلا کھلا دکھائی دے رہا تھا، وہ سب اس کے اس اچانک فیصلے پر جہاں بہت خوش تھے وہیں حیران بھی تھے جس نے ان سب کو سبرین سے منگنی کرنے پر حیرت میں ڈال دیا تھا ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ شادی کے نام سے بھی بھاگ رہا تھا اور اب یوں ایک دم سے شادی کے لیے راضی ہو جانا ان کے لیے حیران کن تھا۔
''آنٹی ہنید کہاں ہے اب تک نہیں آیا؟'' زیاد نے استفسار کیا۔
''میری اس سے فون پہ بات ہوئی ہے بس ابھی آنے والا ہے تھوڑی دیر تک۔'' صبور آنٹی کے لہجے سے خوشی چھلکتی جا رہی تھی، آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ گریس فل اور خوبصورت لگ رہی تھیں اندر کی خوشی ان کے ہر ہر انداز سے نمایاں ہو رہی تھی۔

''مسز نعمان اپنی پوری فیملی کے ساتھ آ چکی ہیں سبرین بھی پارلر سے آنے والی ہے تم لوگ تمام ارینج منٹس کو فائنل ٹچ دے دو میں ان کے پاس جا رہی ہوں او کے؟'' انہیں ہدایت دے کر وہ ان کی طرف بڑھ گئیں تو وہ سب تمام انتظامات دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

سبرین پارلر سے آ چکی تھی، پورا لان رنگ و خوشبو سے مہک اٹھا تھا، صبور آنٹی نجانے کتنی بار اس کی بلائیں لے چکی تھیں، وہ تھی ہی اتنی پیاری کہ جس نے دیکھا وہ عش عش کر اٹھا تھا۔

ہدید کی پسند کو وہ سب بھی مان گئے تھے اور بار ہا تعارف بھی کرا چکے تھے، سبرین عادتاً نرم واقع ہوئی تھی اس سے مل کر ان سب کو حقیقتاً بہت خوشی ہوئی تھی جو جلد ہی ان کے گروپ کا حصہ بننے والی تھی۔

''عباد تمام مہمان آ چکے ہیں، مگر ہدید کا کچھ پتہ نہیں ہے رسم شروع ہونے والی ہے میں کب سے اسے فون کر رہی ہوں مگر وہ یہی کہے جا رہا ہے کہ آ رہا ہوں لیکن دیکھو ابھی تک نہیں آیا، آج آفس جانا ضروری تو نہیں تھا ناں۔'' صبور آنٹی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

''آپ فکر نہ کریں آنٹی میں اسے کال کرتا ہوں وہ ابھی آ جائے گا۔'' انہیں تسلی دیتے ہوئے عباد نے اس کا نمبر بھی ملا ڈالا تھا۔

''ہدید جلدی آ جاؤ یار یہاں سب لوگ تمہارا ویٹ کر رہے ہیں، پلیز کم فاسٹ۔'' عباد نے فون آف کر کے صبور آنٹی کو اس کے آنے کا بتایا تو وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھیں، مگر جب آدھے گھنٹے بعد بھی وہ نہیں آیا تو صبور آنٹی سمیت سب نے اس سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا، اگلے دو گھنٹوں تک بالکل واضح ہو گیا تھا کہ اسے تو آنا ہی نہیں تھا تب ہی وہ حیلے بہانے کر رہا تھا۔

اس کے انتظار میں وہ سب گیٹ پر ہی کھڑے تھے جبکہ صبور آنٹی گھر میں موجود تمام مہمانوں کو ان کے سوالوں کے جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔

زیاد اس کے آفس بھی گیا تھا مگر وہ وہاں بھی موجود نہیں تھا، تشویش اپنی جگہ مگر اس پر ان سب کو بے حد غصہ بھی آ رہا تھا جس نے آج انتہائی غیر اخلاقی حرکت کی تھی۔

''سوری مسز روحان ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ اپنے گھر پر انوائیٹ کر کے ہمیں اس طرح سب کے سامنے ذلیل کرائیں گی، اگر آپ کے بیٹے کو میری بیٹی سے منگنی نہیں کرنی تھی تو یہ سب ڈرامہ کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی، ہم نے کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی آپ لوگوں کے ساتھ۔'' مسز نعمان کا ضبط بالآخر جواب دے گیا تھا وہ اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بول رہی تھیں جو ان کا حق بھی تھا۔

''پچھلے چار گھنٹوں سے آپ مسلسل اس کے آنے کا عندیہ دیئے جا رہی ہیں، کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کا بیٹا یہ منگنی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا، آپ خود سمجھدار ہیں پھر ہمیں دھوکے میں رکھنا آپ کو زیب دیتا تھا؟'' مسز نعمان کی باتوں کے ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھے لہٰذا وہ خاموش کھڑی رہیں۔

مسز نعمان اپنے تمام مہمانوں کو ساتھ لئے وہاں سے رخصت ہو گئی تھیں، گھر یکدم بالکل خالی ہو گیا تھا۔

شرمندگی کے احساس نے انہیں اندر تک توڑ ڈالا تھا، وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں، اتنے سارے لوگوں کے سامنے جو خفت انہیں اٹھانا پڑی تھی اس

نے انہیں مار ڈالا تھا۔

وہ بالکل نڈھال سی صوفے پر گر گئی تھیں، ان کا بلڈ پریشر نہایت لو ہو گیا تھا سفید پڑتی رنگت ان کی اندرونی کیفیت کو ظاہر کر رہی تھی۔

''آنٹی، آنٹی آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' وہ سب فوراً ان کی طرف لپکے تھے۔

ان کے ہاتھ برف کی مانند ٹھنڈے پڑ رہے تھے وہ سب گھبرا اٹھے تھے، ان کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہہ کر چہرے پر پھیل رہے تھے۔

''آنٹی پلیز آپ تھوڑا سا کھانا کھا لیں، صبح سے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔'' اریج چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر انہیں کھلانے لگ گئی جبکہ انعم ان کا سر دبانے لگ گئی۔

''بس بیٹا تم سب کا بہت بہت شکریہ میں اب اپنے کمرے میں جاؤں گی، تم سب بھی جا کر آرام کرو سارا دن سے کاموں میں لگے ہوئے ہو تھک گئے ہو گے۔'' وہ باری باری سب کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے کمرے میں جانے کے بعد وہ سب وہیں لاؤنج میں اس کے انتظار میں صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

وہ چاروں بالکل خاموش تھے گویا کسی کے پاس کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں، اس وقت رات کے دو بجے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔

لاؤنج میں ان سب کو دیکھ کر وہ بالکل حیران نہیں ہوا تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ اگر صبح بھی گھر میں آتا تو ان سب کو اپنے انتظار میں وہیں بیٹھے پاتا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس کی پہلی نظر اس دشمن جاں پر پڑی تھی اور اس کا دل یکبارگی سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا، اس نے اگلے ہی لمحہ اس سے نظر پھیر لی تھی، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا صوفے پر جا بیٹھا تھا۔

''سوری۔'' قدرے توقف کے بعد اس کی دھیمی آواز نے لاؤنج میں پھیلی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔

''ہم سے سوری کیوں کر رہے ہو یار ہمیں تو اس ذلت کا سامنا کرنا نہیں پڑا جس کو صبور آنٹی نے فیس کیا تھا۔'' عباد کا لہجہ خود بخود تلخ ہو گیا تھا جواباً وہ خاموش ہی رہا تھا۔

''یار تمہیں کسی نے فورس تو نہیں کیا تھا پھر اس طرح یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی تم صبور آنٹی کو انکار کر دیتے تو یقیناً وہ بھی برا نہ مانتیں۔'' زیاد نے کہا۔

''آج صبور آنٹی کی جو حالت ہوئی تھی اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو اس کے ذمہ دار تم ہوتے ہنید۔'' اریج کی بات پر اس نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے باری باری سب کو دیکھنے لگا گویا اس کی بات کی تصدیق چاہ رہا ہو۔

''تم نے ایسا کیوں کیا ہنید، کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟'' انعم کی بات پر اس کا دل جکڑنے لگا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے میں بس سبرین سے کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے۔''

''تو نہ کرتے ناں یار، لیکن پہلے انکار کر دیتے ان لوگوں کو اس طرح تماشا لگانے کی کیا ضرورت تھی؟'' عباد کو اس کی بات پر غصہ آ گیا تھا، وہ بس چپ ہی رہا۔

تھوڑی دیر بعد سب جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اب وہ اکیلا رہ گیا تھا۔

پتہ نہیں اس نے آج ایسا کیوں کیا تھا؟ وہ

خود بھی نہیں جانتا تھا۔

کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہ شکستہ قدموں سے چلتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا مگر نجانے کس خیال کے تحت وہ صبور آنٹی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

وہ ریوالونگ چیئر پر اضطراری انداز میں نیم دراز تھیں جبکہ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا، اس نے ربانہ گیا اور وہ ان کے پاس رکھی چیئر پر جا بیٹھا۔

وہ نہایت آہستگی سے بغیر آہٹ کیے کمرے میں داخل ہوا تھا لیکن پتہ نہیں کیسے انہیں اس کی آمد کا احساس ہو گیا تھا انہوں نے فوراً آنکھیں کھول لی تھیں اور اپنے دائیں جانب اسے بیٹھے دیکھ کر مزید بے چین ہو گئی تھیں، شدید پشیمانی کے عالم میں اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''بعید!'' ان کے لہجے میں بیقراری تھی اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر دیکھتا چلا گیا۔

چند گھنٹوں میں ان کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا وہ صبح تک بالکل فریش تھیں اور بے حد خوش، یہ اس نے کیا کر دیا تھا؟ وہ شرمسار سا ہو کر رہ گیا تھا۔

''میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے مجھے، مجھے معاف کر دیں۔'' وہ حقیقتاً بہت پریشان ہوا تھا ان کی حالت دیکھ کر۔

''نہیں بیٹا ایسے مت کہو۔'' انہوں نے اضطراری کے عالم میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں بہت برا ہوں سب کو کوئی نہ کوئی تکلیف پہنچاتا رہتا ہوں، لیکن میں کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کرتا۔'' وہ اس وقت بالکل اس چھوٹے بچے کی مانند دکھائی دے رہا تھا جو غلطی کرنے پر سزا کے لئے خود کو پیش کرتے ہوئے گھبرایا ہوتا ہے۔

وہ واقعی بے حد الجھا الجھا سا دکھائی دے رہا تھا جیسے اپنے آپ سے جنگ کر کے آ رہا ہو، اس کے وجود سے چھلکتا اضطراب اس کے اندر کی شکستگی کو نمایاں کر رہا تھا، بہت ہارا ہوا اور خود سے لڑا ہوا وہ بے حد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا گویا ایک لمبا اور طویل سفر طے کر کے آیا ہو جس کی تھکان اس کے رچی نظر آ رہی تھی۔

ان سے اس کی یہ حالت ہرگز دیکھی نہیں جا رہی تھی ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لمحہ میں اس کی تمام تکلیف کو اس کے وجود سے نوچ کر کہیں دور پھینک آئیں اور اپنی ممتا سے اس کے سارے زخموں پر نرم پھائے رکھ دیں مگر اس نے انہیں یہ حق دیا ہی نہیں تھا۔

''کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ بیٹا۔'' اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے محبت سے کہا تو اس کا دل یکدم بھر آیا تھا، اس لمحے اسے کسی بہت اپنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس کے آگے وہ اپنا دل کھول کر رکھ دیتا اور چند لمحوں کے لئے ہی سہی مگر وہ پرسکون تو ہو جاتا مگر......

''اریج سے محبت کرتے ہو ناں؟'' ان کی بات پر اس نے ایک جھٹکے سے انہیں دیکھا، اس کے نام پر اس کے دل کی دھڑکن جیسے رک ہی گئی تھی۔

جو بات وہ خود سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا تھا وہ ان کے منہ سے سن کر ششدر رہ گیا تھا، وہ انہیں کوئی بھی جواب نہیں دے پا رہا تھا، اس نے تو اپنا ہر جذبہ بہت سنبھال کر رکھا تھا پھر انہیں کیسے خبر ہو گئی تھی؟

''میں بہت پہلے سے جانتی ہوں بیٹا کہ تم اریج کو پسند کرتے ہو تمہاری آنکھوں میں، میں نے کئی بار اس کا چہرہ پڑھا ہے اور میں کب سے

چاہتی تھی کہ تم شادی کے لئے اس کا نام لو لیکن ہر بار تمہارے انکار پر مجھے لگتا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مگر تمہارا اس کے ساتھ بدلتا رویہ میرے یقین کو مضبوط کر دیتا تھا مگر میں محض قیاس آرائی پر تمہارے اور اس کے درمیان موجود دوستی کے رشتے کو کوئی اور نام نہیں دے سکتی تھی، میں منتظر تھی کہ شاید تم کبھی اس کا نام لو لیکن تمہاری مستقل خاموشی اور پھر سبرین کے لئے ہاں کر دینے کو میں اپنا وہم سمجھ کر بھول گئی تھی مگر آج، آج تمہارے اس طرز عمل سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم واقعی اریج کو چاہتے ہو اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

وہ نہایت محبت سے اس کے الجھے وجود کی طرح الجھے بالوں کو اپنی پر مشفق انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے پورے وثوق کے ساتھ بول رہی تھیں گویا اس کی تمام الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا جنہوں نے بغیر کہے ان کے دل کی بات جان لی تھی، ان کی آنکھوں میں آنسو در آئے تھے۔

"تمہاری ماں ہوں بیٹا، تمہاری سوچ تک کو پڑھ لیتی ہوں، بہت محبت کرتی ہوں تم سے، اسی لئے تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی، بہت دل چاہا تمہیں بتاؤں کہ اریج مجھے کتنی پسند ہے، تمہارے لئے اس سے اچھی لڑکی پوری دنیا میں نہیں ہو سکتی لیکن ڈر جاتی تھی کہ اگر تم سے اپنی پسند کا اظہار کر دیا تو کہیں ضد میں آ کر تم اریج کو ہمیشہ کے لئے نہ کھو دو۔" ان کی بات پر وہ شرمندہ سا ہو گیا تھا، شزاء کے لئے اس نے اسی وجہ سے تو انکار کیا تھا کہ وہ صبور آنٹی کو پسند تھی اور وہ ان کی پسند کو کبھی بھی نہیں اپنا سکتا تھا، وہ سر جھکا گیا تھا۔

"کب سے اس سے محبت کرتے ہو مگر وہ انجان ہے، بے خبر ہے اور تم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اندر ہی اندر ٹوٹتے جا رہے ہو، ختم ہوتے جا رہے ہو، کیوں کر رہے ہو اپنے ساتھ ایسا میری جان، کیوں، اسے بتا کر اپنے اندر جلتے الاؤ کو کم نہیں کرتے کیوں اسے اب تک اپنی کیفیت سے بے خبر رکھا ہوا ہے؟" بغیر کہے اپنی حالت ان کے منہ سے سن کر اسے اپنا ہر زخم ابھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس کی اندرونی کیفیت اس کے چہرے پر عیاں ہوتی جا رہی تھی، شدید کرب سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں اور چہرے پر تناؤ پھیلا ہوا تھا، وہ اندرونی خلفشار کا شکار ہو رہا تھا۔

"تم پریشان مت ہو بیٹا میں عباس بھائی سے اریج کو تمہارے لئے مانگوں گی تم دیکھنا وہ ہرگز انکار نہیں کریں گے۔" بڑے پیار سے انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا مگر وہ نہایت آزردگی سے مسکرا اٹھا۔

"مجھے پتہ ہے وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔"

"پھر، پھر کیا پرابلم ہے؟" اس کی بات سن کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

"میں اس کے لئے صرف اس کا دوست ہوں اور کچھ نہیں۔" اس نے یاسیت سے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں بیٹا میں اس سے بات کروں گی، اسے سمجھاؤں گی وہ سمجھ جائے گی۔" انہوں نے دلاسہ دیا مگر وہ سختی سے انہیں منع کر گیا۔

"نہیں، نہیں آپ اس سے کوئی بات نہیں کریں گی، ایک بار اسے کھو چکا ہوں خود سے دور کر چکا ہوں بہت تکلیف ہوئی تھی، دوبارہ وہ تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں، بڑی مشکل سے اس کی نظروں میں گر کر ابھرا ہوں دوبارہ گرا تو مر جاؤں گا اس کے لئے اور

میں مرنا نہیں چاہتا، میں اپنی دوستی کو اور اس کے دوست کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں، ورنہ اس کا دوستی پر سے اعتبار اٹھ جائے گا اس کا مجھ پر سے اعتبار، بھروسہ، یقین سب کچھ ختم ہو جائے گا، وہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھ پر بھروسہ کرتی ہے میں نے ایک بار اس کا بھروسہ توڑا ہے دوبارہ نہیں توڑ سکتا، ایک بار اس کو تنہا چھوڑا تھا دوبارہ اسے اکیلا نہیں کر سکتا، دنیا میں وہ صرف مجھ پر یقین رکھتی ہے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا تو واقعی میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا، لیکن کیا کروں میں اپنے دل کا جو اس کے سامنے بے اختیار ہونے لگتا ہے اپنا ضبط کھونے لگتا ہے، اس کے ساتھ دوست بن کر رہنا میرے لئے بہت مشکل ہو رہا ہے میں اسے کیسے بتاؤں کہ میں اس کا دوست نہیں رہا، میں اسے دھوکہ دے رہا ہوں اور میں مزید اسے دھوکے میں نہیں رکھ سکتا، میں کیا کروں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا میں تھک گیا ہوں ماما ہار گیا ہوں خود سے لڑتے لڑتے، میری برداشت میرا ضبط سب کچھ ختم ہو رہا ہے، میں ختم ہو رہا ہوں ماما۔'' ان کے سامنے کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ان کی گود میں سر رکھے وہ بے اختیار اپنا ضبط کھو بیٹھا تھا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ بھی اپنے اوپر ضبط نہ رکھ سکی تھیں اور بے آواز رو پڑی تھیں، پہلی بار اس کے منہ سے ماما کا لفظ سن کر وہ تو پوری کی پوری سیراب ہو چکی تھیں، برسوں کی تشنگی لمحوں میں مٹ گئی تھی، بے خبری میں ہی سہی مگر اس نے آج انہیں مکمل کر دیا تھا، معتبر کر دیا تھا، ان کی ممتا ٹھنڈی ہو گئی تھی، اس نے ان کے جلتے آبلوں پر نرم سی پھوار برسا دی تھی، جس سے تمام زخم مندمل ہونے لگے تھے، لیکن خود وہ کتنا زخم خوردہ تھا، انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیسے اسے اس اذیت سے نکالے، وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

''میں نے آپ کی محبت کی کبھی قدر نہیں کی ہمیشہ آپ کو ترسایا ہے شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔'' اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

شدت جذبات سے اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں، وہ بہت ملول سا دکھائی دے رہا تھا، اس کی یہ حالت دیکھ کر ان کا دل گویا مٹھی میں آ گیا تھا۔

''نہیں بیٹا ایسے مت کہو، اللہ نہ کرے تمہیں کوئی سزا ملے میری جان۔'' اس کی کشادہ پیشانی پر بوسہ لیتے ہوئے انہوں نے پیار سے کہا۔

''مجھے معاف کر دیں پلیز۔'' ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے نہایت عاجزی سے کہا تو ان کی آنکھیں مزید پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

''میری طرف سے آج تک جتنی بھی تکلیف آپ کو ہوئی ہے میں ان سب کے لئے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔''

''تم تو میری جان ہو، تمہاری طرف سے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی بیٹا، بس ایک کمی سی تھی جو بہت محسوس ہوئی تھی وہ کمی بھی تم نے آج پوری کر دی، میں خوش ہوں بہت زیادہ۔'' وہ واقعی بہت خوش لگ رہی تھیں، ان کی طرف سے اس کا دل بہت ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا ورنہ آج تک وہ ایک نادیدہ سا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہا تھا جو آج سرک گیا تھا۔

☆☆☆

وہ آج صبح سے اپنے کمرے کی صفائی میں لگا ہوا تھا، ہر چیز کی جگہ اور ترتیب بدل دی تھی، ماما نے اسے کئی بار کہا کہ وہ صفیہ سے اس کے کمرے کی صفائی کرا دیں گی لیکن وہ خود کرنے پر بضد تھا

تو انہوں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہوگئیں شاید وہ اپنا ذہن بٹانے کی خاطر اس طرح کے چھوٹے موٹے کام کررہا تھا۔

وہ بک ریک میں بکس رکھ رہا تھا جب نیچے لاؤنج سے آتی اس کی کھنکتی آواز پر اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا، گہرا سانس سینے سے باہر نکالتے اس نے جلدی سے بکس ریک میں رکھیں اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے کمرے میں آتی اس نے وہاں سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

''ہنید پاپا نے یہ فائل دی ہے اور..... ارے یہ کیا، یہ تمہارا کمرہ ہے؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک طائرانہ سی نظر پورے کمرے میں ڈالی پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''سرونٹس سے تو تم اپنا کمرہ صاف نہیں کراتے پھر کیا تم نے خود......؟'' وہ شدید حیران ہورہی تھی۔

''بہت اچھی صفائی کرلیتے ہو ہنید، سچ بہت اچھا لگ رہا ہے یہ سب دیکھ کر، سچ بتاؤ کس کی بات دماغ میں سمائی ہے؟'' اس کے پاس آکر اس نے آہستگی سے پوچھا تو اس کے اتنے قریب آنے پر وہ منتشر ہوتی دھڑکنوں کو روک نہیں پایا تھا، اس کی قربت اسے متوحش کررہی تھی، وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا اور کلائی میں رسٹ واچ باندھنے لگ گیا۔

''تم نے ڈور بھی ناک نہیں کیا، کم از کم پرمیشن تو لینی چاہیے ناں کسی کے کمرے میں انٹر ہونے سے پہلے۔'' اس کی بات پر اسے شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی وہ محض اسے دیکھ کررہ گئی۔

''میں نے بھی تمہارے روم میں آنے سے پہلے پرمشن نہیں لی ہنید شاید اس لئے عادت نہیں ہے، لیکن میں سب کے رومز میں اس طرح بے دھڑک نہیں جاتی، ویسے آئندہ خیال رکھوں گی۔''

اسے شدید برا لگا تھا مگر وہ خاموش ہی رہا۔

''اپنی ویز میں یہ فائل دینے آئی تھی پاپا نے کہا ہے جو امپورٹنٹ پوائنٹس ہیں وہ شام کو گھر پر آ کر ان کے ساتھ ڈسکس کرلینا۔'' فائل ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے بتایا پھر جانے کے لئے دروازے کی طرف پلٹ گئی۔

چاہتے ہوئے بھی وہ اسے روک نہیں پایا تھا، شاید وہ بھی تو چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے سے چلی جائے اور ایسا ہی ہوا تھا۔

اس کی کچھ دیر کی موجودگی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس کا پاس آنا، بات کرنا، خیال رکھنا وہ سب سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور اسی وجہ سے وہ ایسے کام بھی خود کرنے لگ گیا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے، بیڈ روم کی خود صفائی کرنے لگ گیا تھا اور ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اسے اریج کی مدد نہ لینی پڑے۔

لیکن پھر بھی جب کبھی وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی تو وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ سخت لہجے میں بات کرنے سے خود کو روک نہیں پاتا تھا۔

شام کو اپنے کاموں سے فارغ ہوتے ہی وہ سیدھا عباس انکل کے پاس جا پہنچا تھا، اسے دیکھتے ہی وہ خوش ہوگئے تھے۔

''میں نے فیصل صاحب سے بات کی تھی لیکن مجھے ان کا ارادہ نہیں لگ رہا اس پروجیکٹ پر کام کرنے کا۔'' چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے انہیں آگاہ کیا تو عباس انکل کچھ پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے عباس انکل کے پارٹنر نے

پارٹنرشپ ختم کر کے اپنا بزنس ملک سے باہر سیٹ کر لیا تھا جس کے باعث انہیں بہت مشکلات کا سامنا تھا، اسی وجہ سے بہت سے معاملات میں وہ اس کی مدد لیا کرتے تھے، جب سے اس نے تمام معاملات دیکھنا شروع کیے تھے وہ قدرے مطمئن ہو گئے تھے۔

''آپ پریشان مت ہوں انکل میں دوسرے کلائنٹ کو کنوینس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں انشاء اللہ وہاں کام بن جائے گا۔'' ان کی پریشانی کو بھانپ کر اس نے انہیں تسلی دی پھر ان سے مزید پوائنٹس ڈسکس کر کے وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے تم کہاں جا رہے ہو کھانا کھائے بغیر، میں نے آج تمہاری پسند کی ڈش بنائی ہے کھا کر جانا۔'' وہ عباس انکل کے کمرے سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جب اسے اپنی پشت پر اس کی آواز سنائی دی، وہ ایک لمحہ کے لئے رک گیا پھر گویا ہوا۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے میں رات کو کھانا لیٹ کھاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ پورچ میں کھڑی گاڑی کا لاک کھولنے لگ گیا۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہے ہبید، تم اتنے دنوں بعد آئے میں تمہیں کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دوں گی، مجھے پتہ ہے تم بہت بزی ہو گئے ہو، اپنے بزنس کے ساتھ ساتھ پاپا کے بھی کئی پروجیکٹس ہینڈل کر رہے ہو اور شاید اسی لئے زیادہ تر آؤٹ آف مائنڈ بھی رہنے لگے ہو مگر ڈونٹ وری میں بالکل برا نہیں مناؤں گی، بٹ آج تمہیں ڈنر میرے ساتھ کرنا ہوگا، سو پلیز کم اینڈ جوائن اس۔'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے اسے بازو سے تھام کر اندر کی طرف لے جانا چاہا جس کو اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھوں سے چھڑایا۔

''اریج پلیز ناؤ گرو اپ، ہر وقت کا بچپنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔'' اس کے لہجے میں درشتگی در آئی تھی، وہ پہلی بار اسے اس روپ میں دیکھ رہی تھی، اختیار پیچھے ہٹ گئی۔

''اس میں بچپنے والی کیا بات ہے ہبید؟''
اس نے حیرت سے اس کے بدلتے موڈ کو دیکھ کر پوچھا، پتہ نہیں اچانک اسے کیا ہو جاتا تھا؟

''یہ بچپنا نہیں تو اور کیا ہے، ایک دفعہ تمہیں کسی چیز سے روکتا ہوں تو تم رکتی کیوں نہیں ہو؟ بی میچور اریج پلیز۔'' اتنا کہہ کر اس نے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا اور تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا تو وہ کتنی ہی دور تک اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وہ تو اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہ رہی تھی صبور آنٹی کے بارے میں کہ وہ کتنی خوش تھیں اور اسے اس کے اس طرز عمل پر وہ خود کتنی خوش تھی مگر اس نے صبح اس کی بات سنی تھی اور نہ ہی اب۔

وہ ایسا کیوں کر رہا تھا اس کے ساتھ وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔

شاید کام کا بوجھ اس پر بہت بڑھ گیا تھا اس لئے، وہ سوچتی ہوئی اندر چلی آئی۔

☆☆☆
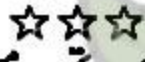
عجیب بے چینی سی تھی جو مسلسل بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ مزید اپنے آپ سے الجھتا جا رہا تھا اور یہ الجھن اس وقت شدید ہو گئی تھی جب سے انعم نے اسے اریج کے لئے حسیب کے رشتے کے متعلق بتایا تھا جو پچھلے کئی مہینوں سے اریج کے لئے حسیب کا رشتہ آ رہا تھا اور عباس انکل کے بہت زیادہ زور دینے پر اس نے سوچنے کے لئے کچھ وقت مانگا تھا۔

یہ بات سنتے ہی اسے اپنے جسم سے جان سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی گویا سب کچھ ختم ہو گیا تھا، جس کو وہ بے پناہ چاہتا تھا وہ کسی اور کی ہونے جا رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا اس کا دماغ جیسے پھٹ رہا ہو۔

اپنی کیفیت خود اس کی سمجھ سے باہر تھی، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک وہ خود اسے حسیب کے لئے قائل کر رہا تھا اور اب اسے حسیب سے عجیب سی رقابت محسوس ہو رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے جا کر اپنا دل کھول کر رکھ دے کہ وہ کتنا اسے چاہتا ہے اس سے محبت کرتا ہے، دنیا میں کوئی اسے اتنا نہیں چاہ سکتا، مگر کیسے؟ وہ تو اسے کبھی بتا بھی نہیں سکے گا، وہ تو بے بس تھا، مجبور تھا، وعدہ نہ ٹوٹے اس نے خود کو توڑ ڈالا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا تھا جب اس کی آواز پر وہ چونک سا گیا۔

مگر اسی پوزیشن میں لیٹا رہا، اس کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''ہدید میں جانتی ہوں تم جاگ رہے ہو پلیز اٹھو اور مجھے اپنی طبیعت کا بتاؤ۔'' اس کی آواز سے پریشانی چھلک رہی تھی، وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''صبور آنٹی بتا رہی تھیں کہ پچھلے تین دنوں سے تمہاری طبیعت بہت خراب ہے اور تم اب تک ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گئے، ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کم از کم ڈاکٹر تو چیک کرا دو پلیز۔'' اس کی طرف سے وہ بہت فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں بس ہلکا سا فیور ہے اتر جائے گا۔'' بیڈ سے نیچے اترتے ہوئے وہ بدقت تمام اتنا ہی بول پایا تھا۔

''خود بخود تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا ہدید۔''

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا کپڑوں پر آئی شکنوں کو ہاتھ کی مدد سے درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

''بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جس کو خود ہی ٹھیک ہونا پڑتا ہے۔'' وہ لایعنی سی باتیں کر رہا تھا جن کو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اسے واقعی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے وہ مزید گویا ہوئی۔

''تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے تم؟ بزنس میں صبور آنٹی کا ہاتھ بٹانے کو کہا تھا خود سے لاپرواہ ہو جانے کا مشورہ تو کسی نے نہیں دیا تمہیں۔'' اس کی حالت کے پیش نظر وہ الجھی جا رہی تھی، اس نے پہلے کبھی اسے اس قدر سوٹ زرہ شلوار سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھا کشادہ پیشانی پر بے ترتیب بال بکھرے ہوئے تھے۔

پتہ نہیں وہ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتا تھا؟

''تم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہو یا نہیں؟'' اسے کمپیوٹر کے آگے بیٹھتا دیکھ کر اس نے سختی سے پوچھا۔

''اریج پلیز تم جاؤ مجھے کچھ کام کرنا ہے، میرا ٹائم ویسٹ مت کرو پلیز۔'' اس کی بات سن کر وہ ایک لمحے کے لئے ششدر رہ گئی، جس نے پہلی بار اس سے اس طرح بات کی تھی مگر وہ نظر انداز کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

شاید طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس کا مزاج چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔

''ہدید پلیز مان جاؤ۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں ناں، میں ٹھیک ہوں، مجھے کہیں نہیں جانا پھر تم کیوں پیچھے پڑ گئی

ہو میرے۔'' وہ جھنجھلا سا گیا تھا اس کے اصرار پر۔
''اچھا ٹھیک ہے مت جاؤ مگر یہ ٹیبلٹ لے لو۔'' وہ پانی کے ساتھ ٹیبلٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
''تم یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں آخر، کب سے تمہیں کہہ رہا ہوں تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتی میری بات۔'' یکدم وہ چلا اٹھا تھا۔
''عذاب کر دیا ہے تم نے میری زندگی کو، ہر وقت میرے سر پہ مسلط رہتی ہو، تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتا کہ میں تمہیں اگنور کر رہا ہوتا ہوں کیونکہ مجھے تمہارے ساتھ ٹائم اسپنڈ کرنا اچھا نہیں لگتا، لیکن تم ہو کہ ہر وقت دوست دوست کی رٹ لگائے رکھتی ہو، میں پریکٹیکل لائف میں آ چکا ہوں جہاں یہ سب باتیں اچھی نہیں لگتیں سنا تم نے؟'' وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی تلخ باتیں سنتی جا رہی تھی۔
''کیا ہوا ہے ہنید کیوں اتنا چلا رہے ہو؟'' عباد، زیادہ اور انعم ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے غالباً وہ تینوں بھی اس کی خیریت معلوم کرنے آئے تھے جب اسے اریج پر چیختا چلاتا سن کر وہ حیرانی و پریشانی کے عالم میں اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔
اریج کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ تینوں گھبرا اٹھے تھے۔
''کیا بات ہے ہنید کیوں اتنا اونچا بول رہے تھے؟'' انعم نے آہستگی سے اس سے دریافت کیا، جو بہت ڈیپریسڈ دکھائی دے رہا تھا۔
''کچھ نہیں ہوا، اسے کہو مجھے زچ مت کیا کرے۔'' وہ اسی لہجے میں انعم سے بولا۔
''میں نے کیا زچ کیا ہے تمہیں، بس اتنا ہی کہا تھا ناں کہ ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔''

آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے اس نے شکایتی انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
''ہاں تو کیوں کہتی ہو، میں بچہ ہوں جو مجھے چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر فورس کرتی رہتی ہو۔'' اس کی طرف دیکھ کر وہ غصے سے بولا۔
''ہنید پلیز یار کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں اتنی معمولی سی باتوں پر جھگڑا کر رہے ہو؟'' زیاد نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''مجھے عادت ہے تمہارا خیال رکھنے کی ہنید بس اس لئے، مگر آئندہ خیال رکھوں گی۔'' اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔
''میں بھی بس یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے سامنے مت آیا کرو، مجھے اکیلا چھوڑ دو، میں اسی طرح خوش ہوں اپنی زندگی میں، مجھے خوش رہنے دو۔'' وہ ایک بار پھر تلخ لہجے میں بولا۔
''تم زیادتی کر رہے ہو ہنید اور یہ کیا طریقہ ہے تمہارا بات کرنے کا؟'' عباد اس کے طرز تخاطب پر بھڑک اٹھا تھا۔
''یہی طریقہ ہے میرے بات کرنے کا، تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے تمہیں تو میں کچھ نہیں کہہ رہا پھر تمہیں کیوں برا لگ رہا ہے۔'' وہ اب عباد پر چڑھ دوڑا تھا۔
''تمیز کے ساتھ بات کرو ہنید اور جس طرح تم اریج کے ساتھ بات کر رہے ہو تمہارا کیا خیال ہے ہم چپ چاپ سنتے رہیں گے، نیور۔''
''تم سے برداشت نہیں ہو رہا ناں تو تم جا سکتے ہو یہاں سے لیکن میں اسی طرح بات کروں گا اس سے کیونکہ یہ اس کا اور میرا معاملہ ہے۔'' اس نے مزید بدتمیزی سے کہا۔
''تم نے تو حد کر دی ہنید تم اس طرح کیسے کہہ سکتے ہو ہمیں اپنے گھر سے جانے کا اور تمہارا

معاملہ ہمارا معاملہ بھی ہے انڈر آسٹینڈ؟'' زیاد کو بھی اس کا انداز بری طرح کھل رہا تھا سو چپ نہ رہ سکا۔

''تم لوگ آپس میں کیوں الجھ رہے ہو میری وجہ سے پلیز اسٹاپ اٹ۔'' وہ عباد اور زیاد کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی پھر اس کی طرف پلٹ گئی پھر اس کی حالت کے پیش نظر نرمی سے بولی۔

''پلیز ہلید غصہ ختم کر دو آئندہ جس بات سے تم روکو گے میں وہ بالکل نہیں کروں گی۔'' اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا مگر اس کا چہرہ تو سرخ ہی ہو گیا تھا۔

ایک سنسنی سی تھی جو اس کے پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھی۔

''ہاتھ چھوڑو میرا۔'' وہ چیخ ہی پڑا تھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں میں......''

''چٹاخ۔''

''کہہ رہا تھا ناں ہاتھ چھوڑو میرا۔'' وہ دھاڑا تھا۔

وہ دائیں گال پر ہاتھ رکھتی نم آنکھوں کے ساتھ تاسف سے اسے دیکھنے لگی پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''یہ کیا کیا تم نے ہلید، تمہیں شرم آنی چاہیے کسی لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ بھی اریج پر۔'' انعم کی برداشت بھی ختم ہو گئی تھی اس لئے بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''پتہ نہیں تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے لیکن اتنا ضرور پتہ چل گیا ہے کہ تم ہم میں سے نہیں رہے، تم بہت بدل گئے ہو ہلید۔'' وہ سب ملامتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے باری باری کمرے سے باہر نکل گئے اور وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا اس نے بہت برا کیا ہے میرے ساتھ۔'' وہ تینوں اسے کب سے چپ کرا رہے تھے مگر وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''میں نے ہمیشہ کی طرح اس کا خیال رکھنا چاہا تھا، اس کی تکلیف پر بے چین ہو جاتی تھی یہی میری غلطی تھی ناں، آئندہ زندگی میں بھی یہ غلطی نہیں دہراؤں گی میں اس کی شکل دیکھوں گی اور نہ اپنی شکل دکھاؤں گی۔'' وہ مسلسل آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو رگڑ کر صاف کرتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ بولتی جا رہی تھی۔

''وہ اتنے عرصے سے مجھ سے اکھڑ کر بات کر رہا تھا جس کو میں نظر انداز کیے جا رہی تھی اور وہ، وہ مسلسل مجھے ٹیس کیے جا رہا تھا میں پاگل تھی ناں جو اس کے رویے کو سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ وہ مجھ سے، میری دوستی سے اکتا چکا ہے، میرے خلوص سے اکتا چکا ہے، لیکن اب، اب وہ ترسے گا میری دوستی کو، دیکھ لینا تم لوگ۔'' روتے روتے اس کا گلا رندھ گیا تھا، اسے افسوس ہو رہا تھا خود پر جو اس پر بھروسہ کیے بیٹھی تھی کہ وہ دنیا میں اس کا سب سے اچھا دوست ہے، اچھے دوست ایسے ہوتے ہیں کیا جو دوست پر ہاتھ اٹھائیں انہیں ذلیل کریں۔

''اریج پلیز خود کو سنبھالو ایسے مت روؤ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' انعم نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ مزید رونے لگ گئی تھی، وہ تینوں کافی دیر تک اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے، نتیجتاً وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی مگر آنکھیں تھیں کہ خشک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

اسی طرح نجانے کتنے شب و روز گزر گئے تھے، اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا لیکن ایک کسک سی تھی دل میں کہ اس نے ایک بار بھی اس سے معذرت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، اگر وہ اس سے معذرت کر بھی لیتا تو اس نے کون سا اسے معاف کر دینا تھا۔

وہ گھر کے اور باہر کے وہ کام بھی خود کرنے لگ گئی تھی جو آج تک وہ ہی کیا کرتا تھا، شروع میں اسے تھوڑی بہت مشکل ضرور پیش آئی تھی مگر جب سر پر پڑی تو اس نے سب کچھ کر لیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ صرف اس کا ہی اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا، بلکہ وہ تینوں بھی اس سے ہر قسم کا تعلق ختم کیے بیٹھے تھے، اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اس سے ناراضگی دکھانا ان کی مجبوری بن گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' عباد نے نہایت حیرت سے زیاد کو دیکھا۔

''صحیح کہہ رہا ہوں یار، کل ماما کو ہاسپٹل لے کر جا رہا تھا وہیں صبور آنٹی سے بھی ملاقات ہوئی تھی، وہ رضوانی صاحب کے ساتھ تھیں شاید ان کی طبیعت کچھ خراب تھی، ان سے حال احوال پوچھنے کے دوران ہی مجھے پتہ چلا کہ ہنید کو گھر چھوڑ کہیں گئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس کی اور ہماری آخری ملاقات کو بھی ایک ماہ ہو گیا ہے۔'' زیاد کی باتیں سن کر وہ تینوں دم سادھے بیٹھے تھے۔

ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح بھی کر سکتا ہے۔

شدید پریشانی کے عالم میں وہ سب فوراً صبور آنٹی کے پاس ان کے گھر جا پہنچے تھے۔

''پلیز آنٹی کچھ تو بتایئے کہاں گیا ہے وہ؟'' انعم نے تشویش سے ان سے پوچھا، جو خود بہت پریشان پریشان سی لگ رہی تھیں۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں بیٹا مجھے کچھ نہیں پتہ، بس وہ بہت پریشان اور الجھا الجھا سا تھا جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت اس کے سر پر آن پڑی ہو، میں نے اس سے بہت جاننے کی کوشش کی مگر اس نے کچھ بھی نہیں بتایا اور تم لوگوں سے بھی بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔'' صبور آنٹی حقیقتاً پریشان تھیں اس کا اندازہ ان کے چہرے اور ان کی گرتی صحت سے بخوبی ہو رہا تھا، وہ چاروں عجیب سی کیفیت میں گھرے گھر کو لوٹے تھے۔

پتہ نہیں وہ کہاں تھا اور کس حال میں تھا؟ انہوں نے اپنے تئیں ہر جگہ سے اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوششیں بھی کیں مگر ہو طرف سے ناامیدی ہو رہی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا ان سب کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

صبور آنٹی رضوانی صاحب سے نکاح کے بعد ان کے بنگلو میں شفٹ کر چکی تھیں۔

اسے لگا جیسے وہ اپنا سب کچھ کھو چکی ہے بالکل خالی ہاتھ رہ گئی ہے اتنی پریشانی بڑھ گئی تھیں اس کے جانے کے بعد کہ وہ تو بس بل کر رہ گئی تھی۔

پاپا کی بڑھتی بیماری پر اس نے اسے کتنا یاد کیا تھا، اسے کتنی ضرورت تھی اس کی یہ تو اسے آہستہ آہستہ پتہ چل رہا تھا لیکن وہ پتہ نہیں کہاں تھا اور تھا بھی کہ...... کہ، اس کا دل کانپ کر رہ گیا تھا اپنی سوچ پر۔

(باقی آئندہ ماہ)

پندرہویں قسط کا خلاصہ

ڈائری عبدالحادی کی کہانی سنانے لگتی ہے۔
ذکار دیوانہ وار مسجد سے نکل جاتا ہے خدا کی تلاش میں اور ھالار پریشان ہو کر علی گوہر کے پاس آجاتا ہے، علی گوہر اور امرت کی ماضی کے بارے میں تفصیلی بات ہوتی ہے۔
ذکار کو بس میں ایک نوجوان ملتا ہے جو ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔
پروفیسر غفور اور امرت کی باتوں کے دوران لاھوت چونک جاتا ہے۔
امرکلہ مزار کے احاطے میں شور کرنا شروع ہو جاتی ہے۔
اس کی کیفیات کو بدلتے دیکھ کر نواز حسین بہت پریشان ہو جاتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

سولہویں قسط

کیفیات اس پر بری طرح ٹوٹ پڑی تھیں۔
جیسے موسلا دھار بارش ہوتی ہے، جس میں مکان بھیگ جاتے ہیں، گلیاں بھیگ جاتی ہیں، لوگ بھیگ جاتے ہیں، ہر جگہ پانی ہوتا ہے اس کا دل بھیگا ہوا تھا، جس پر کیفیات نے برسات برسائی تھی، دل بھیگا ہوا تھا دکھ سے، ٹپ ٹپ قطرے گرتے رہے، محسوسات کے زخم سارے ہرے کے ہرے ہو گئے۔
''واہ زندگی تیرے کیا کہنے۔''
قہر کیوں برسا دل پر کہ ہوش سے بیگانہ وہ ہو بیٹھی تھی، جیسے کوئی دیوانہ توازن کھونے لگتا ہے اور کھولنے لگتا ہے خود کو اپنے آپ کو، اپنے دل کو..... وہ کیوں چیخی......اور بے طرح چیخی، مگر جب زندگی آئندہ اٹھائے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی، جب اجالے میں لوگ درویشنی پر ترس کھانے لگے جب وہ لاوا بنی ہوئی تھی اور ہر جگہ سے آگ نکل رہی تھی، آگ برس بھی رہی تھی۔
دل جل رہا تھا اس کا، موسم اثر کھونے لگا، توازن بھی اسی طرح سے اور ایک وہ وہی بیگانی، جو تھی کبیر بھائی کی امرکلہ، جسے وہ کہتے تھے عائشہ، کہتے تھے جویریہ، کہتے تھے کلثوم اور زینب، مریم بھی، وہ جو تھی بیگانی اور زندگی بن گئی آئینہ۔
سامنے جب بے ترتیب حلیے کھلے بالوں والی عورت نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔
کیفیات رکیں، بارش رکی، آگ پر برف کا گولہ نہ بھی گرا ہو مگر آگ ہلکی تو ہوئی، جیسے چپ کی شام اس کے اوپر سے گزر کر گئی ہو اور جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔
آئینہ تھا سامنے، عورت امرکلہ کے ساتھ لپٹ گئی، جیسے پتھر کے بت کے ساتھ لپٹ گئی ہو، وہ اب بھی بے توازن تھی، مگر چپ کا پتھر جیسے اس پر آن گرا ہو، جیسے آن گرا ہو گویائی پر، اندر دل شیشے کی طرح چور چور ہو کر جو بکھرا تھا اور باہر وہ تھی۔
اور اس سے لپٹ کر روتی ہوئی اس کی بے چاری عیسیٰ مسیح کی صدائیں دینے والی کوئی اور نہ تھی اس کی سگی ماں تھی۔

☆☆☆

تنہائی اور محرومی دو ایسی تباہ کن چیزیں ہیں جو اندر سے مار دیتی ہیں، مار کر ختم کر دیتی ہے۔
چلتا پھرتا ہوا بندہ دل سے مرا ہوا ہو جاتا ہے، دل جب مرتا ہے بندے کی موت سستی، دل کی موت سستی، موت ہی بولو سستی اور زندگی کہہ دو کہ مہنگی، بہت ہی مہنگی، ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی مگر دل پر آرا چلاتی زندگی۔
ڈائری کے سفید ورق سیاہی سے بھرے ہوئے تھے اور سطریں تشنہ تھیں، دل تشنہ تھا، پہلا باب ہوتا ہے محبت کا، دوسرا تھا زندگی کا، اس نے پہلے زندگی کا باب کھولا تھا، محبت پر بس سرسری نگاہ کی تھی اور زندگی کے باب میں اتنی ہی تلخی تھی کہ جتنی زندگی میں ہوتی ہے۔
زندگی کا باب کڑواہٹ سے بھرا تھا، اس سے پہلے کی ساری خوشیاں فنکار نے زندگی سے نوچ کر محبت کے صفحات پر چسپاں کر دی تھیں۔
امرت نے صفحات پلٹے اور بات آ گئی ایک دفعہ پھر سے محبت کی، اس نے پہلی بار کی محبت

میں پہلی پہل کرتے ہوئے جو کہا وہ دل میں اتر گیا۔
کہنے لگا فنکار کہ محبت اور جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں، کہنے لگا جنگ میں سر ہتھیلی پر رکھ کر چلا جاتا ہے، مگر محبت میں دل ہتھیلی پر ہوتا ہے، قربانی جیسے قربانی ہے، محبت بھی تو محبت ہے نا۔
''آپ کی ہتھیلی پر دل رکھ دیا ہے، چاہے تو اٹھالیں اگر چاہیں تو اڑا دیں۔'' فنکار نے سرخ گلاب اپنی ہتھیلی پر رکھا تھا اور ہتھیلی صنوبر کے آگے کر دی۔
اس نے گلاب اٹھالیا، دل اٹھالیا، ایک سودہ ہو گیا، محبت کا سودہ ہو گیا، تو سمجھو ہو گیا، کام ہو گیا۔
محبت کے باب میں یہ تھا صفحہ نمبر بائیس، دن تھا منگل کا، تاریخ تھی تئیس جولائی، موسم تھا سہانا، ہوا چل رہی تھی اور اچانک جولائی کے موسم میں ہوا کا جھکڑ چلا تھا، بہت تیز ہوا، دو لمحے کی کالی آندھی، جو جہاں تھا وہاں سے بچ نکلا اور دو دونوں جہاں تھے، وہیں کے ہو کر رہ گئے۔
پتھر کے بت، احساس دوڑنے لگے، بھاگنے لگے، ان کی آنکھیں آسمان کے ساتھ ساتھ برسنے لگیں، آنسو تھے خوشی کے، محبت ایسا کون ہے جو تجھ سے بچ نکلا ہو؟ محبت نے کہا کوئی نہیں اور ایک قہقہہ ہوا میں چھوڑ دیا، یہ ان کے اقرار کا پہلا دن تھا۔
محبت نے آغاز کی سیڑھی پر قدم رکھ دیا تھا، اب کون جانے کہ کیا ہوگا۔

☆☆☆

پہلی بار ابے نے حالار کے چہرے پر یہ اداسی، یہ بے چینی، یہ بے کیفی دیکھی، اس کے اندر آتے ہی حالی پر نظر پڑی تھی اور نظر ٹھہری اس لئے کہ کسی کی آنکھوں میں بے کیفی اور بے یقینی کا ڈیرہ تھا، حالی نے بے بسی سمیت اس کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے رو دینے کو تھا، جی کیا لپٹ جائے۔
''حالی!'' وہ آگے بڑھا تھا۔
''سب خیریت ہے نا۔'' دل کو دھڑکا لگ گیا۔
''ابا پتہ نہیں کہاں چلے گئے علی گوہر۔'' وہ ٹوٹا ہوا تھا۔
علی گوہر کے کپڑے پہن کر وہ اور بھی گوہر کی طرح دکھتا تھا، اس پر یہ بے بسی اور سرخ آنکھوں میں تیرتی نمی۔
''کہاں چلے گئے؟'' علی گوہر اس تک آیا، اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''مجھے نہیں پتہ علی گوہر بس کے اڈے پر دیکھ آیا ہوں، وہ وہاں نہیں تھے، بس نکل گئی تھی، وہ کہاں چلے گئے، تمہیں کچھ پتہ ہے؟''
''اندازہ ہے، وہ کہاں جا سکتے ہیں۔'' علی گوہر، حالار کے ساتھ بیٹھ گیا۔
''کیا کہہ کر گئے تھے؟''
''کہہ رہے تھے مجھے لذت ہے آوارہ گردی میں، کہہ رہے تھے رسوائی میں، کہہ رہے تھے کہ خدا کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں کہنے لگے؟'' گوہر نے چونک کر پوچھا۔
''یہی کہا علی گوہر، کہا اپنے لفظوں میں پر کہا تو یہی تھا نا۔''
''حالی......اٹھو۔'' وہ اٹھا۔

''کہاں؟'' ھالا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''بس کو وہ ڈھونڈنے گئے ہیں، اس کے گھر چلتے ہیں، مسجد چلتے ہیں۔''

''وہاں چل کر دعا ہی کریں گے نا؟''

''وہ تو کر آیا ہوں۔''

''وہاں چل کر دعا ہی کریں گے۔'' گوہر کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔

''وہ کہتے تھے کیا مسجد میں ہوتا ہے خدا؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے ھالا مسجد میں خدا نہیں ہوتا ہوگا؟'' علی گوہر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''مجھے نہیں پتہ خدا کہاں ہوتا ہے؟''

''ھالا ایک بار اپنے یقین کو آواز دے دو، اس سے پوچھو کہ خدا کہاں ہوتا ہے۔''

''میرا یقین، میرا یقین ڈگمگایا ہے۔'' وہ الجھا ہوا تھا۔

''نہیں ھالا وہ سویا ہوا ہے۔''

''کیا اس کے جاگنے کا انتظار کریں؟ تب تک میرے بابا کا کیا ہوگا گوہر؟''

''اس کے جاگنے کا انتظار کرتے ہیں ھالا۔''

''نہیں علی گوہر، انتظار تکلیف دیتا ہے، بہت زیادہ۔''

''بے پناہ لذت بھی تو دیتا ہے نا ھالا۔''

''گوہر انتظار مار دیتا ہے، سنگدل کیوں بن رہے ہو۔''

''سنگدل جیسے ہوں گوہر تیرے یار، پچھلی رات کی بے چینیاں سب سمیٹ کا شکار ہو کر آیا ہوں، چل کر مجھے پتہ ہے انتظار مار دیتا ہے، ختم کر دیتا ہے اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔'' اس نے ھالا کے کندھے پر ہاتھ رکھا ایسے جیسے ولی کی کوئی دیتا ہے، ڈھارس دیتا ہے، اپنا لگتا ہے اور اپنا سمجھتا بھی ہے۔

''کہاں سے آ رہا ہے ہوا سے گوہر۔'' ماں کمرے سے باہر نکل آئی۔

''خیر ہے ماں۔'' وہ ماں کی طرف آیا، کان کے قریب ہوا۔

''کبھی پتہ بے گا تب بے چین ہوگا، رونے گا اور روئے گا تو پھر سو نہیں پائے گا، ساری رات جاگتا رہے گا۔''

''تو رات بھر سے جاگ رہا ہے گوہر اور در در پھر رہا ہے گا، اس کی امید ٹوٹے گی یہ پھر بھی روئے گی۔''

''گھر آئے گا تو تھک کر سو جائے گا، نہیں روئے گا، تسلی رکھیں۔'' وہ کہہ کر اس کی طرف بڑھا۔

''ماں کیا کہتی ہیں گوہر؟'' وہ رک گیا۔

''ماں ہیں یار بس پریشانی زیادہ ہو جاتی ہیں کیا کہا جا سکتا ہے، چلو چلتے ہیں۔''

''کہاں جائیں گے علی گوہر؟'' ٹوٹے ہوئے کا لہجہ بھی ٹوٹا تھا بس لفظ ثابت تھے۔

''پورے پورے اس کو ڈھونڈنے جو خدا کو ڈھونڈنے نکلا ہے۔''

''اگر اسے خدا مل جائے گا تو ہمیں بھی وہ مل ہی جائے گا۔'' حانی کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔

گوہر نے اسے ایک لمحہ دیکھا اور اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے ساتھ لگائے باہر کی طرف جانے لگا، یہ پورا منظر عمارہ نے کچن کی کھلی ہوئی کھڑکی سے دیکھا تھا اور ذرا حیران نہیں ہوئی، وہ اب تک گوہر کی کسی حرکت پر حیران نہیں ہوئی تھی۔

جیسے باتوں باتوں میں چھوڑ دیا تھا، ویسے حیران ہونا بھی حماقت لگتا تھا، وہ دوسرے لمحے میں کھڑکی سے ہٹ کر کام میں لگ گئی۔

☆☆☆

''ہر باغی اپنے حق کی ایک جنگ لڑتا ہے اور اپنے طریقے سے لڑتا ہے، خود اپنے لئے لڑتا ہے یا پھر دوسرے اپنوں کے حق لڑتا ہے، لاحوت! افسوس یہ ہے کہ ہم نے کوئی جنگ نہیں لڑی۔''

''ہم جنگ لڑے بغیر ہی بھاگ آئے، خود کو باغی سمجھنے والے ہم صرف باغی نہیں ہیں ہم بھگوڑے ہیں۔''

''ہماری نسلیں باغی نہیں کہیں گی ہمیں، وہ بھگوڑے ہی کہیں گی۔'' اس نے اینٹ کے بیچ سیمنٹ لگائی، دوسری اینٹ پر سیمنٹ لگا اور اسے چپکا کر ترتیب سے جوڑ دی۔

لاحوت اس کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا مگر اس کی ساری توجہ اس کے کام کرتے ہوئے ہاتھوں کی طرف تھی۔

''اس سے پہلے کوئی ایسا کام کیا ہے امرت؟'' وہ مسکرا کر پوچھنے لگا۔

''ہر کام پہلی بار تو ضرور کیا جاتا ہے، یہ پہلی بار کیا جانے والا کام ہے، سوچ رہی ہوں مزدور کے پیسے بچتے ہوں گے۔''

یہ مسجد کے ساتھ مسافر خانے کی دیوار تھی جو ڈھے گئی تھی اور اسے بنوانے کے لئے مسجد کا امام چندہ مانگ رہا تھا، صرف ایک دیوار کو بنانے کے لئے چندہ مانگ رہا تھا۔

مسجد کے امام کو گوہر کے ذریعے امرت مل گئی، جب سے امرت کو پتہ چلا تھا کہ گلی کا گوہر مسجد کے لئے چھوٹی بڑی چیزیں خود لایا کرتا تھا، وہ پچھلے دنوں کچھ چیزیں خریدتے ہوئے امرت کو نظر آیا تھا اور ان چیزوں میں آدھی چیزیں امرت نے خرید کر دی تھیں اور تب امام سے اس کی پہلی ملاقات تھی اور اس نے اپنا نمبر امام کو دے دیا تھا، آج امام صاحب کے یاد کرنے پر وہ یہاں چلی آئی، اس وقت لاحوت ہاسٹل سے نکل رہا تھا اور اسے ملنے کے لئے کال کر رہا تھا، تب اس نے لاحوت کو بھی وہیں بلا لیا تھا۔

ایک محلے کا لڑکا جو مزدور تھا اسے لے کر وہ اس دیوار کی مرمت میں شروع ہو گئی تھی، لاحوت اسے سیمنٹ اٹھا کر مسالا ملا کر دے رہا تھا اور وہ دیوار بنا رہی تھی۔

امام صاحب کئی بار آ کر منع کر چکے تھے سمجھا چکے تھے کہ یہ کام اسے زیب نہیں دیتا نہ ہی یہ کام عورتوں کے ہوتے ہیں اور اس نے کوئی دو بار ان کو یہی ایک جملہ کہا تھا کہ۔

''افسوس امام صاحب آپ بھی عورت کو انسان نہیں سمجھتے ہیں۔''

''بھلا جو کام انسانوں کا ہوا اسے ہر اک انسان کر سکتا ہے، کبھی تو جنس سے ہٹ کر سوچ لیا کریں۔'' وہ دونوں مرتبہ شرمندہ ہو کر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے تھے اور اب وہ دیوار بننے کو تھی، تقریباً آخری قطار تھی، امرت لکڑی کی سیڑھی پر کھڑی تھی، لاھوت ڈر رہا تھا کہ وہ کہیں گر نہ جائے اس لئے اس نے سیڑھی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

وہ آخری قطار مزدور کے ساتھ مکمل کر کے نیچے اتری، مسجد کے صحن کو پار کر کے وضو خانے سے ہاتھ دھوئے وضو کیا صحن میں کونے میں جہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے وہاں نماز ادا کی اور لاھوت کے ساتھ باہر نکل آئی۔

''دل کو عجیب طرح کا سکون ملتا ہے نا لاھوت، جب کبھی دل سے نماز ادا کی جاتی ہے، تم ویسے کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں سوچ رہا ہوں بازاروں میں کتنے لوگ ہوتے ہیں اور مسجدوں میں بس جمعے کے جمعے، یہ ہجوم نظر آتا ہے، باقی گنتی کے لوگ نظر آتے ہیں۔''

''اور میں سوچ رہی ہوں شکر ہے گنتی کے لوگ تو آتے ہیں سب کو اگر نہیں تو کسی کو تو اللہ کے گھر سے تعلق ہے۔''

''سب ڈر کے مارے آتے ہیں امرت، بہت کم محبت میں آتے ہیں۔''

''مگر لاھوت آتے تو ہیں نا، یہ بھی بڑی بات ہے، کچھ متلاشی ہیں اس کے سوا اور کیا چاہیے۔''

''تمہارے اندر صبر کب آیا اور کیسے آیا؟ جاننا چاہتا ہوں۔''

''صبر کہاں سے آیا ہے لاھوت، ابھی تو شکر بھی نہیں آیا، بس ذرا سا تحمل آ گیا ہے جو صبر شکر کی جھلکیاں دکھاتا رہتا ہے۔''

''تحمل کیسے آیا اب یہ نہ پوچھنا لاھوت۔''

''مگر یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں لاھوت، مگر ہم فی الحال گھر چلے جائیں؟ میں تھک گئی ہوں اصل میں۔''

''اگر تم نہ تھکی ہوتیں تو ہم ہمارے پہلے باغی سے ملنے کے لئے ضرور جاتے، مگر پھر بھی، میرے پاس ان کی ایک اور ڈائری تھی، مجھے پتہ ہے وہ مجھ سے مل کر خوش ہونگے اور حیران بھی۔''

''میں تھک گئی ہوں لاھوت، تم ان سے ملنے جا سکتے ہو، مگر میرا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوگا۔''

''کیا تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ لاھوت میں واقعی بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے لاھوت کی بات کاٹ دی۔

''کوئی وجہ؟'' وہ جی بھر کر حیران تھا مگر الجھا ہوا۔

''لاھوت ایک تو تمہیں علی گوہر کی طرح ہر بات بتانا پڑتی ہے، مگر کئی باتیں وہ سمجھ جاتا ہے، کئی باتیں تم بھی سمجھ جایا کرو، اب ہر کوئی تمہارا علی گوہر تو نہیں بن سکتا نا۔''

''ویسے علی گوہر ہے کیا چیز مجھے اسے دیکھنے کی خواہش ہے۔''

''میرا علی گوہر۔'' وہ ہنسی۔

''خدا کے لئے لاھوت عمارہ کے سامنے علی گوہر کو کسی سے بھی منسوب نہ کرنا ورنہ وہ دیار غیر میں تمہیں سستا چھوڑے گی۔'' وہ ہنستی ہی چلی گئی، کتنی دیر بعد ہنسی تھی۔

''اب یہ نہ پوچھنا کہ عمارہ کون ہے؟''

''عمارہ وہ ہے جو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''سوچ رہا ہوں تم سب لوگ بہت عجیب کیوں ہو۔'' وہ مین سڑک تک آ گئے تھے۔

''سوچ رہی ہوں اس سے زیادہ عجیب تم ہو لاھوت جو ہم جیسے سیدھے انسانوں کو عجیب کہہ رہے ہو۔''

''خیر تو اللہ حافظ کہیں اب۔''

''ہم پھر کل ملیں؟'' وہ بے چینی سے پوچھنے لگا تھا۔

''کل نہیں، کل مجھے دفتر جانا ہے جہاں بہت سا کام پڑا ہوا ہے میرے انتظار میں، ہم جلدی ملیں گے۔''

''مجھے تم سے گاؤں کے بارے میں پوچھنا ہے۔''

''بہت ساری باتیں، مجھے بھی تم سے باتوں کا اتنا ہی تجسس ہے جتنا کہ تمہیں۔''

''فی الحال تم سے مل کر حیران ہوئی ہوں اور خوش بھی۔''

''دنیا گول ہو نہ ہو ہم ایک دائرے میں گشت کرتے پھرتے ہیں، پھر آ ٹکرائیں گے سارے۔''

''تم اپنے سوالات سنبھال کر رکھو اور اپنا خیال رکھنا۔'' وہ رکشہ روک کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''بلکہ سنو، کل کے بعد جب بھی دل چاہے ملنے آ جانا گھر پہ، پتہ ٹیکسٹ کر دیتی ہوں۔''

''یہ اور بھی ٹھیک ہے، میں واقعی بہت خوش ہوں۔'' رکشہ آگے بڑھ گیا۔

امرت کی مسکراہٹ رہ گئی، لہجہ رہ گیا، اس کے پاس، اسے لگا دیار غیر میں کوئی اپنا نظر آیا تو جیسے سارا شہر ہی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا، ایسا واقعی ہوا تھا۔

☆☆☆

عصر کیسے مغرب اور مغرب کیسے عشاء میں تبدیل ہوئی تھی اور عشاء تھم تھم کر جیسے چل رہی تھی، یہ ساعت وقت دل سے گزر کر جا رہی تھی۔

ھالار نے مایوس معصومیت کے ساتھ علی گوہر کی طرف دیکھا تھا، وہ دونوں پاگلوں کی طرح ہر اک اسٹاپ سے ہو آئے تھے، بس والوں سے اتا پتہ پوچھا حلیہ بتایا، نصیب تھا کیسا کہ وہ بس ان کے پہنچنے سے کچھ منٹ پہلے ہی روانہ ہو گئی تھی جس کے کنڈیکٹر نے فنکار سے کرائے پر تقرار کی تھی، وہ تھک ہار کر سندھو کنارے آ بیٹھے تھے۔

''دل کیا کہتا ہے ھالار؟'' ھالار کئی دیر سے چپ تھا۔

''دل کی بات مت کرو علی گوہر بس پوچھو میرے دماغ کی جو سائرن بجا رہا ہے، وہی جسے

''حالی، گوہر کی جان، اٹھ چل یار، تھک گئے ہیں، اماں جاگتی ہوں گی۔''

''وہ پوچھیں گی کہ جسے ڈھونڈنے گئے تھے وہ ملا؟'' حالار کی مسکراہٹ ایک بار پھر غائب ہو گئی تھی۔

''اگر پوچھیں گی تو کہہ دیں گے، اسے ڈھونڈنے اگر روز نکلنے لگے تو ایک روز مل ہی جائے گا، کیونکہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔'' حالار ایک بار پھر لاجواب ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تو پہ تمیں چاہیے ابھی کرے مگر دل میں گھر کر لیتا ہے، دیوانہ ہے نا۔'' حالی پھر سے تھکی مسکراہٹ مسکرایا۔

''کہتے ہیں دیوانہ ہے، دیوانے کے منہ نہ لگو تو اچھا ہے۔'' علی گوہر ہنسا کھوکھلی مگر ترنگ بھری ہنسی، کسی سرنگ سے نکلی آواز جیسی، جو بھی سیٹیاں بجاتی ہے تو بھی دل بجنے لگتا ہے، حالار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چل دوست! اماں انتظار کرتی ہونگی۔''

''ہم دوست بن گئے ہیں؟ ارے واہ۔'' حالی خود ہی اپنی بات پر حیران ہوا۔

''ہاں جب عمارہ اور امرت دوست بن سکتی ہیں تو پھر علی گوہر اور حالار کیوں نہیں بن سکتے۔'' وہ پرانے ساتھیوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھے تو سندھو کی لہروں میں ایک بار پھر ٹھہراؤ سا آ گیا۔

موجیں پھر ابھرنے لگیں، موجوں کا دل سطح پر تیرنے لگا۔

''ارے موجوں کا بھی دل ہوا کرتا ہے کیا۔'' یہ کوئی فنکار سے پوچھتا تو فنکار نے کہنا تھا کہ۔

''کوئی شئے دل کے بغیر نہیں بنی، جہاں احساس وہاں پر دل کی موجودگی ہوتی ہے۔''

اب دل والے تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں نا، جیسے کہ علی گوہر جیسے کہ فنکار، جیسے کہ دیوانگی، جیسے کہ محبت۔

☆☆☆

رات کسی احساس کی طرح اس پر سے رینگتی ہوئی گزر گئی تھی، صبح فنکار نے آنکھ نوجوان کے گھر میں کھولی، رات کی مہمان نوازی نے اسے مطمئن ہی کر دیا مگر صبح صبح نوجوان ناشتے کی ٹرے لئے اس کے سر پہ کھڑا تھا۔

''یہ ناشتہ کریں اور سنئے کہ یہیں، میرے گھر والے مہمان کے ساتھ صرف ایک دن اچھا سلوک کرتے ہیں کھلاتے پلاتے ہیں، خوش رکھتے ہیں، صبح ناشتہ بھی ٹرے بھر کر دیتے ہیں، دوسرے دن بمشکل برداشت کریں گے، روکھا پھیکا جو بھی ہو گا ڈال دیں گے۔'' نوجوان کہتے ہوئے بیٹھ کر سیب کاٹنے لگا تھا۔

''تیسرے دن سیدھے منہ بات تک نہیں کریں گے اور اگر تیسرا دن چڑھ گیا نا تو پھر کہیں گے انخومیاں تھیلا سنبھالو اور چلتے بنو۔'' وہ کہتے ہوئے ہنس دیا۔

''آج پہلا دن ہے رات گزر گئی اچھی رہی، شام تک بڑے میاں نکلنے کی کریں، میں نہیں

چاہتا تین دن گزر جائیں اور پھر یہ نہ ہو کہ آپ کی بجائے مجھے میرا بستہ تھما کر کہا جائے نکلنے کی کرو اور میں تو ویسے ہی چھٹی پر ہوں چند دن میں پڑھائی شروع ہوگی تو چلا جاؤں گا اور اگر مہینہ گزر گیا تو اسے سر کا تاج بنا کر رکھ لیا، مہینے کے بعد گھر کا فرد بنا لیا، مگر اکتائے نہیں، یہ سوچ لیا کہ یہ ہمارے ہی گھر کا حصہ ہے، اس کے جانے پر اداسی ہوتی اور اس کے جانے کے بعد کئی دن اسے یاد کر کر کے باتیں ہوتیں، اس کی خیریت کے لئے پریشان ہوا جاتا، دریافت کیا جاتا، پوچھا جاتا، اس کی پیٹھ پیچھے دعائیں کی جاتیں، شالا سکھی رہے، انسان کو انسان سمجھا جاتا، بوجھ نہیں۔"

"ہوسکتا ہے ہماری بھی پچھلی سات پشتوں میں ایسا کچھ ہو مگر اب تو تصور بھی نہیں، گاؤں گوٹھوں کے فارغ لوگ جنہیں پھریوں اور محفلوں کے سوا اور آتا ہی کیا ہے بھلا۔" نوجوان نے بڑی دلچسپی سے سنا تھا اور جواب دیا۔

"ایک عرصہ گزر گیا، آپ لگتا ہے ابھی تک پرانے دور میں جی رہے ہیں۔" وہ سر جھٹک کر مسکرایا۔

فنکار اٹھا، نہ کوئی تھیلا نہ بستہ، نہ پیسہ نہ دھیلا، خالی ہاتھ ایسے چلا جیسے مرنے والا دنیا سے نکلتا ہے۔

"ارے بڑے میاں ناشتہ تو کرتے جاؤ، کہو تو گھر چھوڑ آؤں؟ ارے حیدر آباد والی بس میں بٹھا دوں گا۔" سیب سلیقے سے کاٹ کر پلیٹ میں اس کے آگے پیش کیا، وہ غائب دماغی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا ہوا بڑے میاں، کچھ پلے نہیں پڑا کیا؟" نوجوان نے اس کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"یہ بدتمیزی تھی۔" اس نے سوچا۔

"ہمارے گھر میں مہمان آتے نہیں تھے اور خوشی پہلے سے شروع ہو جاتی تھی، اس کے پسند کی چیزیں آنے لگتیں، چہل پہل ہو جاتی، وہ آتا تو گھر مہک اٹھتا، سارے لوگ آس پڑوس کے ملنے آتے، کھیریاں بجتی، چائے کے دیگچے چڑھائے جاتے، ساری ساری رات چائے چڑھتی رہتی، صبح پراٹھوں کے ساتھ مکھن ماکھی (شہد) پیش کیا جاتا، رات بھر رنگ سا چڑھا رہتا، حالانکہ حالات بھی برے ہوتے، شہری لوگ محبتوں میں کھو جاتے تھے مگر حالات اور چیزیں کسی نے دیکھیں بھلا، پہلا دن عید کا ہوتا۔" فنکار کھو گیا تھا۔

"دوسرا دن بھی عید تیسرا دن بھی عید، چوتھا خوبصورت پانچواں خوش آئند، اس سے زیادہ ہوئے تو بھی مہمان کو آنکھوں کا تارا سمجھا، سادہ چائے، کھلایا پر بیزار نہ ہوئے، نہیں کبھی نہیں۔"

"اب نہیں چھوٹے میاں، اب قطعی نہیں ناشتہ ہو سکے گا، اب طعنہ دے دیا تم نے، مگر رات ٹھہرانے کا جو احسان تم نے کیا اس کا اجر تمہیں وہ دے گا جس کی چاہ میں نکلا ہوں اور پہلا پڑاؤ تمہارے گھر کی دہلیز ملی تھی، دعا کرتا ہوں وہ تمہیں کبھی کسی ایسے شہر کا مہمان نہ بنائے جس کے ہاں رات گزارنے کے بعد تمہیں دن میں صبح سویرے بے چین ہو کر نکلنا پڑے اور جہاں تم دوسرا دن مشکل سے تیسرے دن کہیں کہ لو میاں اٹھاؤ تھیلا اور نکلنے کی کرو۔"

"بات کی معافی چاہتا ہوں، ناشتہ کر کے جائیں بڑے میاں۔" نوجوان کرسی سے اٹھا ہاتھ

جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''کوڑے سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے اٹھا کر کھا لوں گا، مگر اب عزت سے بیٹھ کر ناشتہ نہیں کیا جائے گا، ہاتھ نہ جوڑ میرے جوان، میرے شیر، تو اچھا ہے، اس لئے کہ تو سچا ہے، تو صاف بات بھی کرتا ہے، تیری نیت بھی اچھی ہے۔'' بندھے ہوئے ہاتھ تھام لئے۔

''ایک بات کہوں گا جب اپنا گھر بنانا تو قطعی کسی مہمان کو بلائے جان نہ سمجھنا، مہمان تو برکت لاتا ہے، محبت لاتا ہے اور محبت لے جاتا ہے۔''

''ارے چور اور مہمان میں بہت فرق ہوتا ہے شہزادے، چور چوری کرنے آتا ہے اور سب کچھ لے جاتا ہے، مگر مہمان عزت لے کر آتا ہے اور عزت لے کر جاتا ہے، چور چور ہوتا ہے اور مہمان مہمان ہوتا ہے، کنڈا نہیں چڑھانا کبھی دروازے کا، میرے بڑے کہتے تھے اللہ کو مہمان نوازی بڑی پسند ہے، چلتا ہوں یار۔''

''بڑے میاں! پلیز رک جائیں، تھوڑی دیر کے لئے ہی۔'' نوجوان کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا تھا۔

''میری جان اب نہیں رکا جائے گا۔'' فنکار کمرے کے بیرونی دروازے سے باہر آ گیا اور نوجوان اس کے ساتھ تھا۔

''میں آپ کو چھوڑ دوں، گھر تک چھوڑ دوں؟''

''گھر جانا ہوتا یار تو گھر سے نکلتا ہی کیوں؟''

''جہاں جانا ہو میں چھوڑ دوں؟''

''نہیں میرے یار، بس ایک کام کر اپنا نمبر مجھے دے دے تجھے تیرے پیسے ضرور لوٹاؤں گا۔''

''آپ مجھے کتنا شرمندہ کریں گے بڑے میاں۔'' وہ رو دینے کو تھا۔

''تو شرمندہ مت ہو، یہ تیرا قصور نہیں، تیری تربیت کا ہے، مگر کوئی نہیں، کبھی کبھار زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے، تجھے بھی سکھائے گی، دعا ہے کہ سارے اچھے اچھے سبق پڑھے تو زندگی ہے، کچھ تربیت زندگی میں بھی ہو جاتی ہے، کچھ تو وہ بھی سکھاتی ہے، چل میرا چاند، خوش رہ۔'' پیشانی چوم لی اور دعا دی۔

''مگر آپ جائیں گے کہاں سر؟''

''یار جہاں اللہ لے جائے گا، ایسی بے مکانی، اللہ اگر گلیوں میں بھی پھرائے تو بہت اچھا ہے، جو ہوگا نصیب۔''

''گلیوں میں تو خود پھر رہے ہیں، قصور سارا نصیب کا سارا کیا دھرا اللہ پر ڈال دیا۔'' نوجوان کا شکوہ بجا تھا۔

''ٹھیک کہتا ہے تو یار، ہے بڑا سچا، میں بھی ایسا ہوا کرتا تھا۔''

''تانگے تک چھوڑ دوں سر؟''

''یار نواز حسین کا تانگہ نہ ملے تو علی نواز کا ہی مل جائے، کچھ تو ملے۔'' وہ تانگہ اسٹاپ تک ساتھ آیا تھا، باتیں کرتا ہوا۔

"کہتے ہیں اک گھڑی ایسی ہوتی ہے، جس لمحے دعا کی جائے تو قبول ہو جاتی ہے، اس گھڑی کے لئے انسان ناشکرا ہو کر کہتا ہے کہ پتہ ہوتا تو کچھ اور مانگ لیتا، کوئی بڑی چیز سہی۔"
مگر فنکار نے کہا "اللہ اکبر" جب سامنے نواز حسین کا تانگہ دیکھا۔
نواز حسین کیا جیسے پوری دنیا نظر آ گئی، بکھرے حلیے والا پریشان نوجوان حیران ہو کر تانگے سے اترا جس کو دنیا نواز حسین کے نام سے جانتی تھی، فنکار کے ساتھ کھڑے کم عمر نوجوان نے حیرانی سے ایک لمحہ فنکار کو دیکھا تو دوسری نظر نواز حسین پر ٹک گئی، فنکار نے نوجوان کو گلے لگا کر پیار کیا، پتہ نہیں اور نواز حسین سے ایسے لپٹا جیسے کوئی بچھڑا ہوا ساتھی گلے لگا کر ملتا ہے اور رو لیتا ہے۔

☆☆☆

آگ کا الاؤ جلنے لگا، کچھ اندر بھی، کچھ باہر بھی، فنکار نے دہکتی لکڑی کے دوسرے سرے کو ایسے ڈرتے ہوئے پکڑا جیسے کوئی دکھتے ہوئے دل کی رگ پر ہاتھ رکھے، ہاتھ جل نہ جائے، کہ ڈر سے اور پھر ایسے ہی چھوڑ دیا اور جلنے دیا تو جلنے لگی۔
"جیسے دل کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے، دل اور مچلنے لگتا ہے، مچلنے دو، جل رہا ہے تو جلنے دو، یہ انسان بھی کیا چیز ہے اور کیا اس کا جلتا ہوا دل بھی، کبھی بندہ بس سے باہر ہے اور کبھی ہوتا ہے اس کا دل بس سے باہر۔" فنکار جلتی ہوئی لکڑی کو دیکھے گیا۔
جیسے کوئی دیکھتا ہے آنکھ میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کو اور پھر نگاہ غنیمت اس پر بھی ٹھہری یعنی کہ نواز حسین، آنکھوں پر آگ کے الاؤ کی روشنی کے سائے بھی اپنی جگہ، مگر دل کی کیفیت اگر آنکھوں پر نہ آئیں تو پھر کہاں جائیں کوئی اور جائے اماں بھی نہیں، پناہ بھی نہیں۔
آئینے میں عکس تھا اسی اداسی کا اور اسی کیفیت کا جس کا جلتا ہوا الاؤ اس نے امرکلہ کی آنکھ میں بھی دیکھا، دل میں دل سے محسوس کیا اور لہجے میں سنا تھا، بن کر آیا تھا اور چپ کر کے بیٹھا تھا۔
"نواز حسین میرے یار، کچھ تو بول سجن، سانپ سونگھ گیا، بچھو کاٹ گیا کیا ہوا؟ چلتے ہوئے گھوڑے نے اوندھے منہ رستے پر پٹخا ہے سر، کیا کیا ٹوٹ گیا؟" فنکار بے چین پہلے سے تھا بے قرار ہوا تھا اب بھی۔
"کیا کیا نہ ٹوٹا اور ٹوٹتا چلا گیا، میرا کم اس کا زیادہ۔"
"کس کا زیادہ نواز حسین؟ کہتے ہیں جس کا غم رلائے اس سے رشتہ گہرا ہو جاتا ہے، کس سے رشتہ جوڑ بیٹھے ہو۔"
"بہن کہہ بیٹھا ہوں اس چڑی کو، امرکلہ نام کی سسی، ماروی، ہیر، سوہنی بن بیٹھی ہے، کبیر بھائی کہتے تھے اسے عائشہ، کلثوم، جویریہ، زینب اور مریم بھی۔"
"یہ وہی ہے، یہ تو وہی ہے، یہ میرے ھالار والی، جس کے پیچھے میرا علی گوہر مارا مارا پھرتا ہے، وہ تیرے پاس تھی نواز حسین؟"
"وہ میرے ساتھ تھی، پچھلے کئی دنوں سے، میں نے اسے گولڑوی صاحب کے مزار پہ دیکھا، تب زینب میں کبیر بھائی کا وعدہ نبھانے آیا تھا۔"
"میں نے سمجھا منزل کے لئے رستے پر قدم اس نے رکھ دیئے ہیں وہ اب چلے گی، پھر

دوڑے گی، پھر پہنچ ہی جائے گی۔''

''پھر کیا ہوا نواز حسین؟ وہ چلی نہیں یا پھر دوڑ نہ سکی اور دوڑنے لگی تو کہیں گر تو نہیں گئی؟'' ذیکار پوری طرح متجسس تھا۔

''بولو نواز حسین۔''

''سر! وہ پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی، وہ رینگنے تو پہلے گئی تھی، اس نے سہارے کے ذریعے چلنا شروع کیا تھا، عنقریب تھا کہ وہ بغیر سہارے کے چلنا شروع کر دیتی تو وہ لڑکھڑا گئی، درگاہ کے مٹکے بھرتی تھی وہ، لنگر تقسیم کرنے لگی تھی، لوگ اس سے دعائیں لیتے تھے، لوگوں کو وہ تسلی دینے لگی تھی، وہ پرسکون ہونے لگی، نکھرنے لگی تھی، کہ پھر سے دل کے سمندر میں سونامی آ گیا، وہ بکھر گئی، وہ چلانے لگی، چیخنے لگی۔'' نواز کی آنکھیں برسنا شروع ہو گئیں تھیں۔

''اس نے یوں تماشہ لگایا، ایسا شور مچایا ڈھکو سلے کا، ایسے تماشا کھڑا کیا کہ میں دنگ رہ گیا، اندر چل کر سلام نہیں کرنا تھا تو نہ کرتی مگر واویلا تو نہ کرتی، شور تو نہ کرتی۔'' وہ روتے ہوئے چپ ہو گیا۔

''او نواز حسین، او چڑیا، اور درویشا، وہ بوجھ نہ اٹھا سکی، او چڑیا بات بڑی تھی عمر چھوٹی تھی، بات کا وزن زیادہ تھا، ذمہ داری بڑی تھی، اٹھا نہ سکی، رستے سے پلٹ آئی، پتہ ہے جب پاؤں پاؤں چلنے والے چھوٹے سے بچے کے پاؤں پر کلہاڑی رکھ دی جائے، یا پھر پتھروں کی برسات ہونے لگے تو وہ چیختا ہے، چلاتا ہے، سر پٹختا ہے اور سر پٹخ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔'' بے چین لہجے میں اک ایسا یقین کا ٹھہراؤ سا آ گیا جیسے ذیکار کبھی بے چین ہوا ہی نہ ہو۔

''سر!'' نواز حسین سمجھنے کے وچار میں تھا، پڑ گیا وچار میں اور سمجھنے لگا۔

''بہت بڑا بار پڑنے لگا تھا چڑیا، فیض مل رہا تھا اسے اس کی دعائیں قبول ہونے لگی تھیں۔''

''لوگوں کا عقیدہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، بات کچھ کی کچھ ہوتی جا رہی تھی، سرکار کو اس کی خدمتیں پسند آ گئی ہوں گی لوگوں کا تانتہ بندھنے لگا تھا، اندر سے مسلمان ہے وہ دل اس کا مسلمان کی طرح اجلا انسان کی طرح ستھرا، مگر ظاہر بدلنے لگا تھا اس کا، ظاہر باطن کو دکھانے لگا ہوگا، جب ظاہر اور باطن ٹکرانے لگیں تو جنگ چھڑ ہی جاتی ہے، زوروں کی جنگ چھڑتی ہے، تھمتی ہی نہیں ہے، جنگ تو چھڑنا تھی، بلاشک چھڑ گئی۔''

''آپ کو کیسے پتہ لگا، مجھے نہ لگ سکا کبھی، میں نے سمجھا، وہ پھر سے بے راہ ہو گئی ہے، سائیں نہ کہیں خفا ہوں۔'' نواز حیرتوں کے سمندر میں ڈوب کر تیرنے لگا۔

''کئی چیزوں سے گزرا ہوں، کئی تو دیکھ رہا ہوں، او نواز او چڑیا، کہتے نا بال دھوپ میں نہیں سفید کیے۔'' نواز حسین جیسے برف کا گولہ بن گیا تھا۔

''وہ چلاتی اگر تو مر جاتی، وہ اگر نہ چیختی تو گھٹ جاتی، ختم ہو جاتی، راکھ بن جاتی نواز حسین تیری امر کلہ اور اگر راکھ بن جاتی تو اڑ جاتی، تو پھر کہاں اسے ڈھونڈتا پھرتا، دیوانہ ہو جاتا، چیختا، چلاتا، پاگل بن جاتا، اگر نہ چیختا چلاتا، زری ایکٹ کرتا تو پھر تو بھی جل جاتا تھا، جل جاتا، جل کر راکھ بن جاتا، راکھ بن کر اڑ جاتا اور اگر تو اڑ جاتا میرے سجن تو تجھے کون ڈھونڈنے نکلتا، جو

ڈھونڈنے نکلتا وہ بھی تو مر جاتا، راکھ بن جاتا اور اڑ جاتا، تو پھر کون اسے ڈھونڈتا وہ بھی اڑ جاتا، راکھ بن جاتا، دھول ہو جاتا۔''

☆☆☆

''محبت انسان پر امرت بن کر اترتی ہے اور گھل جاتی ہے، انسان کے اندر بھی اور باہر بھی، گھل کر دل کے اندر ڈھل جاتی ہے۔'' لاھوت اس کے ساتھ سیدھی سڑک پر چل رہا تھا۔

''تم نے اس کے محبت کے باب پڑھے ہوئے ہیں لاھوت؟'' وہ مسکرائی اور کھلے دل سے، یہ لاھوت محسوس کر رہا تھا اس لئے کہ جب کھلے دل سے کوئی مسکراتا ہے تو اس کی آنکھوں میں عجیب چمک آ جاتی ہے اور وہی چمک ابھی امرت کی آنکھوں کا نور بنی ہوئی تھی۔

''تمہیں کبھی کسی نے کہا کہ تم مسکرا کر اچھی دکھتی ہو۔''

''عبدالحنان اس طرح کی باتیں نہیں کیا کرتا لاھوت۔''

''یہ عبدالحنان کون ہے امرت؟''

''عبدالحنان ایک مسٹری ہے لاھوت تم نہیں سمجھو گے۔''

''وہ بہت خاصیت رکھتا ہے تمہارے لئے؟'' لاھوت اور مسکرایا اور مسکرا کر اچھا لگنے لگا تھا، وہ اسے کہنا چاہتی تھی اور کہنے لگی۔

''لاھوت پتہ ہے تم بھی مسکرا کر اچھے دکھتے ہو، کبھی کسی نے کہا۔''

''میری زندگی میں کوئی عبدالحنان نہیں آیا ابھی تک۔'' وہ ہنسا تھا۔

''تمہاری زندگی میں عبدالحنان نہ ہی آئے تو بہتر ہے۔'' وہ بھی ہنسی۔

حالانکہ عبدالحنان کے نام پر اس کی ہنسی ہمیشہ غائب ہی ہو جاتی تھی، اسے یاد آیا کئی دن سے اس کی اس سے بات بھی نہیں ہوئی جبھی دن رات میں اتنا چین ہے، اس خیال نے اسے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

''اب تم کیوں ہنس رہی ہو؟''

''میری ہنسی کو چھوڑو لاھوت تم گاؤں کا بتاؤ؟'' وہ آگے آ کر بینچ پر بیٹھ گئے دونوں۔

''بہت برے حالات ہیں امرت۔''

''اس سے کہیں زیادہ برے جتنے دنوں میں، میں نکلی تھی۔''

''امرت بہت ہی، سمجھ سے باہر، میں چھوڑ آیا ہوں، دل چاہتا ہے کبھی نہ جاؤں، باغی بن کر آیا ہوں۔''

''باغی نہیں بھگوڑا کہو لاھوت۔'' مسکراہٹ ہنسی کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔

امرت اپنے خیال میں وہاں پہنچ گئی جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی، بلکہ اس سے بھی پہلے سے جب اس کا خیال متحرک نہیں تھا، جبکہ جب اس کا خیال ہی نہیں تھا۔

کہانی تیزی سے پیچھے کی طرف جا رہی تھی، کہانی ماضی بن رہی تھی، لاھوت اور امرت تب کی باتیں لے کر بیٹھے تھے، جب سے خیال متحرک ہونا شروع ہو گئے تھے، مگر کہانی ان کے خیال متحرک کی محتاج نہیں تھی۔

کہانی صرف خیال کی محتاج ہوتی ہے اور خیال وقت کا محتاج نہیں ہوتا، جبھی پیچھے بہت پیچھے کی طرف جا رہے تھے، خیال نے ماضی کے روٹ سے جھانکا، بات وہاں سے شروع ہوئی تھی جہاں پر بات ختم ہوئی تھی، جو باب تھا محبت کے انجام کا، حقیقت کے آغاز تھی، محبت نے زبردست کروٹ لی تھی اور پانسا پلٹ گیا، تختہ الٹ گیا، کہنا ٹھیک ہوگا کہ تخت شاہی الٹ گیا۔

جب کمرے میں بہت سارے کاغذ تشنہ بکھرے پڑے تھے، پین برش کھڑکی سے باہر کچرے کے ڈبے میں سسک رہے تھے، اپنی قسمت پر رو رہے تھے اور کمرے میں چیخ و پکار کے ماحول میں بے طرح چیزیں پٹخی جا رہی تھیں۔

چیزوں کا شور الگ، آوازوں نے کمرہ سر پہ اٹھا رکھا تھا، زمین کا یہ حصہ، کمرے میں لڑتے جھگڑتے دو لوگوں کو زیر زمین ختم کر رہا تھا، زیر زمین محبت دفن ہو رہی تھی اور دو چار ماہ کی چھوٹی سی بچی بری طرح بلک رہی تھی۔

بھلا ہو خیال یادداشت اور عمر کا عرصے کا وقت کا جس وجہ سے امرت کے ذہن میں دبی یہ چنگاری خود اس سے مخفی تھی، خیال اس کی پہنچ سے بہت دور بھاگتا تھا، مگر ہاں اپنی موجودگی کی وجہ سے ڈستا تھا، ڈنک مارتا تھا اور جب ڈنک مارتا تھا تو زہر پھیلاتا تھا۔

زہر نے ذہن کو آلودہ کر رکھا تھا، مگر ختم نہیں کیا تھا یہ ایسا زہر تھا جو زندگی کی تلخیوں میں گم ہو جاتا تھا زندگی اس سے زیادہ تلخیوں سے بھری تھی، تو بات وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب دو ماہ کی بچی بلک رہی تھی اور کمرے میں دو افراد محبت کا تماشا کر رہے تھے ہر چیز اپنی جگہ پر بے بس تھی، خود وہ، خود یہ دو لوگ، خود اس کا خیال یہاں تک کہ حقیقت بھی۔

(باقی آئندہ ماہ)

آبلہ پا
فرحت طاہر
WWW.PAKSOCIETY.COM

"امی جی! میں آ گیا ہوں، بہت شدید بھوک لگی ہے، پلیز جلدی سے کھانا لگا دیں، جب تک میں چینج کر کے آتا ہوں۔" معمول کی طرح گھر میں داخل ہو کر اس نے بھوک کا نعرہ بلند کیا تھا، اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا، اس سے وہ کافی تیزی میں دیکھائی دے رہا تھا، کتابیں بغل میں دبائے دائیں ہاتھ سے شرٹ کے اوپری بٹن کھولتا وہ کافی مصروف و مگن دکھائی دے رہا تا، اس سے پہلے کہ وہ اپنے کمرے میں غروب ہوتا، آبگینے کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیئے۔

"کیسے ہو محسن......؟" وہ ایڑھیوں کے بل گھوما، اس سے اس کی نظروں کے سامنے آبگینے کا مسکراتا چہرہ تھا، جیسے دیکھ کر اس ماتھے پر کوفت بھری شکنیں فوراً نمودار ہوئی تھیں، جیسے اس نے چھپانے کی ذراسی بھی کوشش ہیں کی تھی۔

"تم آج پھر یہاں؟ کیا اپنے گھر میں تمہارا دل نہیں لگتا۔" اپنی ناگواری کو اس پر ظاہر کرتا اس نے کمرے میں قدم رکھ دیے، آگے بڑھ کر کتابیں سٹڈی ٹیبل پر رکھی اور بیڈ پر ٹک کر شوز اتارنے لگا، آبگینے اس کے پیچھے بنا اجازت ہی اندر چلی آئی تھی۔

"میرا دل تو اس گھر میں موجود رہتا ہے تو اپنے گھر میں میرا دل کیسے لگے گا؟"

وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی اس کی چیخ چیخ کر نمایاں ہوتی بے زاری محسوس کرنے کے باوجود بھی انتہائی لگاوٹ سے اس کو اطلاع بہم پہنچا رہی تھی۔

"اُف......تم......وہ بات کرو جو کرنے آئی ہو، اس کے بعد یہاں سے چلتی نظر آؤ۔" اب کی بار اس نے ہر تکلف کو بلائے طاق رکھ کر اس کو صاف صاف ہری جھنڈی دیکھائی تھی۔

مکمل ناول

''تم کس قدر ظالم ہو محسن، ایک حسین و جمیل لڑکی تمہاری راہ میں رل رہی ہے، تمہاری ایک نظر کو ترستی ہے، تمہاری اس قدر جلی کٹی باتیں بھی امرت سمجھ کر پی جاتی ہے، اس سب کے باوجود بھی تمہارا دل نہیں پسیجتا؟ آج میں صرف تمہاری خاطر اتنے اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی صرف تمہاری ایک نظر کی چاہ میں، مگر تم ہو کہ......؟'' وہ منہ لٹکائے خاصی مایوس و دکھی دکھائی دینے لگی تھی، ذرا دیر پہلے والی تمام خوشگواریت پل میں اڑن چھو ہوئی تھی، محسن نے جھک کر شوز اٹھائے اور آگے بڑھ کر شوز ریک میں رکھ دیئے اور پلٹ کر ایک بار پھر اس کے مقابل آ گیا، بہت غور سے اسے سرتا پیر دیکھنے کے بعد اس نے اس کے چہرے پر نظر جمائی اور کہنے لگا۔

''آبگینے رحیم! کیا تمہیں احساس ہے کہ تم ایک لڑکی ہو کیوں اس طرح خود کو پلیٹ میں سجا کر پیش کرنے چلی آتی ہو؟ تمہیں اندازہ بھی ہے تمہاری انہی حرکتوں کی وجہ سے تم آج میرے دل میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں بنا سکتی ہو، بلکہ سچ پوچھو تو تمہاری ہی وجہ سے میرے دل میں اگر کبھی تمہاری کوئی جگہ تھی بھی تو اب وہ بھی ختم ہو چکی ہے، کیوں بار بار میری راہ میں آ کر اپنا اور میرا وقت برباد کرتی ہو؟'' اس کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا، اپنے لفظوں کی سنگینی کا شاید اسے خود بھی احساس نہیں تھا، اپنی اس قدر انسلٹ ہوتے دیکھ کر اس کی سرخ ہوتی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں مگر وہ بالکل خاموش تھی۔

''میں نے تمہیں بارہا مرتبہ بہت صاف لفظوں میں تمہیں سمجھایا ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے نہ ہی میں تم میں کسی قسم کا انٹرسٹ رکھتا ہوں میں کبھی تم سے شادی نہیں کروں گا، اس کے باوجود بھی تم ہر بار میرے راستے میں آ جاتی ہو آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

''تم میری توہین کر رہے ہو محسن، یہ سچ ہے میں تم سے محبت کرتی ہوں مگر اس کا ہرگز بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ہر بار اس طرح میری توہین کرو گے اور میں برداشت کرتی رہوں گی۔'' اس کا غصہ اس کے لفظوں سے بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''تو کیا کر لو گی تم؟'' محسن کا انداز سراسر تضحیک آمیز تھا، اسے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

''اپنی حد میں رہو محسن کریم، تم ہو کیا؟ سمجھتے کیا ہو خود کو؟ کبھی اپنی شکل آئینے میں دیکھی ہے؟ کچھ نہیں ہو تم، یہ تو میں ہوں جس نے تمہیں اس قدر اہمیت دے کر سر پر چڑھا لیا ہے، تمہیں تو فخر ہونا چاہیے مجھ جیسی لڑکی نے تمہاری چاہ کی ہے، ورنہ تم سے کوئی محبت تو کیا تمہیں کوئی پسند بھی نہ کرے۔'' اس کے چوڑے سینے پر انگلیوں کی ضرب لگا کہ اس نے غصے میں الٹے سیدھے لفظ بول کر جیسے اس سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہا تھا، محسن ہنس دیا۔

''شکل کی کیا بات کرتی ہو یہ شکل ہی تو ہے جو تم جیسی لڑکیاں پروانوں کی طرح آگے پیچھے پھرتی دکھائی دیتی ہے، یہ تو میں ہی ہوں جو تمہیں گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتا ورنہ۔'' وہ کچھ پل کو خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''اور کسی کی مجھ سے محبت یا پسند کی فکر تم مت کرو اس کی فکر کرنے والے میرے اپنے موجود ہیں۔'' اس کے سامنے سے ہٹ کر ذرا دور ہوا تھا، مگر آبگینے نے دوسرے قدم پر ہی اسے دوبارہ دھر لیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی طرف کرنا چاہا تھا، وہ مڑا نہیں تھا البتہ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''بہت غرور ہے تمہیں خود پر، تمہارے اس غرور کو اس وقت سچ جانوں، اگر تم کسی معمولی سی بھی لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کر کے دیکھا دو، اس سے شادی کر کے دیکھا دو میرا وعدہ ہے اسی وقت تم کو اپنی زندگی کیا، اپنی سوچ تک سے نکال دوں گی۔'' نجانے ایکدم سے اسے کیا ہوا تھا جو اس طرح کی بے تکی سی بات سے اسے چیلنج کر بیٹھی تھی۔

''خود سے متوجہ کرنا پھر اس سے شادی کرنا؟'' محسن کا قہقہہ بڑا بے ساختہ بلند ہوا تھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے یہ بہت مشکل کام ہے؟''

''کرو تو مانوں۔'' وہ اڑسی گئی تھی۔

''ا......اچھا......تو آبگینے رحیم، تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔'' وہ مکمل اس کی طرف پلٹا۔

''جو تم سمجھو۔'' تیکھے تیور کے ساتھ وہ اسے گھور رہی تھی۔

''چلو تو مجھے تمہارا یہ چیلنج قبول ہے خود پر تو مجھے بڑا یقین ہے، مگر میں یہ اختیار تمہیں دیتا ہوں کہیں انتخاب کرنے میں، میں کوئی ہیرا نہ ڈھونڈ نکالوں جس سے پھر تم کو شکایت ہوگی کہ ''معمولی لڑکی'' کی شرط طے تھی اس لئے اب معمولی لڑکی کا انتخاب بھی تم کرنا، باقی کا کام میرا ہوگا۔'' اس کی مسکراہٹ میں زمانے بھر کا زعم در آیا تھا۔

''اس کا خود پر اس درجہ یقین؟'' آبگینے ایک پل کو اس کا قدر یقین دیکھ کر ڈگمگائی، مگر کچھ سوچ کر اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے، مگر اسی پل باہر سے آئی گلزار کی آواز سن کر اچانک ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھی، دل میں آئے خیال کو دبائے اس نے فوراً کہا تھا۔

''وہ لڑکی گلزار ہے۔'' گلزار ان کے گھر سلائی کے کپڑے لینے آئی تھی وہ پیسوں کے عوض اس کی ماں اور بہنوں کے کپڑے سلائی کر دیا کرتی تھی، وہ کسی بھی طرح ان کے ہم پلہ نہیں تھی۔

وہ کسی بھی طرح محسن کے لائق نہیں تھی، مگر اپنی توہین میں پاگل ہوتی اسے نیچا دکھانے کی چاہ میں اس کے لئے گلزار کا انتخاب کر بیٹھی تھی، محسن نے اس کے انتخاب کو فوراً ہی بنا کچھ بھی سوچے قبولیت کی سند بخش دی تھی، شاید ان دونوں ہی کو احساس نہیں تھا کہ زندگی کو اس طرح گیم سمجھ کر کھیلنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا تھا۔

''مجھے منظور ہے۔'' آبگینے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا جہاں اس کے چہرے پر سجی دل ہلا دینے والی مسکراہٹ مزید گہری ہوتی جا رہی تھی ایک بار پھر اپنے ٹھکرائے جانے کے احساس نے اس کا دماغ جیسے الٹ کر رکھ دیا تھا۔

''اونہہ، میں بھی دیکھتی ہوں کیا کرتے ہو تم؟'' وہ واپسی کے لئے پلٹی۔

''ہاں ہاں جلدی ملاقات ہوگی تمہارے ہی پسند کیے انتخاب کے ہمراہ۔''

''انتظار کروں گی۔'' ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کی نذر کرتی وہ کمرے سے نکل گئی، محسن کچھ دیر اسی جگہ کھڑا سنجیدہ سا کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر واش روم کی طرف بڑھ گیا، فریش ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر آیا تو امی جی کھانا لگا چکی تھی وہ ہاتھ صاف کرتا فوراً چیئر گھسیٹ کر ٹیبل کے قریب بیٹھ گیا۔

''آج کیا پکایا ہے امی جی؟''

''ساگ اور بیسنی روٹی۔'' انہوں نے شفقت بھری مسکراہٹ لبوں پہ سجائے جواب دیا۔

''واؤ میرا فیورٹ کھانا، چھوٹی جلدی سے روٹی لے آؤ۔'' اس نے کچن کی طرف منہ کر کے

روٹی بناتی ریحانہ کو آواز لگائی تو اس کی آواز پر وہ فوراً گرم گرم روٹی لئے حاضر ہوئی تھی۔

''یہ لیں بھیا۔'' اس نے روٹی اس کے سامنے پلیٹ میں رکھ دی، محسن نے اتاؤلے پن سے گرم روٹی کا لقمہ توڑا اور ساگ لگا کر منہ میں رکھ لیا۔

''آرام سے کھاؤ لڑکے ورنہ منہ جل جائے گا۔'' امی جی نے مکھن کا کٹورا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جیسے اسے نصیحت کی۔

''سچ میں امی جی بہت بھوک لگی ہے۔'' لقمہ منہ میں چباتے اس نے کہا اور چمچ سے مکھن روٹی پر رکھ لیا، ریحانہ دوسری روٹی پکانے دوبارہ کچن میں جا چکی تھی، امی جی جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کے سامنے رکھتی ہوئی بولی۔

''آبگینے کو بھی ساگ بہت پسند ہے، بہترا روکا کہ روٹی کھا کر چلی جانا مگر وہ تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی ایک نہ سنی اور واپس چلی گئی۔''

رغبت سے روٹی کھاتے محسن نے ان کا افسوس بھرا لہجہ سن کر چونک کر سر اٹھایا، ایک دم ہی اس کے ذہن میں کچھ دیر پہلے اپنے اور آبگینے کے درمیان ہوئی باتیں تازہ ہوئی تھیں جسے یاد کر کے اس کی روشن پیشانی پر سوچ کی بہت سی شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

''چلی گئی تو جانے دی امی جی آپ کیوں اس کی فکر کرتی ہیں اسے چین کہاں ہے پھر آ جائے گی، ویسے بھی ہر وقت یہاں ہی پائی جاتی ہے۔'' وہ سر جھٹک کر دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''بری بات ہے بیٹا ایسے مت کہا کرو اس کے چاچا کا گھر ہے ہم سے محبت کرتی ہے، جبھی ملنے چلی آتی ہے، ورنہ اس کی دوسری بہن کو دیکھا کبھی اس طرح روز ہمارے گھر آتے۔'' انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''ہم سے محبت...... اونہہ، آپ کو کیا معلوم وہ کن چکروں میں یہاں آتی ہے۔'' وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

امی جی مزید کچھ کہتی مگر اسی پل گلزار کپڑوں کے شاپر ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئی۔

''خالہ جی، شائستہ اور ریحانہ نے تو اپنے کپڑے دے دیئے ہیں مگر اس بار آپ کا کوئی سوٹ نہیں ہے۔'' وہ مودب سی ذرا فاصلے پر کھڑی استفسار کر رہی تھی، محسن کے دماغ میں ابھی تک آبگینے کی باتیں تازہ تھیں اس نے کھانے سے ہاتھ روک کر بڑی غور سے گلزار کی طرف دیکھا جو اس کو نظر انداز کیے امی جی کی طرف متوجہ تھی۔

''تم معمولی شکل و صورت والی کم حیثیت گلزار کو اپنی طرف متوجہ کر کے دیکھاؤ اس سے شادی کر دیکھاؤ تو میں تمہاری زندگی میں پھر کبھی نہیں آؤں گی۔''

اس کی ساعتوں میں آبگینے کے لفظوں نے دستک دی تو اس کی پیشانی پر بچی شکنوں میں مزید اضافہ ہوا تھا، یہی وجہ تھی اس بار اس نے مکمل جانچتی نظروں سے گلزار کی سمت نظر کی تھی، درمیانہ قد، کمزور جسم اور صاف رنگت کی عام سے نین نقوش کی مالک گلزار کہیں سے بھی اسے اپنے قابل نہیں لگتی تھی، اس نے سر جھٹکنا چاہا مگر ایک بار پھر آبگینے کے لفظوں نے اس کے خیال کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔

''یہ چیلنج ہے، ہوا تمہارے لئے اگر میں ہاری تو تمہیں چھوڑوں گی ورنہ تمہاری ہار کی صورت میں تمہیں مجھے قبول کرنا پڑے گا۔''

''تمہیں قبول کرنا تو اب کسی بھی صورت

مجھے منظور نہیں ہے آبگینے رحیم، تم سے چھٹکارے کی خاطر تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ بڑا فیصلہ کن سا بڑبڑایا تھا، گلزار اب امی جی سے جانے کی اجازت طلب کر رہی تھی، وہ چونک کر حال میں لوٹ آیا بے دھیانی میں ہی صحیح مگر وہ مسلسل اس پر نظر جمائے ہوئے تھا، امی جی کو سلام کرتی وہ واپسی کے لئے مڑی تو اس کی مسلسل نظر کو محسوس کر کے ناگواری نظر محسن کی نذر کرنا چاہی مگر اس کے بدلے میں اس نے اپنی دلفریب سی مسکراہٹ سے نوازا تھا، گلزار کے بڑھتے قدم ایک دم رکے اس کے چہرے پر حیرت بھرے تاثرات ثبت ہوئے تھے، محسن دوبارہ زرینہ بیگم کی طرف متوجہ ہوتا اس کی طرف سے انجان بن گیا۔

"بعض اوقات نگاہیں کس قدر دھوکہ کھا جاتی ہیں۔" انجان بنے محسن پر الوداعی نظر ڈال کر اپنی نظروں کا دھوکہ سمجھتی وہ دروازہ پار کر گئی۔

☆☆☆

"ارما یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟" وہ جو آسمان کی وسعتوں پر نظر جمائے، ارد گرد سے بے نیاز نجانے کس سوچ میں گم تھی، اس کی آواز پر چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی، پھر جواباً بولی۔

"بس یونہی نیچے دل گھبراتا ہے میرا، وحشت ہوتی ہے مجھے سب لوگوں کے آنسو ضبط کرتے چہرے دیکھ دیکھ کر، جانتی ہوں انہیں دکھ ہے وہ رونا چاہتے ہیں تو پھر کھل کر وہ اپنے غم کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ کیوں گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہے ہیں؟" وہ اس کے برابر بیٹھ چکا تھا، جبکہ وہ سر جھکائے اپنے ناخنوں کو کھرچتی یاسیت کا شکار دکھائی دے رہی تھی اس کے ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی بھی جواب نہیں تھا جبھی وہ خاموش بیٹھا تھا وہ خود سے ہم کلام ہوتی بڑبڑائی۔

"اللہ نے میرے بابا جانی کو بہت جلد اپنے پاس بلا لیا۔" وہ لب بھینچے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"مجھے بابا جانی بہت یاد آتے ہیں وسیم۔" ضبط کے باوجود بھی چند آنسو پلکوں کا بند توڑ کر رخساروں پر لڑھک گئے، وسیم اسے دیکھ کر رہ گیا، اس کا غم بہت بڑا تھا وہ دلاسے میں اسے دیتا بھی تو کیا؟

"نیچے جانے کو میرا دل ہی نہیں کرتا، ہر طرف بابا جانی کی یادیں بکھری پڑی ہیں، دل کرتا ہے میں خود بھی مر جاؤں۔" غم حد سے سوا ہوا تو وہ سسک اٹھی، اس کو اس طرح روتے دیکھ کر وسیم تڑپ کر بولا تھا۔

"ارما پلیز رونا بند کرو، تم ایسی باتیں مت کیا کرو، اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے اس بات سے تو تم بھی واقف ہو اس کے بھی اگر تم یونہی روتی رہی تو ماموں کو بہت تکلیف ہو گی، کیا تم چاہتی ہو ماموں وہاں بھی تمہیں یوں روتے دیکھ کر تکلیف میں رہیں؟" اس نے بڑے نرم لہجے میں بڑے جذباتی سے لفظ ادا کیے تھے، جس کا اس پر اثر بھی ہوا تھا۔

"ہرگز نہیں میں کبھی بھی اپنے بابا جانی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔" اس نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

"گڈ گرل۔" وسیم مسکرا دیا۔

"وعدہ کرو تم آئندہ کبھی نہیں رؤو گی۔" ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے اس نے وعدہ چاہا اس نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، جیسے اس نے بڑی محبت و نرمی سے تھام کر اس کا دھیان ہٹانے کے لئے کہا تھا۔

"اتنے دنوں سے تم کہیں گھومنے ہی نہیں گئی

ہو، چلو آج کہیں باہر چلتے ہیں۔"
"کہاں؟" اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
"آئس کریم پارلر۔"
"نہیں بابا جانی ڈانٹیں گے اتنی ٹھنڈ میں آئس کریم رہنے دو۔" بے خیالی میں وہ کہہ تو گئی مگر جب خیال آیا تو اپنی زبان دانتوں تلے دبا گئی۔
"میرے بابا جانی۔" ایک ہلکی سی سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی اپنا ہاتھ چھڑاتی وہ اٹھی اور چھت سے نیچے اتر گئی، وسیم اسے جاتا دیکھتا رہ گیا وہ جتنا بھی اس کا خیال بہلانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اتنا ہی پریشان کن سوچوں میں گھرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے لئے گلزار بہت آسان شکار ثابت ہوئی، یا شاید وہ اپنے حالات سے فرار چاہتی تھی، محسن کی ذرا سی توجہ، ایک دو بار کی مختصر سی ملاقات اور چند میٹھے لفظوں کے بعد وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آن گری، اونچا لمبا، سرخ و سفید رنگت کا مالک محسن کریم خود اس کی چاہ کر رہا تھا یہ خیال ہی اس کے لئے خوش کن تھا، وہ خوابوں کی دنیا میں کھونے لگی تھی، آبگینے رحیم کے چیلنج کے ٹھیک دو ماہ بعد محسن نے خاموشی کے ساتھ گلزار سے نکاح کر لیا۔
اس خفیہ نکاح سے اگر واقف تھا تو وہ تھی آبگینے رحیم، گلزار کو نکاح میں لینے کے بعد وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔
"کہو آبگینے رحیم اپنی بات یاد ہے یا بھول گئی؟" اس کا مغرورانہ انداز آبگینے کو چڑاتا اور کچھ خاص جتلاتا محسوس ہوا تھا۔
اس کو چیلنج کرتے وقت اسے اپنے لفظوں کا احساس تھا یا نہیں مگر اس سے وہ منہ کھولے محسن کو دیکھے جا رہی تھی، اس وقت اسے ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا کہ محسن اس کی بات کو یوں حقیقت بھی کر دکھائے گا، یہی وجہ تھی وہ احساس ضیاع کے ساتھ ہارے ہوئے جواری کی مانند لٹی پٹی سی کھڑی تھی، خود اپنی نادانی میں اس نے اپنی چاہت کو کسی دوسرے کی جھولی میں بن مانگے ہی ڈال دیا تھا، اسے حقیقتاً یقین نہیں تھا کہ اونچے نسب سے تعلق رکھنے والا محسن اس کی ضد میں گلزار جیسی کم حیثیت لڑکی کو قبول کرے گا، مگر شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے وہ چیلنج غصے میں ہی صحیح مگر ایک مرد کو چیلنج کیا تھا، وہ بھی اس مرد کو جس نے ہمیشہ اس کو ناپسند کیا تھا، محسن کریم ایسا ہی ایک مرد تھا جو کسی کے بھی کیے چیلنج کو ناک کا مسئلہ سمجھ کر ہر صورت اسے پورا کیا کرتے ہیں اور پھر یہاں تو وہ آبگینے سے ہر صورت جان چھڑانا چاہتا تھا، سو اس نے اس کے چیلنج کو پورا کیا اور اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
"اس قدر خاموش کیوں ہو آبگینے رحیم؟" تلخی سے مسکراتا وہ اسے سخت برا لگا تھا، ایک تو اس کی دنیا ویسے ہی زیر و زبر ہو رہی تھی اوپر سے اس کا انداز، مگر اس سب پر بجائے غصہ کے اسے دکھ ہو رہا تھا۔
"یہ تم نے کیا کیا محسن کریم، میں نے تو وہ سب مذاق کیا تھا، جبھی اس سب کو بھلا بھی دیا تھا، تمہاری اس درجہ ناپسندیدگی کو محسوس کر کے میں نے تمہارے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا کہ شاید میری غیر موجودگی کو محسوس کر کے تمہارے دل کے کسی کونے میں میری جگہ بن جائے، مگر تم.....؟" اتنی دیر بعد وہ بولی بھی تو کیا، سارا تنتنا جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا، وہ اب اس کا نہیں تھا، وہ اب اس کا کسی بھی طرح نہیں، ہو سکتا تھا وہ اسے نا

پسند کرتا ہے اس بات کا ثبوت بھی اس نے گلزار سے نکاح کے بعد دے دیا تھا۔

''مذاق؟''

''یار، اب مذاق تو مت کہو آبگینے، یہ کہو کہ ہار برداشت نہیں ہو رہی تمہیں۔'' وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

''خیر اب اس سب کو چھوڑو یہ بتاؤ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے یا مجھے یاد کروانا پڑے گا۔''

''مجھے یاد ہے۔'' وہ سر جھکا گئی کہ اب اس کے پاس اختلاف کا بھی کوئی حق اس کے پاس نہیں تھا، ایک آخری نظر کی خواہش کے باوجود بھی وہ چاہنے کے باوجود اس سے نظر تک نہیں ملا پا رہی تھی، اب بولنے کو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، مگر پھر بھی اس نے کہا تھا۔

''محسن تمہیں شاید اندازہ بھی نہیں ہے تم نے کیا کر دیا ہے، ایک مجھے اپنی زندگی سے نکالنے کے لئے تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا ہے، تم نے سوچا اس خبر سے چچا چچی پر کیا قیامت ٹوٹے گی۔'' سب کچھ بھلائے وہ ایکدم ہی جیسے جگی تھی، مگر محسن نے اسے بری طرح ٹوک دیا۔

''یہ سوچنا تمہارا مسئلہ نہیں ہے یہ میرا مسئلہ ہے میں خود اسے ہینڈل کرلوں گا میں نے جو بھی کیا، اس کو جانے دو، میرے لئے یہ کافی ہے کہ مجھے ایک ناپسندیدہ ہستی سے چھٹکارا مل گیا۔''

اپنی شدید نفرت کا اظہار کرتا وہ وہاں سے جا چکا تھا، پیچھے کھڑی رہ جانے والی آبگینے اپنی بربادی پر دو آنسو بھی نہیں بہا سکتی تھی کیونکہ اس بربادی کی ذمہ دار وہ خود تھی، اسے عقل آئی بھی تو ایسے موقع پر جب اس کے ہاتھوں سے پھسل چکا تھا، وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح افسوس و ملامت سے ہاتھ مسلتی اسے خود سے دور جاتا دیکھتی رہ گئی، آبگینے کو تو وہ جھٹلا آیا تھا مگر تنہائی میسر آتے ہی اس کی کہی تمام باتیں سوالیہ نشان بنتی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

ضد اور انا کے چکر میں نتائج کی پروا کیے بغیر اس نے گلزار سے رشتہ تو جوڑ لیا تھا مگر اب وہ خود سوچ میں پڑ گیا کہ اس رشتے کو وہ سب کے سامنے کس طرح لائے گا؟ آج نہیں تو کل گلزار اسے اپنے ساتھ رکھنے کی فرمائش و ضد ضرور کرے گی تو اس وقت وہ اس کی فرمائش کیسے پوری کرے گا، کیا اس کے گھر والے اپنے اونچے نسب کے خاندان میں معمولی سی حیثیت کی حامل گلزار کو شامل کرلیں گے؟ اس سے گلزار خود ایک بڑی پریشانی بنی اس کے سامنے کھڑی تھی، کیا وہ گلزار کو طلاق دے دے؟

مگر اپنی ہار تو کسی صورت قبول نہیں تھی، خود کو بزدل سننا اسے کبھی بھی گوارا نہیں تھا، سر کو ہاتھوں پر گرائے وہ سخت ڈپریس دکھائی دے رہا تھا۔

''میں آبگینے کی تضحیک کا نشانہ بننا نہیں چاہتا۔'' اس نے خود اپنے ہی خیال کو جھٹک دیا اور پھر گلزار؟ اس سب میں اس کا کیا قصور تھا جو وہ اسے یوں اپنا مطلب نکال کر چھوڑ دیتا، اسے گلزار کا بھی احساس تھا، مگر وہ کرتا بھی تو کیا؟

یہ تو طے تھا اب وہ کسی بھی صورت گلزار کو یوں اتنا دور لا کر چھوڑ نہیں سکتا تھا، مگر وہ اسے اپنے ساتھ بھی تو نہیں رکھ سکتا تھا، یہی وجہ تھی۔

اب ہر وقت طرح طرح کی سوچیں اسے جھنجلائے رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی۔

اب پہلے کی نسبت وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جاتا تھا، یہ بات گھر کے ہر فرد نے محسوس کرلی تھی، اپنی اس کیفیت سے وہ خود بھی انجان رہتا اگر کریم صاحب اس سے اس کی کیفیت کے متعلق استفسار نہ کرلیتے۔

"کیا بات ہے محسن، کافی دن سے نوٹ کر رہا ہوں تم بہت الجھے الجھے سے دکھائی دے رہے ہو، کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ بیٹا۔" وہ جوان کے اس طرح اچانک بلاوے پر حیران پریشان سا ان کے کمرے میں آیا تھا، ایک مسلسل دھڑکا تھا جو اسے ڈرا رہا تھا کہ کہیں امی جی کو اس کے اور گلزار کے رشتے کی خبر تو نہیں ہو گئی، ان کے اس سوال پر وہ گڑبڑا کر بولا تھا۔

"نہیں نہیں تو ابا جی پریشانی تو کوئی بھی نہیں ہے، مجھے کیا پریشانی ہو گی بھلا؟" اپنی بوکھلاہٹ کو مسکراہٹ میں چھپائے اس نے الٹا انہیں سے سوال کر ڈالا تھا۔

"پریشانی تو کوئی بھی ہو سکتی ہے، جیسے پڑھائی کی پریشانی۔" انہوں نے پھر پوچھا۔

"ابا جی آپ کو معلوم ہے پڑھائی کی پریشانی مجھے کبھی نہیں ہوئی ہے۔" ان کے خیال کی نفی کرتا وہ ان کے پیروں کے قریب بیٹھ کر سر جھکائے ان کے پیر دبانے لگا۔

کریم صاحب ہنس دیے اس نے سچ کہا تھا وہ ایک لائق اسٹوڈنٹ تھا پڑھائی کے لئے اس نے انہیں کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔

"اچھا پھر شاید میں نے غلط محسوس کیا ہو، مگر بیٹا اگر پھر کبھی کوئی پریشانی ہو تو تم بھلا جھجک ہم سے کہہ دینا، خود کو کبھی پریشان مت کرنا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر ہی اندر شدید شرمندہ ہوا۔

"آبگینے رحیم تم نے بڑی مشکل میں ڈال دیا مجھے۔" وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

"ارما میں کل واپس جا رہا ہوں۔" چائے کا کپ ہاتھ میں لئے وہ اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھی چائے کے سپ لے رہی تھی، اس کی بات پر ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرے پیپرز کی ڈیٹ فائنل ہو گئی ہے اب مجھے واپس جانا ہو گا، ویسے بھی ماموں کی ڈیتھ پر آیا تھا اب تو سب مہمان بھی جا چکے مجھے بھی جانا چاہیے۔" وہ کہہ کر ذرا دیر کو چپ ہوا پھر بولا۔

"تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں کرتا مگر مجھے واپس جانا ہی ہو گا۔" اس کا رکھا کپ اٹھا کر اس نے چائے کا سپ لے کر کپ ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"تو کیا اب تم بھی مجھے چھوڑ جاؤ گے۔" وہ ایک دم ہی خاصی دلگرفتہ دکھائی دینے لگی تھی۔

"ارے دنیا سے تھوڑی نہ جا رہا ہوں منگیتر ہو تم میری دلہن بنانے تو تمہیں آؤں گا ناں، پھر کبھی نہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔" آخر میں وہ ذرا شوخ ہوا تھا، مگر وہ بری طرح بگڑ گئی۔

"ہمیشہ اول فول بولتے رہتے ہو تم، بہت شوق ہے تمہیں دنیا سے جانے کا جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" منہ پھلائے وہ وہاں سے جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناراض تو مت ہو پلیز۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا مگر وہ ہنوز ناراض سی منہ موڑے کھڑی رہی تو وہ خود اٹھ کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

"اچھا پلیز سوری ناں، آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کروں گی۔" اس نے معصومیت سے کان پکڑ لئے تو وہ ہنس دی۔

"پاگل۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"صرف تمہاری چاہ میں۔" وہ کہاں ہار ماننے والوں میں سے تھا فوراً جواب دیا تو وہ بلش ہوتی ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی، پیچھے وہ ہنستا ہوا وہیں

کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

نکاح کے بعد سے اب تک وہ ایک بار بھی گلزار سے ملنے نہیں گیا تھا زبردستی اور ضد کے اس رشتے سے وہ بھاگ جانا چاہتا تھا، مگر بھاگ بھی نہیں پا رہا تھا، وقت اور زندگی نے اسے ایک مشکل دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کرے بھی تو کیا؟ جب سوچ سوچ کر تھک گیا تو خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور چپ کر کے ایک طرف کو دبک سا گیا تب اس کا بہت سارا انتظار کرنے کے بعد ایک دن گلزار خود ہی کپڑوں کے بہانے اس کے گھر چلی آئی، جہاں محسن کا اس سے سامنا ہوا، بھی تو وہ نظر چرا کر اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتا تھا، وہ ایسا ہی کرتا مگر گلزار نے کسی طرح اسے اشارے کنائیوں میں ملاقات کا سندیسہ دیا اور وہاں سے رخصت ہو گئی، گلزار کی آمد اور اس کے اس سندیسے نے اسے مزید پریشان کر کے رکھ دیا، بہت سوچنے کے بعد بھی جب کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو گلزار سے ملاقات کے لئے پہنچ گیا۔

''محسن! آپ تو نکاح کے بعد سے جیسے مجھے بھول ہی گئے ہیں؟'' وہ کم عقل اس کی اس وقتی محبت کو حقیقت سمجھ کر اب محبوبہ بنی نخرے دیکھا رہی تھی، مگر دوسری طرف محسن اس کے انداز دیکھ کر کوفت کا شکار ہوئے جا رہا تھا۔

''بھولا تو نہیں تھا بس کچھ مصروفیت تھی۔'' خود کو سنبھالے اس نے گول مول سا جواب دیا۔

''مصروفیت تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں، آپ یہ بتائیں آپ نے ہمارے نکاح کے متعلق اپنے گھر والوں کو خبر کر دی یا نہیں؟''

''ابھی نہیں مگر جلد خبر کر دوں گا۔'' وہ کافی سنجیدہ دیکھائی دے رہا تھا۔

''نکاح کو اتنے دن گزر گئے ہیں ابھی تک تو بتایا نہیں آپ نے؟ اور کب بتائیں گے؟ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' پس نے اٹھلا کر اسے کچھ احساس کرانے کی کوشش کی تھی۔

''مگر میں تمہیں ابھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا ہوں ابھی تک تو میرے گھر والے بھی اس سب سے بے خبر ہیں؟'' وہ ایکدم پریشان ہوا تھا۔

دماغ کی صلاح تھی کہ سامنے کھڑی ہستی کو اس کی اوقات یاد دلا رہے، مگر دل نے دماغ کو ایسا کرنے سے باز رکھا، گلزار حقیقت سے انجان تھی وہ بے قصور تھی اور بے قصور کو سزا دینا اسے کبھی پسند نہیں تھا، سو چپ کر کے اسے برداشت کیے جا رہا تھا۔

''تو کیا ہوا؟ اس نکاح سے تو میرے گھر والے بھی بے خبر ہیں، محسن مگر ہم کب تک انہیں بے خبر رکھیں گے کبھی نہ کبھی تو انہیں حقیقت کا علم ہو ہی جائے گا؟ تو کیوں نہ آج ہی ان کو باخبر کر دیا جائے اور پھر ہم یوں روز روز پبلک پیلس پر ملاقاتیں بھی نہیں کر سکتے۔'' کتنی باتیں تھیں، کس قدر سوال تھے جو آج اس کی پٹاری سے نکلے جا رہے تھے، محسن نے حیرت سے اس کو دیکھا تھا۔

انسان اپنے اندر کتنے روپ چھپائے ہوتا ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ سامنے آ جاتے ہیں، یہ وہی گلزار تھی جو ان کے گھر آتی تھی تو ہمیشہ ان کی حیثیت سے مرغوب دکھائی دیا کرتی تھی اور اب وہ اس کے سامنے کھڑی فرمائشیں اور سوالات کیے جا رہی تھی، اس کی حیثیت کیا بدلی وہ تو اسے مشوروں سے نوازنے لگی تھی، وہ کہہ رہی تھی۔

''آپ اپنے گھر والوں سے بات کر لیں

مجھے میرے گھر والوں کی فکر نہیں ہے، ویسے بھی میرے پیچھے فکر کرنے والا ہے ہی کون بس ایک بھائی اور خود کی فکر کرتی تین بہنیں، بھائی مسئلہ کرے گا اس کی پرواہ نہیں۔ ہے میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، آپ بس اپنے گھر والوں کو ہمارے رشتے کے متعلق آگاہ کریں۔'' اس کے انداز میں ضد تھی اصرار نمایاں تھا اپنے حالات سے تنگ آئی یا پھر شاید اس کی بیوی کی حیثیت سے ان کی حویلی پر راج کرنے کو اتاؤلی ہوئے جا رہی تھی۔

''اچھا مجھے کچھ وقت دو، میں کچھ سوچتا ہوں۔'' محسن نے داہنے ہاتھ سے پیشانی پر آئے بال درست کرتے ہوئے جان چھڑانا چاہی مگر وہ تو جیسے ساری پلاننگ کر کے بیٹھی تھی فوراً بول اٹھی۔

''سوچیں نہیں اب بس عمل کریں، آپ کی ہاں کی دیر ہے بس پھر میں اپنے گھر سے نکل آؤں گی۔'' شاید اسے اندازہ تھا کہ محسن کے گھر والے کبھی اس رشتے کو تسلیم نہیں کریں اور نہ ہی کبھی اسے بہو مان کر اسے لینے آئیں گے، اسی لئے وہ خود اپنے گھر سے بھاگ کر محسن کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔

''پرسوں میں آپ کا اسی جگہ انتظار کروں گی۔'' شاید اسے ڈر تھا کہ محسن اپنے گھر والوں کے دباؤں میں آکر اس سے رشتہ ختم نہ کر دے جبھی وہ جلد از جلد اس کا ساتھ پانا چاہتی تھی، اسی لئے اسے اپنا فیصلہ سنا کر اسے عذاب میں چھوڑے وہ خود وہاں سے جا چکی تھی، جبکہ وہ مزید پریشانیوں میں گھر گیا۔

☆☆☆
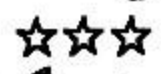
پرسوں گلزار نے اپنا گھر چھوڑ آنا تھا اس کے پاس بس ایک دن باقی تھا، حد درجہ پریشانی میں گھرے وہ ایک دن بھی گزار گیا اور اب بس فیصلے کی گھڑی تھی، اس نے وقت دیکھا چار بجنے ہی والے تھے یعنی اب سے کچھ دیر بعد گلزار اپنی بتائی جگہ پر پہنچ جائے گی، کچھ دیر وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلتا رہا، وہ اسے اس مقام تک لا کر دھوکہ دینا نہیں چاہتا تھا، نکاح کے اس بندھن کو اب اسے ہر صورت نبھانا ہی تھا، بہت سوچنے کے بعد آخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ کر گہری سانس بھرتا خود کو آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرتا گلزار کو لینے کے لئے پہنچ گیا، جہاں وہ پہلے سے ہی اس کی منتظر کھڑی تھی، اس کے پوچھے بہت سے سوالوں کا جواب دیئے بنا وہ اسے لئے حویلی پہنچ گیا، جہاں گھر کے سبھی افراد اسے اس طرح گلزار کے ساتھ دیکھ کر حیران دکھائی دے رہے تھے، سب سے پہلے امی جی نے اس سے آگے بڑھ کر سوال کیا تھا۔

''محسن کیا ہوا ہے؟ تم اس طرح گلزار کو کیوں لائے ہو، کیا اس نے کوئی غلطی کر دی ہے۔'' ماں تھی ناں اپنی اولاد کی غلطی کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ان کے سوالوں پر بھی وہ خاموش ہی رہا، گلزار اس کے برابر میں کھڑی اکساتی نظروں سے اسے بولنے کا اشارہ کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہاری ماں نے تم سے کچھ پوچھا ہے محسن؟'' کریم صاحب فوراً آگے بڑھے محسن دو قدم مزید پیچھے ہو گیا، اس کی اس طرح خاموشی انہیں طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کر رہی تھی اسے اس طرح بت بنا دیکھ کر کریم صاحب نے گلزار سے سوال کیا۔

''گلزار تم بتاؤ کیا بات ہے۔'' وہ تو ویسے بھی بولنے کو تیار کھڑی تھی، ان کے پوچھنے پر بولنے کو فوراً تیار ہوئی تھی، مگر محسن نے اسے کچھ نہ

بولنے کا اشارہ کر کے خود سر جھکا کر کہا۔

''میں نے گلزار سے نکاح کر لیا ہے ابا جی، اب یہ آپ کی بہو ہے۔'' لفظ تھے یا کوئی بم جس نے وہاں کھڑے سبھی افراد کی سوچوں تک کے پرخچے اڑا دیئے تھے، کتنے ہی پل ساکت کھڑے وہ بے یقین نگاہوں سے محسن کو دیکھتے رہ گئے، انہیں بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا محسن اس طرح کا بھی کچھ کر سکتا ہے۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو محسن، تم اور گلزار؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ان کے ہر سوال کا جواب اس کے پاس تھا مگر وہ انہیں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا سو سر جھکائے ان کی لعنت ملامت کو سنتا خاموش کھڑا تھا اس کی یوں خاموشی کریم صاحب کو مزید طیش و شدید غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔

''تم نے سوچ بھی کیسے لیا یہ لڑکی ہمارے خاندان کی بہو بنے گی۔''

''ابا جی! اب یہ میری بیوی ہے۔'' وہ مودب انداز میں دھیما سا بولا تھا مگر کریم صاحب مزید آگ بگولہ ہو گئے۔

''ہو گی تمہاری بیوی مگر ہم کبھی اسے اپنے خاندان کی بہو تسلیم نہیں کریں گے، تمہاری سوچ پر کیا پتھر پڑ گئے تھے محسن جو اس معمولی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا، اس وقت تمہیں ہمارا ذرا خیال نہیں آیا، اب میں دنیا والوں کو کیا جواب دوں گا کیا تو جیہہ پیش کروں گا اپنے بڑے بیٹے کی اس خفیہ شادی کا؟ وہ بھی اتنی معمولی لڑکی سے، کیسے سامنا کروں گا میں دنیا کا۔'' ان کے لفظوں میں ان کا غصہ ان کا دکھ بہت نمایاں تھا۔

''چپ کیوں ہو کچھ تو کہو آخر ایسا کیا نظر آیا تمہیں اس لڑکی میں جو اس طرح چھپ چھپاتے تم نے اس سے نکاح کر لیا۔'' ان کے سوال تھے جو بڑھتے ہی جا رہے تھے مگر اس نے تو جیسے اپنے لب ہی سی لئے تھے ان کے سوالوں کے جواب نہ دینے کی جیسے اس نے قسم کھائی تھی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں محسن۔'' غیض و غضب کی حالت میں وہ اس کی طرف بڑھے مگر ان کے قدم وہیں درمیان میں ہی رک گئے، لب بھینچے انہوں نے غصے سے محسن کو دیکھا، درد کی ایک تیز لہر نے ان کو حال سے بےحال کیا اور سینے پر ہاتھ رکھے وہ وہیں لڑھک گئے۔

''ابا جی!'' زرینہ بیگم کے ساتھ ساتھ وہ سبھی ان کی طرف بڑھے تھے۔

''کریم صاحب......؟'' احسن اور حسن نے گرتے ہوئے باپ کو سنبھالا تھا، محسن ان کی طرف بڑھنا چاہتا تھا اپنے گرتے باپ کو سہارا دینا چاہتا تھا مگر احساس ندامت نے اس کے قدم اپنی جگہ گاڑ سے دیئے تھے۔

''ابا جی، پلیز آنکھیں کھولیئے۔'' احسن پریشانی سے انہیں پکار رہا تھا، ابا جی کو اس طرح بے سدھ دیکھ کر محسن بھی آگے بڑھا تھا، بھائیوں کے ساتھ مل کر اس نے کریم صاحب کو اٹھایا اور ہسپتال جا پہنچے، جہاں ڈاکٹر نے حد سے زیادہ دباؤ کی باعث ہونے والے اٹیک کی بدولت ان کی موت واقع ہونے کی جان لیوا خبر سنائی۔

گلزار ان سب کے لئے ایک ایسا سبز قدم ثابت ہوئی تھی جس کے پہلے ہی قدم نے ان سے ان کی عزیز ترین ہستی کو چھین لیا تھا، وہ اس سے جتنی بھی نفرت کرتے کم تھی مگر گلزار کو تو جیسے پرواہ ہی نہیں تھی کریم صاحب نے اس کی شان میں جو کچھ بھی کہا تھا، وہ اسے بڑی اچھی طرح یاد تھا۔

یہی وجہ تھی ان کی موت کا اسے کچھ خاص افسوس نہیں ہوا تھا، محسن شدید غم زدہ اور شرمندہ تھا اس کا غم اس کی شرمندگی اس درجہ تھی کہ وہ ان

میں توازن نہیں رکھ پا رہا تھا کہ اس کا غم زیادہ ہے یا شرمندگی، اس کی وجہ سے اس پر جان نثار کرنے والے ابا کی زندگی کی بازی ہار گئے تھے اس کا شدید ترین نقصان ہوا تھا، اس سے اس کے دل نے آبگینے رحیم کے لئے حد درجہ نفرت محسوس کی تھی گلزار کو ان میں سے کسی نے بھی قبول نہیں کیا تھا، مگر محسن کی ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے حویلی کا ایک حصہ اسے دے کر ان سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔

امی جی اسے معاف کر دینا چاہتی تھیں، مگر وہ اپنے باقی کے بیٹوں کی وجہ سے مجبور تھیں گلزار کے لئے محسن کی ضد دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ شاید وہ گلزار سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے، جبھی اس کی خاطر اتنا کچھ برداشت کر رہا ہے یہ سوچ کر وہ اس پر صبر کر لیتے مگر آبگینے کے انکشاف نے انہیں بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا ایک آبگینے کی ضد میں وہ اس حد تک گیا اور اب سب خاموشی سے سہہ رہا تھا۔

''آبگینے رحیم تم نے میرے بیٹے پر بہت ظلم کیا، صرف اور صرف تمہاری وجہ سے آج وہ اس حالات کا شکار ہے اس نے اپنے باپ کو اپنے سامنے موت کی نیند سوتے دیکھ لیا مگر تمہارا نام زبان پر نہیں لایا، کیا سمجھتی ہو تم اس عشق و محبت کو، ایک بار تم نے مجھ سے کہا تو ہوتا۔'' زرینہ بیگم سسک اٹھی تھی، سب سے زیادہ نقصان تو ان کا ہوا تھا، ایک طرف شوہر کو کھویا تو دوسری طرف بیٹے کو کھو رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دیں چچی۔'' وہ خود بھی شرمندہ سی رو دی۔

''محبت کر کے اسے پانے کی شدید آرزو نے اسے بھی تو کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔''

''میں نہیں جانتی، میں تمہیں معاف کر بھی پاؤں گی یا نہیں۔'' وہ اس کی طرف سے رخ پھیر گئی، یہ اس کی سزا تھی جو شاید اسے تاعمر بھگتنا تھی، وقت جتنا بھی کڑا ہو ٹھہرتا کبھی نہیں ہے، ان پر آیا یہ وقت گزر تو گیا مگر اپنے ساتھ اچھی کم اور بری یادیں چھوڑ گیا، آبگینے رحیم شادی کے بعد کینیڈا جانے سے پہلے ایک بار پھر محسن کے پاس معافی طلب کرنے آئی تھی، معاف کرنے کے لئے دل میں وسعت کا ہونا لازمی ہوتا ہے مگر شاید محسن کریم بڑے ہی چھوٹے دل کا مالک تھا، اس کے شرمندہ ہونے کے باوجود اس کے معافی طلب کرنے پر بھی اس نے بڑی نفرت و حقارت سے اسے جھڑک دیا تھا۔

''آبگینے رحیم! میرے شدید ترین نقصان کی ذمہ دار تم ہو دنیا میں اگر میں کسی سے نفرت کرتا ہوں تو وہ صرف اور صرف تم ہو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا، میری بددعا ہے کہ تم ہمیشہ سچی خوشی اور سکون کو ترس جاؤ پھر اس وقت تم میری بے سکونی کا اندازہ زیادہ اچھی طرح کر سکو گی، اس وقت تم جان جاؤ گی کہ تمہاری وجہ سے کس طرح میری زندگی سے خوشیاں روٹھ گئی ہیں اور اس سب کی وجہ صرف اور صرف تم ہو۔'' اس کی خطا جتنی بھی بڑی تھی مگر اس میں قصور محسن کریم کا بھی تھا۔

مگر وہ اس سب کا ذمہ دار صرف اور صرف آبگینے کو سمجھتا تھا، جب کوئی اپنے کیے پر دل سے شرمندہ ہو کر معافی طلب کرے تو انسان پر فرض ہے کہ وہ بھی دل سے اسے معاف کر دے آبگینے نے بھی ان سبھی سے رو کر معافی طلب کرنا چاہی تھی مگر ہر فرد نے اسے جھڑک دیا تھا اسے کسی بھی طرح معافی نہ ملی تو وہ نامراد ہی کینیڈا رخصت ہو گئی۔

اس بار بس یہ ہوا کہ آبگینے کی محسن کے پاس

آمد نے یہ راز گلزار پر بھی آشکار کر دیا، یعنی کہ اب آبگینے رحیم کی بدولت محسن کریم کی زندگی میں ایک اور عذاب لکھ دیا گیا تھا، گلزار یہ سب حقیقت جان کر غصہ و نفرت کی آگ میں بری طرح جلنے لگی، وہ جو آج تک آسمانوں میں اڑتی رہی تھی، اب جب حقیقت کو جانا تو ششدر رہ گئی اور برداشت کرنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا یا شاید ان تین سالوں میں اسے حکمرانی کرنے کی اس قدر عادت ہو چکی تھی اور محسن کریم کی کم گوئی کی بدولت وہ اکثر اس پر بھی بھاری پڑ جایا کرتی تھی، آج بھی جب اس نے چھپے راز کو جانا تو خوب بھری ہوئی جا کر محسن کریم کے سر پر پھٹ پڑی۔

"محسن صاحب! یہ تو حقیقت تھی جس کی وجہ سے آپ نے مجھ جیسی کم حیثیت اور معمولی عورت کی طرف جھوٹی نگاہ الفت کی تھی، اپنی ضد انا اور مردانگی کو ثابت کرنے کے چکر میں آپ نے میری زندگی سے کھیل کھیلا، کیوں میری زندگی برباد کی۔" ہاتھ نچا کر تیزی سے چلاتی وہ جاہل ہی لگ رہی تھی، مگر اس کے الفاظ سن کر محسن کو حد درجہ حیرت ہوئی۔

"گلزار اب آپ مبالغہ آرائی کی حد کر رہی ہیں، آپ کی زندگی کب اور کس طرح خراب ہوئی، سچ پوچھیں تو زندگی تو میری خراب ہوئی ہے، ایک وہ آبگینے رحیم تھی، جس نے شادی سے پہلے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی، ایک آپ ہیں جن کے نکاح میں آنے کے بعد سے آج تک میں نے سوائے اپنے بچوں کے ہمیشہ صرف کھویا ہے پایا بھی کچھ بھی نہیں۔"

"بتائیں آپ نے کیا کھویا۔"

"آپ نے کبھی کچھ نہیں کھویا، آپ نے ہمیشہ صرف پایا، شادی کے بعد سے اب تک آپ ہم پر اس حویلی پر مہارانیوں کی طرح راج کر رہی ہیں، آپ ہر وقت نوکر چاکر آپ کے گرد گھومتے ہیں، اپنا پرانا وقت شاید آپ بھول گئی ہیں جس میں آپ ہمیشہ دوسروں کی محتاج رہا کرتی تھیں آج دنیا آپ کی عزت کرتی ہے، جانتی ہیں کیوں، کیونکہ آپ محسن کریم کی زوجہ ہیں۔"

عرصہ ہوا محسن نے بولنا چھوڑ دیا تھا مگر شاید آج گلزار کے لفظوں نے اسے ٹھیس پہنچائی تھی، جبھی اپنے نقصان کا احساس مندی سے ہوا تو نا گواری سے بولتا اسے اس کی گزری زندگی یاد دلا گیا تھا، مگر گلزار کو تو جیسے اس کی بات سن کر آگ لگ گئی۔

"آپ مجھے میری گزشتہ زندگی کا طعنہ دے رہے ہیں، آپ نے مجھے دھوکہ دیا ہے بلکہ میں نے آپ کی خاطر اپنے بہن بھائی اپنا گھر چھوڑا سب کچھ چھوڑا۔"

"میری خاطر؟ کیوں غلط بیانی کر رہی ہیں گلزار، آپ نے اپنا گھر اپنے بہن بھائی میری وجہ سے نہیں بلکہ اپنی گزشتہ زندگی سے چھٹکارا پانے کے لئے چھوڑے، آپ شاید بھول رہی ہیں، گھر چھوڑتے وقت آپ کا کہنا تھا کہ اس گھر میں کسی کو آپ کی کوئی پرواہ نہیں ہے اور شاید یہ سچ بھی ہے، اس گھر کو چھوڑنے کے بعد اسے آج تک وہاں کے کسی فرد نے بھی آپ کی کوئی خبر نہیں لی پھر اب ایسے یہ سب کہنے کا آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"نقصان آپ کا نہیں میرا ہوا ہے، میں نے اپنے ابا جی کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا، اپنے بہن بھائی اور اپنی ماں کی بے رخی میں آج تک سہہ رہا ہوں۔" اس کے جیسے اسے لاجواب کرنا چاہا تھا مگر وہ پھر بول پڑی۔

"ہاں آپ کے پاس تو اب سوائے پچھتاوے کے اور کچھ بھی نہیں ہوگا ناں۔" وہ ذرا

در کو چپ ہو کر اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی مگر ناکام ہو کر پھر سے بول پڑی۔

''اور یہ کس عزت کی بات کر رہے ہیں آپ، آج تک آپ کے گھر والوں نے مجھے قبول نہیں کیا تو دنیا والوں کی عزت کرنے کا میں کیا کروں، آج تک میں صرف آپ کی خاطر آپ کے گھر والوں کی نفرت اور ناپسندیدگی برداشت کرتی رہی، مگر اب جب میں جان چکی ہوں جو شرط میں آپ کی زندگی میں زبردستی شامل ہو گئی آپ نے صرف مجھے اس مقام پر آ کر یہ سب جان کر مجھ پر کیا گزار رہی ہے شاید آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے۔'' وہ جیسی بھی تھی مگر ایک عورت تھی جس کے جذبات کو آج بری طرح ٹھیس پہنچی تھی، سب کے لئے ناپسندیدہ ہونے کا احساس پا کر اس کا دل بری طرح دوہائی دے رہا تھا۔

''مجھے بتائیں میں کیا کروں، اب سب جان کر میں کس طرح سب کچھ بھول اب تو آپ کی وہ چند دنوں کی محبت کا سہارا بھی میرے پاس نہیں رہا۔'' وہ تھک کر وہیں اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''مجھ سے شادی کے بعد سے آپ حد درجہ کم گو ہو کر رہ گئے ضرورت سے ہٹ کر آپ نے مجھ سے بات تک کرنے چھوڑ دی ہیں یہی سمجھتی رہی کہ آپ کی شادی کی وجہ سے آپ کے ابا جی اس دنیا سے چلے گئے شاید اسی دکھ نے آپ کو کم گو کر دیا، آپ ہمیشہ مجھ سے لاپرواہ رہے میں نے سب کچھ برداشت کیا مگر اب، اب کیسے برداشت کروں۔''

وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی اس کے سوال بڑھتے ہی جا رہے تھے مگر محسن کے پاس اس کے سوالوں کے جواب میں صرف خاموشی تھی سو وہ ہمیشہ کی طرح اسے اپنی خاموشی سے نواز کر مزید اس سے لاپرواہ ہو گئے۔

☆☆☆

زندگی عجیب ڈگر پر چل پڑی تھی، محسن کی لاتعلقی اس سے مزید بڑھی تو اس کے دل میں ان سب کے لئے غصہ و نفرت کا ایک لاوا ابل پڑا، جس کے تلے دب کر وہ خود بھی محسن کی طرف سے لاپراہ ہو گئی، ماں باپ کے درمیان چھڑی اس سرد جنگ سے بالکل بے خبر بچے اپنی زندگی میں مگن اور خوش باش تھے، کام کے بعد محسن کے پاس جتنا بھی وقت بچتا وہ سارا وقت وہ اپنے بچوں کے درمیان گزارتا، کسی قسم کے بھی حالات کی اس نے بچوں کو ہوا تک لگنے نہیں دی تھی۔

امی جی اپنے باقی سب بچوں کی شادی کرنے کے بعد مزید تین سال زندہ رہی پھر وہ بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئی، ماں کی وفات پر بھی ان کے دل نرم نہیں پڑے تھے، اپنے خاندان کی بربادی کی ذمہ دار وہ گلزار اور آگینے کو سمجھتے تھے اور آج بھی ان کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار وہ اسی طرح کرتے تھے، اب فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ اب وہ محسن کریم سے ملنے لگے تھے۔

گلزار کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی، مگر وہ محسن کو ان سب سے ملنے سے باز بھی نہیں رکھ سکتی تھی، تب بہت سوچ سمجھ کر اس نے بھی اپنے عرصے پہلے کے چھوڑے ہوئے بہن بھائیوں کی طرف رخ کیا تھا، اس کے اب پلٹنے پر اس کی بہنوں نے کھلے دل سے اسے معاف کر کے اسے گلے لگا لیا، مگر اس کا بھائی ہنوز اس سے پہلے ہی کی طرح ناراض تھا، اس کا کہنا تھا۔

''وہ ان کے خاندان کا نام ڈبو کر ان کی عزت کو تار تار کر کے گھر سے بھاگی تھی، اس کی اس حرکت کی بدولت وہ آج تک بھی کسی کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے یہی وجہ تھی

وہ اسے معاف کرنے کو بالکل تیار نہ تھا، بھائی کی اس درجہ ناراضگی کے باوجود اس کی بیوی اور بچوں نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا جس کی وجہ سے اس کو خوش امیدی ہوئی کہ اس کا بھائی بھی کبھی نہ کبھی اسے معاف کر ہی دے گا اور شاید اسے معاف کر ہی دینا چاہیے تھا کیونکہ وہ محسن کریم جیسے شخص کی زوجہ تھی۔" اپنے خاندان میں اس نے اپنی حیثیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا جس کی بدولت وہ لوگ اس سے کافی مرعوب دیکھائی دینے لگے تھے، یہ خاندانی ملاپ ان دونوں کے لئے خوش آئندہ ثابت ہوا تھا وہ دونوں اپنوں سے مل کر ایک بار پھر اپنے اپنے خاندان سے جڑ کر پہلے کی نسبت خوش اور مطمئن دیکھائی دینے لگے تھے اور اب شاید انہوں نے اپنی اپنی زندگی سے سمجھوتا کرلیا تھا، وقت تیزی سے گزر رہا تھا بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، یہ بھی انہی دنوں کی بات تھی جب ابا جی کی برسی کے موقع پر شائستہ اور ریحانہ کے ساتھ شمیم بھی وزیر آباد سے ملتان ابا جی کی برسی میں شرکت کرنے کی غرض سے اپنی فیملی کے ساتھ حویلی آئی تھی، ایک لمبے عرصے بعد وہ سب بہن بھائی پرانی کدورتیں، سبھی ناراضگیاں بھلائے ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔

حالات اور بچوں کا لحاظ کرکے اب وہ اپنی محفلوں میں گلزار کی موجودگی کو بھی برداشت کرلیا کرتے تھے، برسی کے اس موقع پر محسن کریم کی بڑی بیٹی ارما، شمیم کے بڑے بیٹے وسیم کو اس بری طرح بھائی کہ وہ اس کے عشق میں بری طرح گرفتار ہوگیا۔

شمیم نے بیٹے کی پسندیدگی محسوس کرکے بھائی سے ارما کے رشتے کی بات کی تو محسن نے فوراً اس رشتے کو قبول کرلیا، وہ خوش تھا کہ اس کی بیٹی اس کی خاندان کی بہو بنے گی آئندہ حالات کے لئے یہ خوش آئندہ بات تھی، اس رشتے سے شمیم اور محسن کے ساتھ خاندان کے باقی سب افراد بھی خوش تھے ان میں سے کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا، مگر ان سب میں اگر کوئی سب سن اور دیکھ کر بھی چپ تھا تو وہ تھی گلزار۔

وہ اب تک جتنی بھی منہ زور ثابت ہوئی تھی مگر محسن کریم کی کسی بات سے بھی اختلاف نہیں کرسکتی تھی، آج بھی محسن ہی کا فیصلہ حتمی فیصلہ ہوا کرتا تھا، سو اب اگر وہ اس رشتے سے خوش نہیں بھی تھی تو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا، ارما کا رشتہ وسیم کے ساتھ طے پاچکا تھا، برسی میں شرکت کے بعد وہ سب اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے، ارما اور وسیم دور رہ کر بھی ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے، ظالم سماج نامی کسی روکاٹ کا انہیں کوئی ڈر نہیں تھا، یہی وجہ تھی وہ ہر فکر سے آزاد ایک دوسرے کی محبت میں مزید ڈوبتے جارہے تھے، لیکن شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا، ان کی بے فکری کو جیسے فکر کی نظر لگ گئی تھی، اس بار قسمت کا وار اس قدر بھاری پڑا کہ اپنے ساتھ محسن کریم کو بھی بہا کر لے گیا، وہ جو کاروبار کے سلسلے میں دوسرے شہر جارہا تھا راستے میں اچانک پیش آنے والے روڈ ایکسیڈنٹ کی بدولت موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

ایک کہرام تھا جو اس خاندان پر تیسری بار ٹوٹا تھا پہلے کریم صاحب پھر زرینہ بیگم اور اب محسن کریم، مگر شاید سب سے تیز وار انہیں اب لگا تھا۔

اب جب انہوں نے محسن کو معاف کردیا تھا سب کچھ ٹھیک ہونے جارہا تھا وہ سب دوبارہ سے زندگی کی طرف لوٹنے لگے تھے ایسے میں محسن کا اسی طرح چلے جانا ان کے لئے بڑا دھچکا ثابت

ہوا تھا۔

تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہا تھا، محسن کے بچے حد درجہ دکھی تھے ان کو صبر آ کے ہی نہ دے رہا تھا اور پھر ان کو صبر آتا بھی تو کیسے؟ ان کا جان سے عزیز بابا جان انہیں تنہا چھوڑ کر دنیا سے جا چکا تھا وہ بھی کبھی نہ واپس آنے کے لئے اس موقع پر وسیم نے آگے بڑھ کر ٹوٹی بکھری ارما کو محبت سے سنبھالا تھا اور اسی موقع پر گلزار کا بھائی رفیق بھی تمام ناراضگی بھلائے محسن کی وفات پر تعزیت کرنے آیا تھا، محسن کریم کی وفات کا اسے حقیقتاً دکھ تھا یا نہیں، مگر دنیا دیکھاوے ہی کو صحیح اس نے بہن کے سر پرسی کا ہاتھ رکھا تھا۔

وسیم واپس جا چکا تھا۔ انہیں بھی اب صبر آنے لگا تھا، ان کا زندگی کی طرف پلٹنا مشکل صحیح مگر ناممکن نہیں تھا، کوشش کر کے انہوں نے زندگی کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیئے تھے، احسن اور حسن صحیح معنوں میں محسن کے بچوں کی سرپرستی کر رہے تھے مگر گلزار کو یہ بات شدید ناگوار گزری تھی۔

''کسی کو ہمارے لئے فکرمند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے، میرے بچے صرف میرے ہیں اور اپنے بچوں کے لئے میں خود کافی ہوں۔'' اسے شاید ڈر تھا کہ کہیں ان لوگوں کے ساتھ رہنے سے اس کے بچے اس سے دور نہ ہو جائیں۔

''اگر ہم سے ہمدردی ہے تو کریم صاحب کی جائیداد میں سے محسن کریم کا جو بھی حصہ بنتا ہے وہ مجھے دے دیں۔'' اس کے اس مطالبے پر وہ سب ششدر رہ گئے۔

محسن کو گئے ابھی بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا ایسے میں گلزار کا یہ مطالبہ کرنا، کیا وہ محسن کے مرجانے کے انتظار میں تھی؟

اس کے اس مطالبے کا جو بھی مطلب تھا مگر وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے، ابا جان کی جائیداد میں محسن بھی برابر کا حصہ دار تھا اب اگر وہ نہیں تھا تو اس کی اولاد اس کی بیوی اس حصے کی وارث تھی مگر وہ سب ابھی جائیداد میں بٹوارا نہیں چاہتے تھے سو باہمی صلح مشورے کے بعد احسن نے گلزار سے کہا۔

''دیکھو گلزار، ہم میں سے کوئی بھی ابھی جائیداد میں بٹوارے کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے تم بھی ابھی اس طرح کا کوئی مطالبہ مت کرو، ہاں تمہارا جتنا بھی حصہ بنتا ہے وہ سب ہمارے پاس امانت ہے جب تم بچوں کی شادیاں کرو گی تو تمہاری امانت لوٹا دیں گے اور ویسے بھی ابھی تمہیں جائیداد کی ضرورت ہی کیا ہے، تم کیا کرو گی حصے کا؟ بچوں کے گھر کے بھی خرچے تو ہم کر رہے ہیں۔'' اس نے استفہامیہ اس کی طرف دیکھا تھا، گلزار بات کو سمجھنے کے بجائے بدتمیزی سے بولی تھی۔

''تو تم کیا چاہتے ہو میں تمہاری محتاج بن کر زندگی گزاروں، ذرا ذرا سی ضرورت کے لئے تم لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، مجھے ہرگز بھی یہ گوارا نہیں ہوگا اس لئے ہمارا جو حصہ بنتا ہے جو ہمیں ابھی دے دو۔'' اس کا انداز قطعی تھا ذرا دیر جانچتی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''یا پھر تم لوگ وقت کے گزر جانے کے انتظار میں ہو تاکہ بات پرانی ہو جائے اور تم لوگ محسن کا حصہ بھی ضبط کر لو۔''

وہ چھوٹے گھر سے تھی دنیا کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس بات سے واقف تھے مگر وہ اس قدر چھوٹی سوچ کی مالک ہے اس کا اندازہ انہیں آج ہوا تھا۔

اس کی اس درجہ ہٹ دھرمی اور بدتمیزی سے تنگ آ کر انہوں نے جائیداد میں سے محسن کا حصہ اس کے حوالے کر دیا۔

اب وہ مکمل خود مختار تھی اور آگے کیا کرنے والی تھی اس سے وہ بھی بے خبر تھے۔

☆☆☆

اس وقت وہ ڈنر کرنے کے بعد گول کمرے میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر چلتے ٹاک شو کو دیکھ کر ساتھ ساتھ تبصرے بھی کر رہے تھے، جب سحرش اندر داخل ہوئی، احسن نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر دوبارہ اپنی توجہ ٹاک شو کی طرف مبذول کرنا چاہی، مگر چونک کر اس نے دوبارہ سحرش کی سمت دیکھا تھا جو خاصے الجھے موڈ میں کسی گہری سوچ میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' اس نے اپنی مکمل توجہ کا رخ اس کی طرف موڑا۔

''جی ابو؟'' اس نے چونک کر اس کی طرف استفہامیہ دیکھا تھا، یعنی کہ اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

''میں پوچھ رہا ہوں کیا بات ہے جو اس قدر الجھی دکھائی دے رہی ہو۔'' اس کے سوال پر اس بار سب نے اپنی توجہ ٹی وی پر سے ہٹا کر ان دونوں کی طرف مبذول کی تھی۔

''جی ابو میں بہت زیادہ الجھن کا شکار ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا اور زمین پر بچھے قالین پر ان کے پیروں کے قریب بیٹھ گئی۔

''کس بات نے میری بیٹی کو اس درجہ الجھا کر رکھ دیا ہے؟'' اس نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اپنا سوال دہرایا۔

''ابو جی میں ارما کی وجہ سے پریشان ہوں، میرا مطلب ہے کہ اس کا انداز اس کا رویہ دونوں ہی خاصے حیران کن ہے، دو دن سے میں نوٹ کر رہی ہوں وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی اگر میں بات کروں بھی تو جواب نہیں دیتی، ایسا لگتا ہے وہ مجھ سے شدید ناراض ہے، میں نے بہت سوچا مگر مجھے کوئی بھی ایسی بات یاد نہیں آئی جو اسے ناگوار گزری ہو جب مجھے کچھ سمجھ نہ آیا تو آج میں نے اس سے بات کرنے کے لئے اس کے گھر جانے کا سوچا۔''

''مگر وہاں جا کر میں مزید الجھ کر رہ گئی ہوں کیونکہ جب میں نے گلزار چچی سے ارما کے متعلق دریافت کیا تو ان کا رویہ بھی خاصا حیران کن تھا، نہ تو انہوں نے میرے آنے کی وجہ پوچھی نہ ہی مجھے بیٹھنے کا کہا، میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا ''ارما سو رہی ہے'' جبکہ مجھے معلوم ہے ارما کبھی بھی اس وقت نہیں سوتی۔'' اس نے بڑی تفصیل سے اپنی الجھن سے انہیں مطلع کیا تھا، جسے سن کر وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

''بات تو واقعی الجھا دینے والی ہے ارما تو بہت اچھی بچی ہے وہ پھر اس طرح کیوں کر رہی ہے اور گلزار؟'' ان کا انداز پرسوچ تھا۔

''سحرش ٹھیک کہہ رہی ہے بھائی، یہ بات میں نے بھی نوٹ کی ہے، مگر میں اپنا وہم سمجھ کر اگنور کر دیا تھا مگر اب۔'' خاموش بیٹھے حسن نے باتوں میں حصہ لیا۔

''مگر کیا؟'' احسن نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ارما، شہزادا اور سوہا تقریباً روز ہی ہم سے ملنے آئے تھے بلکہ دن کا زیادہ حصہ تو وہ ہماری طرف گزارتے تھے مگر دو دن سے ان میں سے کوئی بھی یہاں نہیں آیا، ان کی غیر موجودگی محسوس کر کے کل میں نے سوہا کو بلا بھیجا تا کہ ان کی خبر لے سکوں، مگر سوہا نے کہلا بھیجا وہ اپنے پیپرز کی تیاری میں مصروف ہے ان سے

ملنے نہیں آسکتی، اس کا اس طرح کہلوا بھیجنا مجھے بڑا عجیب لگا۔"

احسن کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی جبکہ حسن کے دو بیٹے تھے، سبھی بچوں کی آپس میں کافی دوستی تھی، مگر ارما لوگوں کے اس رویے کی وجہ سے وہ سب ہی بے خبر تھے۔

"آپ شہزاد سے معلوم کریں، وہ آپ سے کافی قریب ہے اصل وجہ بتا دے گا۔" مسز احسن نے مشورہ دیا۔

"قریب تو ارما اور سوہا بھی ہیں بیگم، مگر جب وہ دونوں اکھڑی اکھڑی ہیں تو پھر شہزاد تو لڑکا ہے نجانے وہ کیا ری ایکٹ کرے، پتا نہیں وہ کیوں اس طرح بی ہیو کر رہے ہیں؟" ان کے رویوں کو سوچتا احسن کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا، جب فون کی بجتی بیل نے اس کی سوچ میں خلل ڈالا۔

فون یونس نے اٹھایا تھا، دوسری طرف سے نجانے کیا کہا گیا تھا کہ اس نے ہولڈ کرنے کا کہہ کر اپنے باپ کی طرف دیکھ کر ان سے دیکھا۔

"ابو جی کینیڈا سے فون ہے۔"

"کینیڈا سے فون؟" بچہ پارٹی کافی حیران ہوئی تھی، اتنی دور سے کال۔

"وہاں ہمارا کون رہتا ہے؟" ان کے ذہنوں میں مختلف سوال ابھرے تھے مگر ان کی نظریں فون سنتے احسن پر جمی تھی۔

اس کال کی وجہ کیا تھی؟ کیا عرصہ پہلے بند کر دیا جانے والا باب ایک بار پھر کھلنے کے لئے دستک دے رہا تھا؟

"کہو آبگینے کیوں فون کیا؟" احسن نے سلام دعا کے بعد ڈائریکٹ فون کرنے کی وجہ دریافت کی تھی۔

"احسن پلیز میری بات محسن سے کروا دو میں کئی مہینوں سے اسے فون کرنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر اس کا نمبر مسلسل بند مل رہا ہے، پلیز اسے کہو ایک بار مجھ سے بات کر لے، اسے کہو وہ مجھے معاف کر دے اپنی بد دعا واپس لے لے، میں بہت بے سکونیوں میں گھری ہوں۔" وہ ملتجی ہوئی۔

احسن کے چہرے کے تاثرات ایکدم ہی حد درجہ غمگین ہو گئے، ان پر توجہ جمائے بیٹھے افراد اس کے چہرے کے اس اتار چڑھاؤ کو بڑے غور سے ملاحظہ کر رہے تھے۔

"آبگینے رحیم، محسن مر گیا ہے۔" اس کی آنکھ سے دو آنسو ٹپکے جنہیں اس نے پونچھنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی تھی دوسری طرف اس کے الفاظ آبگینے رحیم پر بجلی بن کر گرے تھے وہ تھرا کر رہ گئی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو احسن؟" اس سے اس کے انداز میں زمانے بھر کے بے یقینی سمٹ آئی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں، جو بے سکونی تمہاری بدولت اس کی زندگی میں در آئی تھی وہی بے سکونی اسے لے ڈوبی، وہ مر گیا آبگینے، وہ مر گیا۔" اس کا لفظ لفظ سسک رہا تھا، مگر آبگینے کو یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو احسن، محسن ایسے کیسے مر سکتا ہے؟ وہ ایسے نہیں مر سکتا۔" وہ شدت غم سے چلائی تھی۔

"میں کب سے اس کی بد دعا کے حصار میں بری طرح جکڑی ہوئی ہوں اسے تو ابھی رکنا تھا مجھ سے میری شکست کا اعتراف سننا تھا، میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ میری وجہ سے جو بے سکونی اس کی زندگی میں آئی میں اسے سمجھ چکی ہوں، آج میں خود بے سکون ہوں لمحہ بھر کے سکون کو ترستی

ہوں میں اس کی نفرت کی آگ میں بری طرح جھلس رہی ہوں احسن، میری محبت بری طرح ہار گئی، وہ مجھے کیوں ساری عمر کے لئے اس آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ گیا؟" فون رکھ کر وہ وہیں ٹیبل پر سر رکھے بری طرح رو دی، ایک بار پھر ساری عمر کی نارسائی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

جب کہ احسن فون ہاتھ میں لئے سر جھکائے بیٹھا تھا، محسن کے چلے جانے کا دکھ پھر سے تازہ ہوا تھا حسن اٹھ کے اس کے برابر میں آن بیٹھا۔

"کیا کہہ رہی تھی آبگینے؟" احسن نے گہری سانس بھر کے کریڈل پر فون رکھا اور سر اٹھا کر کہنے لگا۔

"محسن سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔"

"اوہ۔" اس کے جواب نے حسن کو بھی دکھی کر دیا، جب نومی نے سوال کیا۔

"آبگینے کون ہے بابا؟"

"ہمارے چچا کی بیٹی جو شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی تھی۔" حسن نے جواب دیا۔

"تو پھر وہ محسن چچا سے معافی کیوں مانگنا چاہ رہی تھی، انہوں نے ایسا کیا کیا ہے؟ کیا انہیں کسی نے نہیں بتایا کہ محسن چچا انتقال کر گئے ہیں۔" اس کے سوال بڑھتے جا رہے تھے، جن کے جواب انتہائی تکلیف دہ تھے، احسن نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر انہوں نے اسے ٹوک دیا۔

"چلو بچوں وقت بہت ہو گیا ہے، تم لوگ اب جاؤ سونے پھر صبح کالج بھی جانا ہے۔" اس کے حکم پر نا چاہتے ہوئے بھی وہ لوگ اپنے ذہنوں میں بہت سے سوال لئے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

شمیم ارما اور وسیم کی شادی کی بات طے کرنے کی نیت سے ملتان آنا چاہ رہی تھی، مگر آنے سے پہلے اس نے اپنے بہن بھائیوں سے صلاح و مشورہ کیا اور سب کی رضامندی کے بعد اس نے گلزار سے بات کرنے کی ذمہ داری احسن کو سونپی، اس سے بات کرنے کی خاطر وہ حسن کے ہمراہ حویلی کے اس حصے میں آیا جہاں گلزار کی رہائش تھی۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے جہاں گلزار بچوں سمیت بیٹھی ہوئی مل گئی، گلزار انہیں آتے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی نہیں تھی، البتہ تینوں بچے سیدھے ہو بیٹھے تھے، وہ آگے بڑھے اور قریب پہنچ کر ہنستے ہوئے بچوں سے سوال کرنے لگے۔

"کیا بات ہے بچوں اتنا مصروف ہو گئے ہو کہ ہم لوگوں کے لئے فرصت ہی نہیں رہی آپ لوگوں کے پاس۔" ان کا شکوہ بجا تھا ارما تنک کر مسکرا کر بولی۔

"تایا جی اسٹڈی اتنی ٹف ہوتی جا رہی ہے کہ کسی بھی فالتو کام کے لئے وقت نہیں رہتا۔" اس نے جواب دینے میں ذرا بھی تکلف نہیں کیا تھا، اس طرح جواب دے کر انہیں کھسیانے پر مجبور کر دیا تھا، وہ دونوں ہی کھسیا گئے، دونوں ہی حیران سی نظروں سے بچوں کو دیکھنے پر مجبور تھے۔

"نجانے وہ اس طرح بات کیوں کر رہے ہیں۔"

"گلزار مجھے تم سے بات کرنی ہے؟" اس بار حیرانگی کو ایک طرف کیے وہ اپنے مطلب کی بات پر آیا تھا، اس کا اشارہ سمجھ کر گلزار نے بچوں کو وہاں سے جانے کا کہا اور جب وہ جا چکے تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ دوٹوک بات کے موڈ میں تھی، وہ خود بھی اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بجائے سیدھی بات کی طرف آتے ہوئے بولے۔

"شمیم باجی کا فون آیا تھا، وہ ارما اور وسیم کی شادی کی بات کرنے یہاں آنا چاہتی ہیں، آنے سے پہلے انہوں نے تم سے کنفرم کرنے کو کہا ہے، اب تم کوئی ڈیٹ بتا دو تا کہ وہ آسکیں۔"

"اب انہیں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" گلزار کا جواب بڑا اچانک سا تھا، ان کو کچھ ہی نہ آئی تھی، جب ہی دونوں نے بیک وقت سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمیں اس رشتے سے انکار ہے اور ہمارا انکار شمیم تک پہنچا دینا۔" اس کا انداز حتمی تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو گلزار؟ تم شاید بھول رہی ہو یہ رشتہ طے کرنے والا خود محسن تھا اور تم شاید یہ بھی بھول رہی ہو اسے رشتے کے حامی خود ارما اور وسیم بھی ہیں دونوں آپس میں محبت کرتے ہیں۔" حسن کا انداز حیرت سے لبریز تھا۔

"بے شک یہ رشتہ محسن نے طے کیا تھا، مگر حقیقت یہی ہے مجھے اس وقت بھی اس رشتے سے انکار تھا اور آج بھی انکار ہے، میں ہرگز بھی ارما کو اتنی دور رخصت کرنا نہیں چاہوں گی۔"

"اور رہی ارما کی محبت، تو حسن ارما ابھی بچی ہے وہ کیا جانے محبت کیا ہوتی ہے، وہ جو کچھ بھی تھا اس کی نادانی تھی جس کا اعتراف اس نے خود بھی کیا ہے اب وہ خود بھی اس رشتے سے انکاری ہے۔" اس کے لفظ انہیں مسلسل حیرت کے دھچکے لگا رہے تھے۔

"تم محبت کو نادانی کیسے کہہ سکتی ہو؟ محبت تو وقت کے ساتھ مزید گہری ہوتی جاتی ہے پھر تم ارما کی وسیم سے محبت کے خاتمے کی بات کیسے کر سکتی ہو۔" انہیں اس کے انداز اس کے لفظوں سے بغاوت کی بہت تیز بو آتی محسوس ہو رہی تھی، جسے محسوس کر کے انہیں ایک دم ہی ڈھیروں غصے نے آن گھیرا۔

"جو کچھ تم نے کہا ہے یہ سب غلط ہے، اس میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے یہ صرف اور صرف تمہارے دماغ کا خناس ہے جو زہر تمہارے اندر بھرا ہے وہی تب تم اگل کر ہمارے بچوں کو بھی ہم سے بغاوت کرنے پر اکسا رہی ہو، تم ہوتی کون ہو اس رشتے سے انکار کرنے والی، وہ ہمارے بچے ہیں ہمارے محسن کے بچے۔" وہ کسی بھی طرح اس کے اس انکار کو دبا دینا چاہتے تھے، جبھی بچوں پر اپنا حق جتانا ضروری سمجھا، وہ مزید بھی کچھ کہتا مگر اس سے پہلے ارما دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"تایا جی یہ ہماری ماں ہے، آپ ان سے کس انداز میں بات کر رہے ہیں۔" اس کا انداز بڑا اکھڑا سا تھا انہیں شدید دھچکا پہنچا، اسی شدید کیفیت میں اس نے ابرو سکیڑیں گلزار کی سمت دیکھا وہ بڑے سکون سے بیٹھی دکھائی دے رہی تھی اس کا اس درجہ سکون یہ بات ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی برین واش پہلے سے اچھی طرح کر چکی ہے۔

"اور یہ تم بھائی صاحب سے کس انداز میں بات کر رہی ہو ارما، دو دن میں سارا ادب لحاظ بھلا دیا تم نے؟" حسن نے اسے ٹوکا مگر اس کی ٹوک کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا جبھی اس انداز میں دوبارہ گویا ہوئی۔

"میں ان سے اسی انداز میں بات کر رہی ہوں چچا جی جس انداز میں یہ میری ماں سے

مخاطب ہیں، اگر یہ مجھ سے بڑے ہیں تو انہیں بھی خیال کرنا ہوگا امی عمر کے ساتھ ساتھ رتبے میں بھی ان سے بڑی ہیں۔'' ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ جس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی اسے وہ بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

''یہ الگ بحث ہے ارما جس پر ہم ابھی بات کرنا نہیں چاہتے، فی الحال ہمیں غصہ اس بات کا ہے کہ تمہاری ماں نے وسیم سے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔'' احسن نے اپنی طرف سے جیسے دھماکا کرنا چاہا تھا مگر ارما کو جواب سن کر اسے ایکدم چپ لگ گئی۔

''اس رشتے سے انکار میں نے بھی کیا ہے تایا جی، رشتہ بابا جانی نے طے کیا تھا مگر جس خاندان نے کبھی میری ماں کو قبول نہیں کیا، جس خاندان نے کبھی میری ماں کو عزت نہیں دی، مجھے ایسے خاندان میں شادی نہیں کرنی۔''

''تمہاری ماں کو عزت نہیں دی، اگر اسے عزت نہیں دی تو ایک دنیا اسے کریم خاندان کی بہو کی حیثیت سے جانتی ہے، اگر اسے عزت نہیں ملی تو کیسے آج تمہاری ماں ہے، ارما بیٹا اندر کے حالات صرف ہم تک محدود رہے ہمیشہ، باہر جو ہے جیسا ہے سب اچھا ہے، مگر شاید تم لوگ نہیں جانتے تمہاری ماں کون ہے اور یہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور کس طرح یہ ہمارے خاندان میں شامل ہوئی۔'' اس نے جیسے کسی راز سے پردہ اٹھانا چاہا تھا مگر ایسے موقع پر شہزاد سے بڑے سکون سے انہیں بے سکون کیا تھا۔

''ہم بڑی اچھی طرح جانتے ہیں تایا جی کہ ہماری ماں کون ہے کس خاندان سے ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں بابا جانی نے کس طرح دھوکے سے امی سے شادی کی۔'' اس کے لفظ تھے یا تیز دھار تلوار جس نے ان کے دل کاٹ کر رکھ دیئے۔

''محسن نے اسے دھوکہ دیا۔'' احسن بڑی تیزی سے بھڑکا تھا۔

''گلزار آج تم نے ثابت کر دیا تم کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو، ایک نمبر کی جھوٹی اور چال باز ہو تم، غلط بیانیاں کر کے ہمارے بچوں کے ذہنوں میں زہر بھر کے انہیں ہمارے سامنے کھڑا کر رہی ہو، تم سے اسی بات کی امید کی جا سکتی ہے۔''

''تم حد سے بڑھ رہے ہو احسن، یہ میرے بچے ہیں جواب اس قابل ہو چکے ہیں کہ صحیح اور غلط کو محسوس کر سکیں، ان کے اس رویے کی وجہ تم لوگ خود ہو اس کا دوش مجھے مت دو۔''

''جو انہوں نے محسوس کیا وہ ہمیں نظر آ رہا ہے، آج بتا چلا بچوں نے ہم سے ملنا کیوں چھوڑ دیا، تم نے نجانے کیا کچھ بتا کر انہیں ہم سے باغی کر دیا۔''

''تایا جی آپ امی کو الزام مت دیں، انہوں نے صرف ہمیں سچائی سے آگاہ کیا ہے باقی ہم خود بھی سمجھ رکھتے ہیں کون غلط اور کون صحیح ہے۔'' شہزاد آگے بڑھ کر ان کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا شہزاد کو اس طرح مقابل کھڑے دیکھ کر ان کے دماغ میں عجیب سی سوچ رینگی تھی۔

''کیا گلزار اب یہ سب کر کے ان سے گزری باتوں کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔'' انہوں نے اپنے سامنے خاموش فاتح بنی کھڑی گلزار کو دیکھا اور پھر اپنے مقابل کھڑے ارما اور شہزاد کو، جوان خون تھا جوش میں ہوش کھو سکتے تھے۔

اس وقت انہیں ہوش سے کام لینے کی ضرورت تھی، وہ لوگ صرف وہی جانتے تھے جو ان کو بتایا گیا تھا، اپنے غصے کو دبائے انہوں نے رسانت سے انہیں سمجھانا چاہا۔

"جو گزر چکا اسے پھر سے مت دہراؤ بچوں، ورنہ قصوروار خود تمہاری ماں بھی نکل آئے گی، اپنے بابا جان کے لئے تم لوگوں نے ایسا کہہ دیا کیا اتنا خیال نہیں آیا کہ خود تمہاری ماں بھی تھی جو محسن کی باتوں میں آکر گھر سے نکل آئی، یہ جس طرح گھر سے بھاگی ہم سے زیادہ یہ بات یہ خود اچھی طرح جانتی ہے۔" دبے لفظوں میں احسن نے بہت بڑی بات کہی تھی۔

"تایا جی ہماری ماں کو گھر سے بھاگی مت کہیں۔" ارما بڑی تیزی سے بولی تھی احسن ہنس دیا۔

"بچے اسی لئے کہا ہے پرانی باتوں کو مت کریدو ورنہ تمہاری ماں کا جرم جتنا ہم بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔" اس نے بڑی معنی خیزی سے گلزار کی طرف دیکھا تھا جس پر وہ یکدم سے بوکھلا کر بولی تھی۔

"بات کو دوسرا رخ مت دو احسن تم رشتے کی بات پوچھنے آئے تھے، تو تم نے جان لیا ہمیں اس رشتے سے انکار ہے، شمیم تک ہمارا انکار پہنچا دینا اور بس۔" ان کو جواب دے کر وہ اپنے بچوں کی طرف مڑی۔

"اور تم لوگ جب میں نے اندر جانے کا کہا تھا تو یہاں کیوں آئے، چلو جاؤ یہاں سے۔" اب جب خود بات اس پر آنے لگی تھی تو اس نے انہیں منظر سے غائب کرنا چاہا تھا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ تم رشتے سے انکار کر دو گی ایسا ہم تمہیں کبھی نہیں کرنے دیں گے، ارما ہمارے خاندان کی بیٹی ہے اور ہمارے خاندان ہی کی بہو بنے گی، جو تمہارے ارادے ہیں ان کی ہمیں خوب خبر ہے اور اب تم بس شادی کی تیاریاں شروع کر دو۔" احسن نے حتمی انداز میں جیسے حکم سنایا تھا اس کے اس طرح حکمیہ انداز سے گلزار کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"تم ہوتے کون ہو مجھ پر حکم چلانے والے، ارما میری بیٹی ہے اس کے لئے کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق صرف مجھے ہے تمہیں نہیں اور میرا انکار بالکل حتمی ہے۔" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا تھا۔

"جب وقت آئے گا دیکھ لیں گے تمہیں اور تمہارے انکار کو۔" اس کے انکار کو ہوا میں اڑاتے اس نے کہا اور ایک غصیلی نظر اس کے سپرد کر کے وہاں سے واپس چلا آیا۔

☆☆☆

شمیم تک جیسے ہی اس کا اور ارما کا انکار پہنچا وہ اپنے شوہر کے ساتھ دو دن بعد ہی گلزار کے پاس پہنچی تھی۔

"گلزار یہ ہم کیا سن رہے تھے؟"

"ایسا کیا سن لیا۔" انجان بنی وہ استفہامیہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم نے ارما کے رشتے سے انکار کر دیا۔"

"ہاں ٹھیک سنا آپ لوگوں نے۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"مگر کیوں؟" وہ وجہ جاننے کے خواہاں تھے۔

"کیونکہ میں نے ارما کی بات اپنے بھتیجے سے طے کر دی ہے۔" اس بار اس نے صاف بات کی تھی۔

"بھتیجے سے طے کر دی، مگر تم ایسا کیسے کر سکتی ہو جبکہ ارما کا رشتہ وسیم سے طے ہے تو، اور یہ رشتہ طے کرنے والا خود محسن تھا اور اس رشتے میں خود ارما اور وسیم کی رضامندی بھی شامل تھی۔" لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ اس نے وہی سب کہا جو احسن اس سے پہلے ہی کہہ چکا تھا۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے تمہارے اس انکار

سے خاندان بھر میں کس طرح پریشانی پھیل چکی ہے، خود میرا وسیم اتنا سخت پریشان ہے ارما اس کی کال تک پک نہیں کر رہی ہے وہ خود یہاں آنا چاہ رہا تھا ہم جانتے ہیں ہم نے کس طرح اس کو یہاں آنے سے روکا۔'' وسیم کی حالت بتاتی شمیم خود بھی کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا، اس انکار کے بعد سے آپ لوگوں نے کیوں اسی طرح سین کری ایٹ کر رکھا ہے رشتے ہوتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں، یہ نارمل سی بات ہے۔ اور میں بھی جانتی ہوں یہ رشتہ محسن نے طے کیا تھا مگر جب محسن تھے حالات اور تھے اب جب محسن نہیں ہیں تو اپنی اولاد کے لئے مجھے سوچنا ہے اور میں ارما کو رخصت کر کے اتنی دور بھیجنا نہیں چاہتی ہوں، میرے انکار کی وجہ بس یہی ہے، اس کے باوجود بھی آپ لوگوں کی خاطر اگر میں اسے رشتے کے لئے حامی بھر بھی لوں تو خود ارما بھی اس رشتے کے لئے راضی نہیں ہے اگر آپ کو یقین نہیں تو میں ارما کو بلا دیتی ہوں آپ خود اس کا انکار سن لیں۔'' ناگواری کی بہت سی سلوٹیں پیشانی پر سجائے اس نے ان کی بات کا جواب تفصیل سے دیا تھا جسے سن کر وہ پریشان ہو گئے، شمیم مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ساتھ بیٹھے انور نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کر کے خود گویا ہوئے۔

''آپ کی بات اپنی جگہ بالکل درست ہے گلزار بہن، جس کو میں بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، مگر بہن بچوں کی ہر بات تو مانی نہیں جاسکتی ناں، ارما ابھی بچی ہے وہ نادانی کر رہی ہے، تو آپ اسے سمجھائے کہ ایسے موقع پر انکار کر کے وہ خاندان بھر میں پریشانی پیدا مت کریں، آپ اس کی ماں ہیں فیصلے کا حق تو آپ کے پاس ہے وہ اگر غلطی کر رہی ہے تو آپ تو غلطی مت کریں

ناں۔'' انور صاحب جہاندیدہ شخص تھے بات کو کس طرح کرنا ہے وہ اچھی طرح واقف تھے جبھی انتہائی سلیقے سے بات کہہ کر گلزار کو لاجواب کیا، اس کی بال اس کے کورٹ میں گرنے کو تیار تھی مگر وہ اسی طرح ہٹ دھرمی پر قائم تھی۔

''بھائی صاحب میں زبردستی کی قائل نہیں ہوں اگر ارما نے انکار کر دیا ہے تو میری طرف سے بھی انکار ہے۔'' اس کا قطعی انداز دیکھ کر وہ دونوں خاصے بے بس دیکھائی دینے لگے تھے، انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح گلزار کو اس رشتے کے لئے راضی کریں، جب اور کچھ نہ سوجھا تو انور صاحب بڑی لاچاری سے اس کے سامنے ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے لجاجت سے بولے۔

''بہن اگر آپ اپنی بیٹی کی وجہ سے مجبور ہیں تو ہم بھی اپنے بیٹے کی وجہ سے حد درجہ مجبور ہیں وہ ارما سے حد درجہ محبت کرتا ہے، آتے سے ہی اس نے ہمیں وارن کیا تھا کہ آپ لوگوں کو ہر صورت اس رشتے کے لئے راضی کرنا ہے ورنہ وہ اپنی جان دے دے گا۔'' اولاد کی محبت سے مجبور ہو کر وہ اس حد تک جھک گئے تھے شمیم آنسو بھری نگاہوں سے انور کے جڑے ہاتھوں کو دیکھ کر شدید دکھی ہوئی۔

''آپ جو کہیں گے ہم وہ کرنے کو تیار ہیں، بس آپ اس رشتے سے انکار مت کریں، یہ ہمارے بیٹے کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔'' کس قدر بے چارگی کھلی تھی ان کے انداز میں، جسے محسوس کر کے گلزار کا سر تفاخر سے ایک دم بلند ہوا تھا، اس کی ایک ہاں کے لئے وہ سب اس کی منت کر رہے تھے، یہ پہلا موقع تھا جو اسے اس درجہ اہمیت حاصل تھی، اسے خوشی ہونے لگی، مگر دوسرے ہی پل اسے وہ گزرا وقت یاد آنے لگا

جس میں اس کی توہین کی گئی تھی، لب بھینچے وہ ایکدم ہی ان سے دور ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''معاف کیجئے گا بھائی صاحب، ہمارا انکار کسی بھی صورت اقرار میں نہیں بدل سکتا۔'' ان کی تمام کوششیں ناکام ہوئی تو وہ مایوسی ولگرفتہ سے واپس لوٹ گئے، ان کے پاس واپس جانے کے اگلے روز خود وسیم ارما سے بات کرنے کی خاطر ملتان پہنچا تھا اور اب اس کے سامنے کھڑا سوال کررہا تھا۔

''کیسی ہو ارما؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

''مجھ سے میرا حال دریافت نہیں کرو گی؟'' اس کے انداز میں محبت نمایاں تھی، ارما نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، ملگجے لباس میں بڑی شیو کے ساتھ وہ اسے کافی ڈسٹرب لگا تھا، اسے اس طرح دیکھ کر اس کے دل کو ایک دم سے کچھ ہوا تھا، وہ بے اختیار ہونے کو تھی مگر دوسرے ہی پل اس نے خود کو سنبھال کر نارمل سے انداز میں اس کا حال دریافت کیا۔

''کیسے ہو؟''

''تمہیں کیسا لگ رہا ہوں؟'' اسی انداز میں بولتا وہ اسے اسی طرف لانے کی کوشش کررہا تھا جس سے وہ نظر چرا رہی تھی۔

''مجھے نہیں پتہ۔'' وہ اس کی طرف سے رخ پھیرتی جھنجلا کر بولی تھی۔

یہ وہ شخص تھا جس سے اس نے پاپا جانی کے بعد سب سے زیادہ محبت کی تھی وجہ جو بھی تھی اب جب وہ اسے اور اس کی محبت سے انکار کرچکی تھی تو ایسے میں اس کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی، جبھی سنجیدہ سے انداز میں بولی جیسے اس کے جذبوں کو رکنے پر مجبور کیا تھا۔

دوسری طرف وسیم کو بھی اس کے انداز سے محسوس ہورہا تھا کہ اسے وہ بات کرلینی چاہیے جو وہ کرنا چاہتا ہے سو اپنی بے اختیاری کو اختیار میں کرنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کر دیا؟''

''میری مرضی۔'' وہ جتنا روڈ ہوسکتی تھی ہو رہی تھی، تاکہ وہ اس سے مایوس ہوکر پلٹ جائے مگر وسیم کو اس کا انداز اور لفظ دونوں ناگوار گزرے۔

''محبت کے اس مقام پر آکر تم ایسا کیسے کر سکتی ہو مس ارما، تم شاید بھول رہی ہو تم سے محبت صرف میں نے نہیں مجھ سے محبت تم نے بھی کی ہے، ایسی محبت جس میں ہماری مرضی ہوتی ہے، پھر کیا سوچ کر تم نے اپنی مرضی چلانے کا سوچا۔'' اس کو سامنے کیے وہ سراپا سوال ہوا تھا۔

''ہاں کی تھی تم سے میں نے محبت، مگر اب محبت نہیں رہی۔'' خود کو اس سے اور شاید اس کے سحر سے آزاد کرتی وہ اس سے دور ہوئی تھی مگر اس نے دوسرے ہی قدم پر جالیا۔

''محبت نہیں رہی، یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ارما محبت کیسے نہیں رہتی یہ تو ہمیشہ کی ہوتی ہے، جو یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی۔'' اس کو سامنے کیے وہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جب کہ وہ جواب دینے کے باوجود خاموش رہی، اس کی خاموشی محسوس کرکے اس سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''ارما کیوں کررہی ہو تم ایسا؟ مجھے وہ وجہ بتاؤ جس نے تمہیں محبت سے انکار کرنے پر مجبور کیا ہے۔'' وہ واحد تھا جس نے اصل بات کو محسوس کیا تھا، ارما نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس سے اس کے انداز میں اس کے لفظوں

میں توجہ کے وہ سبھی رنگ موجود تھے جس کی اسے خواہش تھی، اس کی اس درجہ توجہ محسوس کر کے ایک دم اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں، وسیم نے بہت غور سے اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی کو دیکھا تھا۔

''بتاؤ ارما۔'' کس قدر والہانہ انداز تھا اس کا، اس کا دل چاہا ایک دم اس کے سینے سے لگ کر سسک اٹھے اور وہ سب اسے کہہ دے جو اس نے دل میں دبا کر رکھا تھا، ممکن تھا کہ وہ ایسا کر بھی گزرتی مگر نجانے کس سوچ نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا، آنکھوں کو جھپک کر اس نے ابھرتی نمی کو پرے دھکیلا اور اس سے نظر چراتی بولی۔

''میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں مانگا وسیم، مگر آج مانگتی ہوں اس محبت کے صدقے جو تم نے مجھ سے کی، مجھے اپنے ساتھ سے آزاد کر دو۔'' اس کے لفظ تھے یا کوئی بم، جس نے اس کی ذات کو دھماکوں کی زد پر رکھ دیا تھا۔

''اسے محبت کا واسطہ دیئے وہ اس سے جدائی طلب کر رہی تھی۔'' اس کے کندھوں پر جے اس کے ہاتھ بے جان ہوتے اس کے پہلو میں آن گرتے تھے، وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر اس سے اسے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا تھا۔

سنو! یہ وقت رخصت ہے
سکوت سفر طاری ہے
ختم عمروں کا ذر باقی
لمحوں کی رہزگاری ہے
سنو! آنکھیں تو گم صم ہیں
دلوں میں آہ وزاری ہے
سنو! یہ ضبط کا موسم نہیں
بے اختیار ہے
سنو! یہ آس کی ڈوری
اٹھا لو ہاتھ سے میرے
میرے ہاتھوں میں کچے
دھاگوں کی بے اعتباری ہے

وہ اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ کہہ رہی تھی۔

''مجھ سے میرے اس فیصلے کی وجہ مت پوچھنا وسیم، میں وجہ نہیں بتا سکوں گی، بس اتنا جان لو تم سے علیحدگی میرے لئے بھی اتنی ہی دشوار ہے جتنی تمہارے لئے ہے، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے رخسار پر لڑھکے تھے، وسیم نے اس کے گرتے آنسوؤں کو دیکھا تو ایکدم ہوش کی دنیا میں واپس آیا، کچھ دیر اسی خاموشی کے ساتھ اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے ارما، کیونکہ مجھے میرے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے، تم وجہ مت بتاؤ، میں بھی وجہ دریافت نہیں کروں گا، یقیناً کوئی خاص ہی وجہ ہو گی جس نے تمہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے، میں تمہارے اس فیصلے کا احترام کروں گا۔''

''میں تمہیں اپنی اس محبت سے آزاد کرتا ہوں جو میں نے تم سے کی، مگر میں اور میری محبت کبھی اس محبت سے آزاد نہیں ہو سکیں گے جو تم نے مجھ سے کی زندگی میں کبھی بھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو ایک آواز دے لینا میں تمہارا منتظر رہوں گا۔'' خود کو اس کا پابند کرتا وہ بڑے حوصلے سے بولا تھا، مگر ارما نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

''خود کو میرا پابند رکھ کر اپنی زندگی خراب مت کرو، میں چاہوں گی تم بھی اپنی زندگی میں آگے بڑھ جاؤ۔''

''بس تم کوئی اعتراض مت کرو میں نے

تمہاری بات مانی اب تم میری بات مانو گی۔"
ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے مسکرا کر کہتا وہ اسے بہت بہادر لگا تھا ارما باوجود کوشش کے کچھ بھی نہ بول سکی، وسیم کچھ دیر کھڑا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر واپسی کے لئے پلٹ گیا، پیچھے وہ اس کے بڑھتے قدموں کو دیکھتی تنہا رہ گئی۔

☆☆☆

وسیم واپس جا چکا تھا، ان سب کی ہر طرح کی کوشش ناکام ہوئی تو احسن نے خاندان کے چند بڑے لوگوں کو ایک بار پھر گلزار پر دباؤ ڈالنے بھیجا، وہ کسی بھی صورت اسے راضی کر لینا چاہتا تھا حالانکہ وسیم جاتے سے اسے اس سب سے منع کر چکا تھا اس کے باوجود بھی اس نے یہ قدم اٹھا لیا تھا، جس کی وجہ سے گلزار کو بری طرح غصہ آ گیا، جس کے ردعمل کے طور پر اس نے ارما کا نکاح خفیہ طریقے سے منصور سے کر دیا، نکاح ہو جانے کے بعد اس نے یہ خبر لوگوں کے ذریعے ان تک پہنچائی تو ان کے ساتھ ساتھ سب کے اٹھتے اعتراض بھی اپنی موت آپ مر گئے، اسے لگا اس کے اسی قدم سے کریم خاندان کو اس بری طرح ہرا کر ایک ایسا طمانچہ رسید کیا ہے جو انہیں صدیوں یاد رہے گا۔

جس خاندان کی بیٹی کو انہوں نے کبھی دل سے بہو تسلیم نہ کیا اسی خاندان میں آج ان کی بیٹی بہو بن کر شامل ہو گئی تھی، ان کو نیچا دکھا کر بھائی سے رشتہ مضبوط ہو جانے پر وہ حد درجہ خوشی تھی جیت کے نشے میں ڈوبی شاید اسے ذرا برابر بھی احساس نہیں تھا کہ وقت اور حالات کبھی بھی پانسہ بدل سکتے ہیں، محسن کے خاندان والے شاید اسے قبول کر ہی لیتے اگر وہ خود واپسی کوئی کوشش کرتی۔

اگر انہوں نے فاصلہ رکھا تو اس نے بھی کبھی اس فاصلے کو مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی اب اسے ایسا کرنے کا موقع ملا بھی تھا تو وہ موقع اس نے خود گنوا دیا تھا، پہلے سے ناراض کریم خاندان اس سے مزید ناراض ہو گیا اور اس سے ہر طرح کے تعلق سے لاتعلقی کا باقاعدہ اعلان کر دیا، جس کی اسے قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

☆☆☆

ارما کے فائنل پیپرز کے فوراً بعد گلزار نے اس کو منصور کے ہمراہ رخصت کر دیا، اس رخصتی میں محسن کے خاندان میں سے کسی نے شرکت نہیں کی تھی، نہ ہی گلزار نے انہیں بلانے کی ہمت کی تھی البتہ وقت رخصت احسن نے اپنے ملازم کے ذریعے خوبصورت پیکنگ میں چھپا تحفہ ارما تک پہنچا دیا تھا جو باقی تحفوں کے ساتھ اس کے ہمراہ اس کے سسرال آیا تھا۔

سسرال میں اس کا استقبال کرنے کے لئے پہلے سے کوئی موجود نہ تھا سب اسی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے منصور کی دونوں بہنوں نے شدید تھکن کا اظہار کرتے ہوئے مزید کسی تکلف میں پڑنے سے منع کرتے ہوئے اس کو لے جا کر اس کے کمرے میں بٹھا دیا، یہاں اسے اکیلا چھوڑ کر وہ دونوں بھی باہر چلی آئیں، وہ خود بھی بری طرح تھکن محسوس کر رہی تھی اور اب ریلیکس ہونا چاہتی تھی اس لئے اس نے ان سب باتوں کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی اور اب ریلیکس ہو کر بیٹھی کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا رہی تھی، کمرہ کسی قسم کی آرائش و زیبائش سے عاری تھا، شادیوں جیسے کوئی سجاوٹ نہیں کی گئی تھی البتہ کمرے کو خوب نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا، ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ موجود تھی، وہ سراہے بنا نہ رہ سکی، کمرہ کا خوب اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو بیڈ کراؤن

سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، اب اسے منصور کا انتظار تھا جس کے متعلق وہ ذرا برابر بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ مزاج کا اور کیسی سوچ کا مالک شخص ہے؟ منصور کو سوچتے سوچتے ایک دم اچانک ہی اس کی ذہنی رو بھٹکی اور اس کے تصور میں وسیم آن کھڑا ہوا۔

"آج کے اس دن کا ذکر کرتا وہ کس قدر شوخ ہو جایا کرتا تھا۔"

اس کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ بکھرنے کو تھی کہ یکدم اس نے اپنے لبوں کو سختی سے بھینچ لیا۔

"اب اس شخص کو سوچنے کا وہ کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔" اس نے فوراً سر کو اس طرح جھٹکا جیسے وسیم کے تصور سمیت وسیم کو بھی دماغ سے جھٹک پھینکنا چاہتی ہو، منصور کے لئے اس کا انتظار بڑھتا ہی جا رہا تھا، اپنی سوچ کے طائر کو بھٹکنے سے روکنے کے لئے اس کو اور کچھ نہ سوجھا تو اپنے ساتھ لائے تحفوں کو دیکھنے کے لئے بیڈ سے اتر آئی۔

اس کے سامنے تحفوں کا ایک بڑا ڈھیر رکھا تھا، کرسی کو گھسیٹ کر بیٹھی ہوئی اس نے دو تین گفٹ پیک اپنے سامنے کیے، تب اسے ایکدم احسن کے بھیجے گفٹ کا خیال آیا تو اس نے ہاتھ میں اٹھائے پیکٹ کو واپس رکھتے ہوئے احسن کے گفٹ کو تلاش کر اپنے سامنے کیا، دیکھنے میں یہ پیکٹ بالکل چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا، اسے ایکدم تجسس سا ہوا، تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے جلدی سے گفٹ کی پیکنگ کو کھولا، جس کے اندر سے بلیک کلر کی نفیس ڈائری برآمد ہوئی۔

"تایا جی نے مجھے ڈائری کیوں گفٹ کی۔"

اسے ہلکی سی الجھن ہوئی ڈائری کو کھولنے سے پہلے دروازے کی طرف نظر کی تھی، جو ابھی تک اسی طرح بند تھا یعنی کہ ابھی ابھی منصور کی آمد کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

نظر کو دروازے سے ہٹا کر اس نے ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑی ڈائری کی طرف کی تھی، پھر پلٹ کر ڈائری کو دیکھنے کے بعد اس نے گہری سانس لیتے ہوئے ڈائری کو اوپن کیا، جس کے پہلے صفحے پر لکھی ہینڈ رائٹنگ کو دیکھ کر اس کی آتی سانس تک رک گئی۔

"بابا جانی کی ہینڈ رائٹنگ۔" اس نے ایک بار پھر آنکھوں کو مکمل وا کرتے ہوئے اس طرح دیکھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو، مگر اس وقت جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ جھوٹ نہیں تھا اس کی نظروں کے سامنے محسن کی ہینڈ رائٹنگ میں بڑی خوبصورتی سے بسم اللہ درج تھی، نامحسوس طریقے سے اس نے ان لفظوں پر انگلی پھیری تھی۔

"بابا جی۔" اس کا دل ایک دم سے سسک اٹھا تھا، اس دکھ کے ساتھ ایک دھڑکا بھی تھا کہ نجانے اب آگے کیا ہونے والا تھا، خود کو سنبھالتے ہوئے اسے اگلا صفحہ پلٹا، جس پر محسن کریم کے نام کے ساتھ ایک تاریخ بھی درج تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا یہ ڈائری آج سے تیس سال قبل لکھی گئی تھی۔

"یہ بابا جانی کی ڈائری ہے۔" مگر وہ ڈائری لکھتے تھے، یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتی تھی اسے اس بات کا علم تھا بابا جانی کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا، اپنے اسی شوق کی خاطر انہوں نے گھر میں چھوٹی سی لائبریری بھی تیار کی تھی، جہاں وہ دن کا کچھ حصہ لازمی گزارتے تھے، شاید وہیں جا کر وہ ڈائری لکھا کرتے تھے، جبھی آج تک وہ اس بات سے لاعلم رہی تھی۔

اس سے اس کے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے جن کے سوال اس کے پاس نہیں

تھے مگر ممکن تھا اس کے سوالوں کے جواب اس ڈائری میں موجود ہو، بہت ڈرتے ہوئے اس نے ڈائری کا اگلا صفحہ پلٹا تھا۔

"مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مفید ہو اور ان باتوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (سورۃ البقرہ آیت 216)

اپنے زعم میں مبتلا نجانے میں تکبر کے کس مقام تک پہنچ جاتا جو اگر میری نظر نے اس آیت کا ترجمہ نہ پڑھا ہوتا، اس ایک پل میں میں آسمان کی بلندیوں سے زمین پر آن گرا تھا، وہ بھی اس بری طرح کے نہ بڑھنے کو آگے کوئی راستہ تھا نہ پلٹنے کو کوئی جگہ منہ کے بل گرا میں اسی ایک وقت کو سوچ رہا تھا، جس میں میں نے آبگینے کو خود سے کمتر اور حقیر جان کر ٹھکرا دیا تھا، آبگینے رحیم جسے میں نے ہمیشہ ناسمجھ اور کم عقل سمجھا، جس کے متعلق میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ محبت بھی کر سکتی ہے وہ ہمیشہ سے مجھے جذباتی اور ضدی لگی، اس کو ایسا سمجھنے میں شاید اسی کا بہت بڑا ہاتھ تھا، اس کے متعلق میری یہ سوچ ہمارے بچپن کے ساتھ پروان چڑھی، اسے میں نے ہمیشہ اسی طرح دیکھا، اپنی من پسند چیز کے متعلق حد سے زیادہ پوزیسو۔

من چاہی چیز کے نہ ملنے پر ضد کر کے حاصل کرنے والی منہ سے بھی اگر وہ چیز حاصل نہ کر پاتی تو چھین کر حاصل کر کے چھوڑتی، مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میرا بہترین رزلٹ آنے پر ابا جی نے مجھے بہترین پین گفٹ کیا تھا میں ابا جی کا پیارا اور ان کا دیا گفٹ پا کر حد درجہ خوش تھا مگر بدقسمتی سے اس پل آبگینے وہاں آگئی میرا گفٹ دیکھ کر اس نے ابا جان سے اس طرح کا پن اسی وقت گفٹ کرنے کا مطالبہ کر دیا، اس کی اس بے وقت فرمائش کو سن کر میں نے بہت ڈرتے نامحسوس انداز میں اپنے گفٹ کو جیب میں چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی، مگر میرا ڈر اسی وقت حقیقت کا روپ دھارے سامنے آ گیا جب ابا جی نے میری اتری صورت دیکھنے کے باوجود میرا پین اسے دے دیا، اس ایک پل میں مجھے حد سے زیادہ غصہ آیا، وہ ایسی ہی تھی جو دوسروں سے چیز چھین کر خوش ہونے والی، میں نے غصیلی نگاہ جو اس کی طرف کی تو اس کے چہرے پر بجے جیت کے دل جلے تاثرات دیکھ کر میرے دل میں ایک دم سے اس کے لئے ڈھیروں نفرت نے جگہ بنالی تھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید گہری ہوتی چلی گئی، اس سے اکتاہٹ اور بے زاری اسی وقت سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی، مگر میں اس سے جتنا دور بھاگتا وہ اتنا میرے قریب آنے کی کوشش کرتی جس کی وجہ سے میں اس سے اور زیادہ چڑنے لگا، ایسے میں اس کا مجھ سے محبت کا اظہار، میرا دماغ بری طرح الٹ گیا میں مر کر بھی اس جیسی ناپسندیدہ ہستی کو اپنی زندگی میں شامل کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس وقت میرے بچپن کا وہ ایک ڈر عود کر آیا جو ہمیشہ مجھے ڈرایا کرتا تھا کہ کہیں اس کی ضد پر ابا جی میری پسندیدہ چیز اسے نہ تھما دیں۔

مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اس بار بھی اس کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر ابا جی زبردستی اسے میری زندگی میں شامل نہ کر دے اس سے بچنے کی خاطر میں نے ہر وہ طریقہ اپنایا جو میں اپنا سکتا تھا مگر وہ کسی بھی طرح پیچھے نہ ہٹی، شاید اس نے میرے انکار کو ضد وانا کا مسئلہ بنا لیا تھا، یا شاید وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی تھی مگر میں کیا کرتا مجھے اس میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں تھی حالانکہ وہ اتنی حسین

تھی جتنے حسن کی کوئی بھی مرد چاہ کر سکتا ہے مگر میں...... شاید میری جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو اتنی حسین لڑکی کو اپنے لئے یوں پاگل ہوتے دیکھتا تو اپنی قسمت پر ناز کرنے لگ جاتا، مگر میں......"

کاغذ پر بچے لفظوں پر دوڑتی اس کی نظریں اب ایک جگہ رک سی گئی تھیں آگے کچھ درج نہ تھا اس کے سامنے صفحہ خالی پڑا تھا۔

نجانے بابا جانی آگے کیا لکھنا چاہتے تھے جو یوں صفحات ادھورے چھوڑ دیئے تھے مزید جاننے کی خواہش میں اس نے تیزی سے اگلا صفحہ پلٹا مگر پچھلے آدھے ادھورے صفحے کی طرح یہ صفحہ بھی بالکل کورا تھا، اس نے الجھ کر اگلا صفحہ پلٹا مگر اسے بھی خالی پا کر اس نے بے تابی سے ایک ساتھ دو تین صفحے پلٹے، پانچویں صفحے پر کچھ لکھا ہوا تھا اس کی نظروں نے تیزی سے لفظوں پر دوڑنا شروع کیا تھا۔

"میں آبگینے رحیم سے کسی بھی صورت چھٹکارا چاہتا تھا جس کی قیمت خود اس نے میرے سامنے گلزار کی صورت میں رکھ دی، گلزار خاندان اور حیثیت میں کسی بھی طرح میرے برابر کی نہیں تھی میرے سامنے اب دو راستے تھے آبگینے اور گلزار، گو کہ دونوں راستے ہی انتہائی دشوار تھے مگر آبگینے ایک ایسا راستہ تھی جس پر سفر کی غلطی میں کبھی نہیں کرنا چاہتا تھا سو اس سے بچنے کی خاطر بنا کچھ سوچے میں نے دوسرا راستہ اختیار کرلیا، یعنی کہ گلزار سے شادی، بنا سوچے سمجھے اٹھائے جانے والے میرے اس قدم کی وجہ سے مجھے آبگینے سے نجات تو مل گئی مگر مجھے اس بات کا اندازہ بھی تھا کہ اس سب میں گلزار کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے اپنے حالات سے فرار کی خواہش نے گلزار کو میرا نام تو دے دیا مگر وہ میرا ساتھ کبھی نہ پا سکی، شاید وہ اس ساتھ کو پا بھی لیتی جو اگر وہ مجھے سمجھ لیتی۔"

خاموشی سے ڈائری پڑھتی ارما کے سامنے بہت سی حقیقتوں سے پردہ اٹھ رہا تھا، وہ سب اس کے سامنے تھا جو گلزار نے اس سے چھپا لیا تھا آگے وہ سب ہی حالات درج تھے جو گلزار اور حسن کی زندگی میں نئے موڑ لانے کی وجہ بنے تھے بہتی آنکھوں کے ساتھ ارما نے تیزی کے ساتھ ڈائری کے بہت سے صفحات پڑھے تھے ایک صفحے پر اس کی نظریں جم سی گئی۔

سکون کی تلاش میں بھٹکتا شخص اس وقت تک بے سکون رہتا ہے جب تک وہ اپنی بے سکونی کی وجہ سے تلاش نہیں کر لیتا۔

آبگینے سے نجات کے بعد میں نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ میں نے اپنا ہر ڈر خوف اپنی زندگی سے ختم کر دیا ہے مگر یہ میری بھول تھی، شاید محبت نے اپنے یوں رد کرنے کو پسند نہیں کیا تھا، اسی لئے میں میری زندگی میں ہمیشگی والی بے سکونی لکھ دی تھی "محبت" وہی محبت جو آبگینے مجھ سے کی، ایسی محبت جو شاید ہیر نے اپنے رانجھے سے کی ہوگی، ہاں آج مجھے اعتراف ہے اس پاگل لڑکی نے مجھ سے سچی محبت کی تھی مجھے اس بات کا احساس شاید کبھی نہ ہوتا جو اگر وہ اس دن مجھ سے ملنے نہ آئی ہوتی۔

ہمیشہ کی طرح اس نے رو کر مجھ سے معافی طلب کی تھی اور میں نے ہمیشہ کی طرح اسے جھڑک دیا تھا اس وقت میں اسے معافی دینا ہی نہیں چاہتا تھا پتا نہیں کیوں میرا دل بھی اس کو اس کی محبت اور اس کے آنسو دیکھ کر نہیں پگھلتا تھا شاید اس لئے کہ میں اس سے ڈرتا تھا یا شاید اس کی اس محبت سے جس میں شدت سے زیادہ جنون شامل تھا ایسا جنون جس نے مجھے اس سے نفرت پر مجبور کیا، یہی وجہ تھی اس وقت روتی ہوئی

وہ مجھے ہمیشہ سے کہیں زیادہ زہر لگی تھی میں نے انتہائی غصے سے اسے دیکھتے ہوئے زہریلے انداز میں کہا تھا۔

''اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو تو زندگی میں کبھی دوبارہ میرے سامنے مت آنا چلی جاؤ میری زندگی سے اتنی دور کہ پھر کبھی میں تمہاری شکل نہ دیکھ سکوں۔''

''شاید پھر کبھی میرا دل تمہیں معاف کر دے۔'' اس وقت یہ سب کہتے مجھے اپنے لفظوں کی سنگینی کا ذرا بھی احساس نہ تھا مگر اب سوچوں تو شدید احساس ستانے لگتا ہے، مگر اس نے میرے لفظوں کا مان رکھتے ہوئے اپنی محبت کا ثبوت کچھ یوں دیا کہ میں دنگ رہ گیا، میرے کہنے کے ٹھیک پندرہ دن بعد وہ شادی کر کے ہمیشہ کے لئے کینیڈا شفٹ ہوگئی، اس بار اس نے مجھ سے ملنے کی کوئی آخری کوشش بھی نہیں کی تھی، مگر آج میں اس کو بتانا چاہتا ہوں، اس کی محبت محبت رائیگاں نہیں گئی ہے، مجھے اعتراف ہے۔

''مجھے اس سے محبت ہو ہی جاتی جو اگر وہ مجھ سے محبت نہ کرتی۔''

میرے اس ایک اعتراف کے لئے اس نے مجھ سے محبت کی مگر اب اس ایک اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اب وہ اپنے راستے پر شاید آگے بڑھ چکی تھی اور خود میں بھی۔

پچھتاوے میں گرا گلزار کو بھگت رہا تھا جو شاید محبت کی بددعا کی صورت مجھ پر مسلط کر دی گئی تھی، نجانے وہ ایسی کیوں تھی خود میں مگن سب سے بے خبر اپنی کرنے والی، جو بھی تھا اب ہر صورت مجھے اس کے ساتھ نبھا کرنا تھا کہ اب وہ میری عادت کے ساتھ ساتھ میرے بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔

☆☆☆

آج شمیم آپی نے ارما کے لئے وسیم کا رشتہ دیا میں حد درجہ خوش تھا میرے اپنوں نے میری ہر غلطی کو معاف کر کے مجھے دل سے قبول کر لیا تھا میں نے ارما کا رشتہ وسیم کے ساتھ طے کر دیا، میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اس رشتے سے گلزار بالکل بھی خوش نہ تھی میں چاہتا تھا وہ میرے خاندان میں گھل مل کر رہے، مگر پتا نہیں کیوں وہ ہمیشہ ان سب سے دور بھاگتی تھی، شاید اسے برا لگتا تھا کہ میں اپنوں سے پھر سے جڑ گیا جبکہ وہ اپنوں سے الگ تھی، اس ایک بات کو محسوس کرنے کے بعد میں گلزار کے علم میں لائے بنا آج گلزار کے بھائی کے گھر اس کے بھائی سے ملاقات کی خاطر آیا تھا۔

جہاں پر میرا استقبال بڑی ناگواری کے ساتھ کیا گیا تھا، ماضی میں جو خطا مجھ سے سرزد ہوئی تھی اس کا مجھے احساس تھا، اسی لئے سر جھکا کر ان کی تمام تلخ باتوں کو پی گیا تھا، میں نے ان سے معافی طلب کرنا چاہی تھی میں چاہتا تھا وہ مجھے نہ سہی مگر گلزار کو معاف کر دیں، اسے دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کر لیں میری عاجزی سے طلب کی گئی معافی کو انہوں نے بری طرح رد کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر سے جانے کا حکم دے دیا تھا، میں واپس چلا آیا بالکل اسی طرح خالی ہاتھ جس طرح کبھی میں نے آبگینے کو لوٹا دیا تھا مجھے آج اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا جن کا مداوا تو ممکن نہیں تھا مگر میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اس سب کا ذکر گلزار سے بالکل نہیں کروں گا میں ہرگز بھی نہیں چاہوں گا کہ اس کا بھائی کسی بھی صورت اسے معافی دینے کو تیار نہیں ہے۔

میں ایک آخری کوشش ضرور کروں گا کہ گلزار ماضی کو بھلا کر میرے خاندان میں شامل ہو

جائے، تاکہ اسے اپنوں کی کمی کا احساس نہ ستائے۔

ارما ڈائری پڑھتی ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے بہت زیادہ تھک چکی تھی، اس لئے صفحات کے درمیان انگلی اڑس کر ڈائری بند کرتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند گئی، اس کی آنکھوں سے ایک ساتھ کئی آنسو موتی کی صورت بہتے ہوئے رخسار پر لڑھکے تھے۔

کچھ دیر پہلے تک وہ بابا جانی سے بری طرح بدگمان تھی مگر اب سب جان لینے کے بعد وہ خود سے شرمندہ دیکھائی دے رہی تھی، حالات جو بھی تھے اس سب میں قصوروار وہ تینوں ہی تھے، مگر اس کے باوجود ان تینوں نے اپنی اپنی زندگیوں کی بربادی کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرا دیا تھا، ماسوائے محسن کے جس نے اپنی غلطی کو دیر سے صحیح مگر قبول کر لیا تھا۔

''بابا جانی۔'' وہ ایک دم محسن کو یاد کرتی بری طرح روئی تھی، سیدھی ہوتے اس نے آنکھیں کھول کر اپنی چاروں اور غور سے دیکھا تھا، ہر طرف سناٹا طاری تھا، ایک دم اس کے ذہن میں یہ سوال کلبلایا تھا۔

''میری ماں اور میرے باپ کو اپنانے سے انکاری کے باوجود یہاں کے لوگوں نے اسے کس طرح اپنا لیا تھا۔''

سوال بڑا بے پروقت ابھرا تھا مگر اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا، گہری سانس بھرتی بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی اس نے دوبارہ ڈائری کھولی تھی جہاں مختصر سے پیرہ گراف نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔

گلزار مجھ سے خفا ہے مگر اس کے باوجود بھی میں ایک بار آبگینے سے ضرور ملوں گا اسے بتاؤں گا میں نے اسے معاف کر دیا ہے اپنی ہر بددعا اپنا ہر لفظ اس سے واپس لے لیا ہے، اسے کہوں گا وہ اپنا سکون مجھ سے واپس لے کر میرا سکون مجھے لوٹا دے، تاکہ میرے پاس گلزار کو دینے کے لئے ایک سکون تو موجود ہو۔

یہ آخری تحریر تھی جس پر درج ڈیٹ سے اگلے روز محسن کریم کا انتقال ہو گیا تھا، اب جب وہ سب کچھ ٹھیک کرنے والا تھا تو زندگی نے اس کو مہلت ہی نہیں دی تھی، سب کچھ درمیان میں ادھورا چھوڑے وہ جا چکا تھا۔

اس کے دل میں گلزار کے لئے بہت ساری ناراضگی پیدا ہوئی جسے دباتے ہوئے اس نے ڈائری کو بند کر دیا اس نے پیکنگ ریپر اٹھاتے ہوئے بڑی فکر سے سوچا تھا۔

اب سب جاننے کے بعد اس گھر میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا سزا سے کسی صورت کم نہیں ہوگا۔

ہونٹ کا نچلا کونا دانت میں دباتے ہوئے وہ اٹھنے کو تھی جب ڈائری کو دوبارہ پیک کر کے رکھتے ہوئے اس کی گود میں طے کیا ہوا صفحہ آن گرا، اس نے حیرت اور دھڑکتے دل کے ساتھ وہ صفحہ اٹھایا تھا۔

نہ جانے اب کس انکشاف کا ہونا باقی تھا۔

اس کے دل کی دھڑکن مزید تیز ہوئی تھی، اس نے صفحے کی طے کھولی اور اسے اپنی نظروں کے سامنے کیا۔

''پیاری ارما بیٹی، تم نے ہمارے ساتھ جو بھی رویہ رکھا اس کے لئے ہم تمہیں دل سے معاف کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں تمہاری ماں نے ضرور کوئی غلط بیانی کی ہوگی، جس کی وجہ سے تم سب ہم سے اس قدر بدظن ہو گئے ہو، ہمارے محسن کی غلطی اتنی بڑی ہرگز نہیں تھی بیٹا کہ اس کی

اولاد اس کے مرنے کے بعد اس طرح اس سے بدظن ہو جائے، میں چاہتا ہوں تم اپنے باپ کو دل سے معاف کر دو، میں نے جو بھی کہا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تمہاری شادی وسیم سے ہو جائے، جو تم سے حد درجہ محبت کرتا ہے مگر تمہارے باپ کی اور ہماری یہ خواہش ہی رہ گئی، جو بھی ہوا ہماری نظر میں محسن کے ساتھ گلزار اور آبگینے بھی قصوروار ہیں، مگر حقیقت جو بھی تھی وہ خود محسن ہی جانتا تھا، میں تمہیں محسن بن کر رخصت کرنا چاہتا تھا مگر، خیر محسن کی ڈائری اس کی کتابوں میں سے مجھے یہ ملی ہے، میں نہیں جانتا اس میں کیا درج ہے مجھے نہیں پتا کہ مجھے یہ تمہیں دینی چاہیے یا نہیں، مگر پھر بھی اس امید پر بھیج رہا ہوں کہ شاید اس میں کچھ ایسا درج ہو جس کو پڑھ کر حقیقت تم پر آشکار ہو جائے، کاش کہ یہ ڈائری مجھے تمہارے نکاح سے پہلے مل گئی ہوتی تو پھر شاید اب حالات یہ نہ ہوتے پھر شاید میں یہ سب کرنے سے تمہاری ماں کو روک لیتا، شاید تمہاری ماں بھی حالات سے [illegible]ب واقف تھی اسی لئے پہلے ہی تمہارا خفیہ نکاح کر دیا، خیر اب جب یہ ہو گیا ہے تو میرے پاس تمہیں دینے کو بہت سی دعائیں ہیں، تم اپنی نئی زندگی میں داخل ہو چکی ہو، خدا کرے کہ ہمارے سبھی وہم اور خدشے غلط ثابت ہوں اور منصور تمہیں بہت زیادہ خوش رکھے آمین۔"

"آخر میں بس یہ کہوں گا جب بھی تمہیں ہماری ضرورت محسوس ہو یا ہماری یاد ستائے تو بیٹا بغیر کسی جھجک اور کچھ بھی سوچے بنا ہمارے پاس چلی آنا، ہمارا دل اور دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے رہیں گے، اپنا بہت سا خیال رکھنا اور ہمیشہ خوش رہنا، خدا تمہارا حامی و ناصر، (تمہارا تایا احسن کریم)۔"

ہاتھ میں پکڑے احسن کے اس چند سطروں کے خط میں اس کے لئے وہ سبھی کچھ تھا جو اس کی وجہ سے ان کے دلوں پر گزرا تھا، ان کی محبتیں ہر ہر لفظ سے عیاں تھی وہ شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

"یہ میں نے کیا کر دیا؟" احساس ندامت سے چور وہ خود سے بھی نظریں نہ ملا پا رہی تھی نہ جانے اس سب میں خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی جو زندگی کے اس موڑ پر لا کر اس کے سامنے وہ سبھی حقیقتیں عیاں کر دی تھی جو ہمیشہ اس سے چھپی رہی تھی۔

محسن کریم کی نادانی اور ان پر گزری تمام اذیتیں، آبگینے رحیم کی ضد اور اس کی محبت میں چھپا جنون، گلزار کی حقیقت، سبھی کچھ تو اس نے جان لیا تھا، اسے سوچ کر ہی افسوس ہونے لگا تھا، حالات جیسے بھی رہے تھے مگر اس کی ماں کو اسے اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا اور وسیم، اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے بری طرح کچلا تھا یوں جیسے اپنی تمام اذیت کو کچل ڈالنا چاہتی ہو۔

آنسو بری طرح اس کی آنکھوں سے رواں تھے، دبی دبی سی سسکاریاں وقفے وقفے سے ان کے لبوں سے آزاد ہو رہی تھی، اس سے بہت سی باتوں کے ساتھ اسے وسیم کی محبت بھی بری طرح سے رونے پر مجبور کر رہی تھی جو بھی تھا مگر یہ بات سچ تھی محسن کریم اور ارما محسن کی زندگیوں میں محبت نے بالکل سچائی اور ایمانداری کے ساتھ دخل دیا تھا یہ ان کی قسمت تھی جو وہ انہیں برت نہ سکے، ایکدم بہت سی تھکن نے اسے آن گھیرا، خط کو ڈائری میں رکھ کر کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی، پلٹ کر واپس بیڈ کی طرف آتے وہ درمیان میں رک کر کھڑی ہوتی خالی نظروں سے بیڈ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

پوری رات کے انتظار کے بعد منصور ابھی تک کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا، اس کا نہ آنا

اسے بری طرح کھل رہا تھا اب اسے ہر سوال کا جواب ملا تو اس نے خود ہی سوچ لیا کہ منصور نے کمرے میں آنا ہی نہیں تھا ایسے میں بیٹھ کر اس کا مزید انتظار کرنا فضول تھا اس نے چینج کر لینے کا سوچا اور اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی نیت سے چینج روم میں چلی آئی، عروسی لباس اور زیورات سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ ہلکے کام والا گلابی جوڑا پہن کر باہر آئی تو دور سے آتی ہوئی فجر کی اذان کو سن کر بری طرح چونک گئی، اسے جاگتے پوری رات گزر گئی تھی، رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بری طرح جل رہی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی سونے کی اسے کوئی خواہش بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی سو وضو کرتی جائے نماز پر آن کھڑی ہوئی، خدا کے حضور جھک کر آنسو بہاتے ہوئے اس نے اپنا دل بڑا ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا، دکھ کی انتہائی کیفیت میں بھی اس کے لبوں پہ اس وقت خدا سے کوئی شکوہ نہیں تھا، ہاں اتنا ضرور تھا زندگی کے اس نئے رخ پر حیران و پریشان ہوتی، وہ صرف اتنا کہہ رہی تھی۔

''اے اللہ! یہ جو کچھ ہو رہا ہے میں نہیں جانتی اس میں تیری کیا مصلحت پوشیدہ ہے ہاں میں یہ جانتی ہوں کہ تو جو کچھ بھی کرے گا وہ میرے لئے بہتر ہوگا، میری بس اتنی التجا ہے ان حالات میں مجھے وہ فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما جو میرے حق میں بہتر ہو۔'' خدا کے حضور جھکی اس سے ہم کلام ہوتی نجانے کس وقت اس کی آنکھ لگی اور وہ وہیں سجدے میں ہی سو گئی۔

وہ نجانے کب تک سوتی رہتی، جو اگر کوئی اسے جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش نہ کرتا، جگانے والا شاید بہت غصے میں تھا، جو اس نے اپنا سارا غصہ اس کے کندھے کو جھنجھوڑ کر نکالنے کی کوشش کی تھی، وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

''کس طرح کی لڑکی ہے یہ جو ایسے حالات میں بھی اسے نیند آ رہی ہے۔'' ایک دوسری آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے بولنے والے کو نیند بھری آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

وہاں اس کے سامنے منصور خود اپنی پوری فیملی کے ساتھ کھڑا دکھائی دے رہا تھا، اس کی ساری نیند منٹوں میں ہوا ہوئی تھی، وہ سیدھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، ماں باپ ایسے تھے اور یہ نمازیں پڑھ رہی ہے۔'' منصور کے باپ نے زہر اگلا تھا، اس کا دل ایکدم دنگ رہ گیا، پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنی ماں کے سگے بھائی کو دیکھا، وہ شخص آج بھی ان سے نفرت کرتا تھا، تو پھر اس نے ان سے رشتہ داری کیا سوچ کر کی تھی، رات کو اس کے سامنے لٹکتا سوال دوبارہ آن کھڑا ہوا تھا۔

''نمازیں کہاں ابو جان، یہ ہمارے لئے بد دعائیں کر رہی ہو گی۔'' منصور کی بہن نے بھی منہ کھولا تھا وہ اسی طرح آنکھیں پھاڑے ان سے سوال کر رہی تھی۔

''میں آپ لوگوں کے لئے بد دعا کیوں کروں گی؟''

''کیونکہ ہم نے تجھے تیرے عاشق سے الگ جو کروایا ہے۔'' مامی نے کس قدر عامیانہ زبان استعمال کی تھی وہ جیسے زمین میں گڑنے لگی تھی۔

اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ سب اس کے ساتھ اس طرح کیوں کر رہے تھے، اگر ایسا ہی کرنا تھا تو اسے اپنے بیٹے کی بہو کیوں بنا کر لائے تھے، حیران و پریشان سی اس نے الجھ کر ان سب کے بیچ کھڑے منصور کو دیکھا۔

جو ان کے ساتھ انہی کی طرح کے تاثرات

لئے بالکل اجنبی بنا کھڑا تھا، اسے ان سے کسی قسم کی کوئی خوش فہمی باقی نہیں بچی تھی مگر دل کے کسی کونے میں منصور سے چھوٹی سی امید ضرور پیدا ہو گئی تھی، جواب اسے اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر بالکل ختم ہو گئی، وہ ان لوگوں کے سامنے ہرگز بھی رونا نہیں چاہتی تھی جن کے دل برسوں پرانی بات کو لے کر آج تک زہر سے بھرے پڑے تھے مگر وہ ایک انسان تھی جس کا دل دھڑک دھڑک کر اسے اس کے زندہ ہونے کی خبر دے رہا تھا۔

نہ چاہنے کے باوجود بھی آنسو بڑی تیزی کے ساتھ اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے، دھندلی آنکھوں اور خاموش لبوں کے ساتھ وہ ان کٹھور لوگوں کی طرح طرح کی بولیاں بولتے دیکھے جا رہی تھی۔

''جیسی اس کی ماں ویسی ہی یہ ہو گی، فارغ کریں بھائی اسے۔'' عاصمہ نے بڑے کاٹ دار لفظوں میں ایسی بات کہہ کر اس کی ذات تک کو روندھ ڈالا تھا وہ بری طرح تڑپ اٹھی، ان پتھر دل لوگوں کے سامنے رونے اور بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ جو کچھ انہوں نے سوچ کر کیا تھا ان کے لئے سب وہی سب ٹھیک تھا مگر پھر بھی اس نے بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے ان سے سوال کیا تھا۔

''جب ہم سے اس قدر نفرت کرتے ہیں تو مجھے اپنے بیٹے کی بہو بنا کر اس گھر میں کیوں لائے؟''

رات سے دل میں اٹھتے سوال کو آخر وہ زبان پر لے آئی تھی جسے سن کر ماہی جی بڑی طنزیہ ہنسی ہنستی بولی۔

''لڑکی کسی خوش فہمی میں ہرگز مت رہنا، تمہیں اس طرح اس گھر میں لانے کا مقصد صرف اور صرف اس بدنامی کا بدلہ لینا تھا جو تمہاری ماں کی وجہ سے ہمارے حصے میں آئی، تم لوگوں کا کیا گیا؟ بھگت تو ہم رہے ہیں، یہ ہماری بیٹی جو کسی بھی رشتے کے انتظار میں باپ کے گھر بیٹی بوڑھی ہوتی جا رہی ہے اس کی وجہ صرف اور صرف تمہاری ماں ہے، کیونکہ لوگ ہمارے خاندان کی کسی بیٹی کو اپنانے کو تیار ہی نہیں ہیں کیونکہ اس خاندان کی ایک لڑکی کے بھاگ جانے کی وجہ سے باقی سبھی لڑکیاں اسی ایک نظر سے دیکھی جا رہی ہیں، برسوں سے ہمارے دل میں ایک آگ بھڑکی ہوئی ہے، تمہاری ماں کو ہم کبھی اور کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔''

اپنی بیٹی کو سامنے کیے وہ حد درجہ جذباتی دکھائی دے رہی تھی، ارما کی نظر جھک گئی۔

''وہ اسی ماں کی بیٹی تھی، جس نے ان سب کو اس حالات سے دوچار کیا تھا۔'' ان کا غصہ ان کی اس درجہ نفرت شاید اپنی جگہ بالکل بجا تھی، مگر اس کا کیا قصور تھا۔

صرف یہ کہ وہ گلزار کی بیٹی تھی مگر بیٹی تو وہ محسن کی بھی تھی، قصور تو عاصمہ کا بھی نہیں تھا مگر وہ بھی سزا بھگت رہی تھی، اس سے اسے عاصمہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی، مگر اس سے کسی نے کوئی ہمدردی نہیں کی تھی، منصور نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اس ایک رات کے فرضی رشتے کو ختم کرتے ہوئے اسے آزاد کر دیا تھا۔

''ارما محسن میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔'' پل میں جیسے سب کچھ ختم ہوا تھا، وہ سانس روکے ساکن سی اس کے ہلتے لبوں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

گلزار بڑی خوش خوش سی ارما کے گھر جانے کی تیاریوں میں لگی تھی کہ آج صبح کا ناشتہ اسے وہاں لے کر جانا تھا، سب کچھ اچھی طرح تیار

کروانے کے بعد وہ خود تیار ہو رہی تھی جب اجڑے روپ میں سردسی ارما اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی، اسے اس طرح اس وقت اپنے سامنے دیکھ کر وہ حد درجہ حیران و پریشان سی اس کی طرف بڑھی تھی۔

''ارما بیٹا سب خیریت تو ہے تم یوں اس طرح اس وقت یہاں۔'' اس کے سوال کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولی تھی، پتھر کی طرح خاموش کھڑی وہ خالی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی اس کی اس درجہ خاموشی اسے دہلانے کو کافی تھی، تبھی بری طرح بوکھلاتے ہوئے اس نے اس بری طرح جھنجھوڑ کر کہا تھا۔

''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے ارما تم کچھ بول کیوں نہیں رہی ہو؟''

''ارما آپی بولیں ناں۔'' سوہا اور شہزاد بھی وہیں آ گئے تھے،اس نے اسی خاموش نظر سے ان دونوں کے پریشان چہروں کو دیکھا اور لبوں کی ذرا سی جنبش کے ساتھ سرگوشیانہ انداز میں جیسے دھماکہ کیا تھا۔

''منصور نے مجھے طلاق دے دی ہے۔''

''طلاق؟ تم پاگل ہو گئی ہو کیا جو اول فول بکے جا رہی ہو۔'' گلزار کے لفظوں سے کہیں زیادہ بے یقینی اس کے انداز سے عیاں ہو رہی تھی، یوں جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو منصور اس طرح بھی کچھ کر سکتا ہے۔

مگر شاید وہ یہ بھول رہی تھی، یہ دنیا ہے جہاں کے لوگ صدیاں گزار جانے کے بعد بھی انسان کے کیئے اس فعل کو کبھی معاف نہیں کرتے جس سے انہیں تکلیف و ذلت برداشت کرنا پڑی ہو۔

''میں پاگل نہیں ہوں امی نہ ہی اول فول بک رہی ہوں وہی بتا رہی ہوں جو حقیقت ہے۔'' اس نے اس کی نظروں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی سے ذرا اونچی آواز میں لب کشائی کی تھی۔

''مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے، منصور نے ایسا کیوں کیا ہے۔'' وہ حد درجہ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''اس لئے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں، اس ماں کی بیٹی جس نے ان کے گھر سے بھاگ کر ذلت و رسوائی ان کے مقدر میں لکھ دی، اس رسوائی کا بدلہ لینے کے لئے انہوں نے آپ کی بیٹی سے شادی کری اور طلاق دے دی تاکہ اس سے آپ کو تکلیف ہو، آپ روئیں، آپ اور بابا جانی کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے، اب اس طلاق کی بدنامی کے بعد آپ اور کریم خاندان بھی تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہیں گے امی۔'' آنسو ایک بار پھر موتیوں کی طرح اس کی آنکھوں سے برسنے لگے تھے۔

اس کے کہے ہر لفظ نے بھاری پتھروں کی صورت اختیار کر کے گلزار کو سنگسار کرنا شروع کر دیا وہ سانس روکے اسے بولتے سن رہی تھی۔

''آپ نے ہمیں ادھوری حقیقت بتا کر ہمیں ہمارے اپنوں سے الگ کیا ہماری نظروں میں ہمارے بابا جانی کو قصوروار ٹھہرا دیا مگر حقیقت تو یہ ہے امی قصوروار اگر بابا جانی تھے تو قصوروار تو خود آپ بھی تھیں، کیوں آپ نے ہم سے غلط بیانی کی امی۔'' وہ سراپا سوال بنی اس کے سامنے کھڑی تھی یوں لگتا تھا جیسے آج روز محشر برپا ہو گیا ہو، جس میں اس سے اس کے کیئے کی جواب طلبی کی جا رہی تھی۔

ارما کتنی ہی دیر اس کے بولنے کی منتظر رہی تھی مگر اب وہ بولتی بھی تو کیا، ہر حقیقت تو اس پر آشکار ہو چکی تھی، اس کو اس طرح خاموش دیکھ کر

ارما نے انتہائی دکھ سے کہا تھا۔

"آپ میری ماں تھیں امی، اس کے باوجود بھی آپ نے اپنے استعمال کیے جانے کا بدلہ مجھے اس طرح استعمال کر کے لیا۔" دکھ کی شدید کیفیت میں وہ استہزائیہ خود پر ہنس رہی تھی۔

"میں نے تمہیں استعمال نہیں کیا ارما۔" ایسا کہہ کر اس نے اس کے دکھ کو کم کرنے کی ذرا سی کوشش کی تھی۔

"تو پھر کیا کیا امی۔" وہ مزید دکھی ہوتی استفہامیہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں نے بس......" کچھ بولتی وہ ایک دم دانتوں تلے زبان دبا گئی تھی اب خود اپنی زبانی وہ اسے وہ سب کیسے بتاتی جو کچھ اس نے سوچ کر یہ سب کیا وہ سب انہیں بتا کر وہ مزید ان کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی تھی، بت بنے کھڑے سوہا، شہزاد اور لٹی پٹی ارما اور مجرم بنی کھڑی گلزار کو خاموش نظروں سے دیکھے جا رہے تھے، ان کے سامنے وہ سب انکشافات ہوئے تھے جس نے ان کی بولتی کو بری طرح بند کر دیا تھا، ارما نے دکھی نظروں سے ماں کو اس طرح بولتے سے چپ ہوتے دیکھا اور لب بھینچ کر ان کے کمرے سے نکل گئی، اب تک کا سفر دشوار ضرور تھا مگر اب شاید آگے کا راستہ بالکل صاف اور روشن تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا سب سے پہلے اسے اپنے پیاروں سے اپنے غلط رویے کی معافی طلب کرنا تھی پھر آبگینے رحیم کو برسوں پرانی اذیت سے آزادی دلا کر اس کی محبت کا یقین تھمانا تھا اور آخر میں اسے اپنی محبت یعنی وسیم کی طرف بڑھ کر اس کے انتظار کو ختم کرنا تھا، سوہا اور شہزاد بھی اس کے پیچھے اس کے پاس چلے آئے تھے۔

جبکہ اپنے کمرے میں گلزار پچھتاوؤں کے درمیان اکیلی کھڑی سوچ رہی تھی۔

"کیا مجھے کبھی کوئی معاف نہیں کرے گا؟، آخر میرے کیے کی سزا میری اولاد کو کیوں دی گئی ہے۔"

ان سوالوں کا خود اس کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا، انتقام کی جس آگ میں جل کر اس نے دوسروں کا سکون برباد کرنا چاہا تھا۔۔

آج اسی انتقام نے خود اسی کا سکون بری طرح برباد کر دیا تھا، کسی کے منہ پر طمانچہ مارنے کی خواہش نے اسی کے منہ پر بڑا سخت طمانچہ رسید کیا تھا، اپنی پوری زندگی کو سوچتے ہوئے وہ بری طرح تھک کر ہانپنے لگی تھی، اس سے پہلے کہ وہ گرتی وہ خود ہی زمین پر گر سی گئی، وقت نے اسے آئینہ دکھاتے ہوئے یہ سچ اس پر واضح کیا تھا۔

"ضد میں جوڑے گئے رشتے ہمیشہ بے وقت ہو کر رہ جاتے ہیں اگر انہیں نبھانے کی کوشش کی جائے تو بھی آبلہ پائی مقدر بنتی ہے اور اگر انہیں توڑ دیا جائے تو بھی انسان آبلہ پا ہو کر رہ جاتا ہے۔"

☆☆☆

الجھا سلجھا

عائشہ خان

آج پھر وہ میکے آ کر بیٹھ گئی تھی، دانیہ کی آنکھ کھلی تو اس نے گھڑی کی جانب نظر دوڑائی جو صبح کے دس بجا رہی تھی کچن سے امی اور آپی کی آتی آوازوں پر وہ حیرت سے سوچتی وہ ملحقہ باتھ روم میں چلی گئی، منہ دھونے میں بھی وہ سوچوں کے تانے بانے بنتی رہی، نہ جانے آج آپی کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش آ گیا جو صبح صبح چلی آئیں۔

منہ دھو کر تولیے سے صاف کرتی وہ بھی کچن میں آ گئی جہاں امی اور آپی باتوں میں مصروف تھیں۔

''السلام علیکم آپی! خیر تو ہے ناں، اتنی صبح؟''

وہ حیرت اور خوشی سے ملی جلی آواز میں فروا کے گال سے گال ملا کر پوچھنے لگی۔

''خیر کیسے ہوگی، سکون نہیں ہے مجھے اس گھر میں، ارے ساس صاحبہ کم ہیں جو ہر وقت کی نندوں کی آمد۔'' فروا آنکھوں میں آنسو لائی بولی۔

امی جو پہلے ہی اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں ایک بار پھر دل بھر کے بیزار ہوئیں۔

''ارے بیٹا یہ سب تو ہر خاندان کی روایت ہے ہر فیملی میں ایسا ہوتا ہے، نندیں میکے نہیں آئیں گی تو کہاں جائیں گی۔'' امی نے پھر رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور بیٹا یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ نندوں کی آمد پر تم سسرال چھوڑ چھاڑ یہاں بھاگ آؤ، خاندانی لڑکیوں کے یہ چلن نہیں ہوتے، مجھے دیکھو اپنی دونوں خالاؤں کو دیکھو، سب اپنے معاشرے میں ہی نبھاتے ہمیشہ، کبھی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر روٹھ کر میکے نہیں گئے اور پھر یہ تو ظہیر بیٹا کی عادت اچھی ہے جو روز میکے لے آتا ہے، اسے کیا پتا تم اس کی بہنوں سے بیزار ہو کر بھاگ بھاگ کر میکے آتی ہو، ورنہ تو کتنی شرمندگی ہو۔'' امی نے دانیہ کی طرف بے بسی سے دیکھا، وہ بھی اپنی بڑی بہن کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی، مگر اثر ندارد۔

''او امی ظہیر کو کیا پتا کہ میں اسی لئے یہاں آئی ہوں، میں روٹھ کے تو نہیں آئی۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے روٹھ کے نہیں جان بچا کے آئی ہو، مگر یہ کب تک چلے گا، تمہاری شادی کو چار ماہ ہونے والے ہیں۔'' امی نے پھر کوشش کی، وہ غصے سے پھر بھنچتی، شکوہ کناں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتی کچن سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

وہ ظہیر کے لئے ناشتہ بنا کے ٹیبل پر لگا رہی تھی، تبھی ظہیر آفس کے لئے تیار ہو کر آ گیا تھا، ساس بھی وہیں آ گئیں۔

''السلام علیکم امی!'' ظہیر نے آگے بڑھ کر ماں کے آگے سر جھکایا۔

فرمانبرداری اور بندوں کا ادب دیکھا تو اس کا جی جل کر خاک ہو گیا، ختم تھا، فروا ناگواری چھپا کے بولی۔

''امی آپ کا بھی ناشتہ لے آؤں؟''

''ہاں بیٹا لے آؤ۔'' کہہ کر وہ تسبیح گردانے لگیں، ظہیر مسکرا کے ناشتا کرنے لگا، فروا اور امی کے بیچ ساس بہو کے روایتی رشتے کی تلخی نہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا سو بار شکر ادا کرتا تھا

کیونکہ امی اور فروا دونوں کے بغیر اس کی زندگی
ادھوری تھی، اگر ذرا سا بھی تناؤ پیدا ہوتا تو وہ کبھی
بھی خوش نہیں رہ پاتا، یہ سوچ کر وہ بہت خوش تھا
مگر اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ چار دن کی
چاندنی ثابت ہوگی۔

☆☆☆

آج اس کا ارادہ امی کے گھر جانے کا تھا،
سارا کام گھر کا نبٹا کر دوپہر کا سالن روٹی جلدی پکا

لیا، گیارہ بج گئے تھے وہ کمرے میں بیٹھی ظہیر کے کپڑے استری کر رہی تھی۔

''فروا بیٹا!'' ساس اسے پکارتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔

''جی امی!'' وہ مصروف انداز میں ہاتھ چلاتی بولی۔

''بیٹا شام میں شازیہ اور شکیلہ آ رہی ہیں، کچھ اچھی ڈشز بنا لینا شکیلہ کے بچوں کو چاول زیادہ پسند ہیں ایک ڈش چاول کی بنا لینا اور میٹھے میں شازیہ کے بچوں کو پسند کے اورنج چاول زردہ بنا لینا۔'' وہ شازیہ کے بچوں کی اصطلاح اورنج چاول پر ہنستی ہوئی بولیں اور فروا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھے بغیر وہاں سے چلی گئیں۔

وہ تلملا کر رہ گئی سینے میں لاوا سا پکنے لگا۔

''حد ہوتی ہے کسی بات کی، کیا روز روز کا تماشہ ہے، آج شکیلہ آ رہی ہے تو کل شازیہ، میری اپنی تو کوئی مرضی نہیں ہے جیسے، جب دیکھو منہ اٹھا کے آ جاتی ہیں۔'' وہ غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات میں بھرائی ہوئی آواز بڑبڑائی اور استری شدہ کپڑوں کا گولہ بنا کر بیڈ پر اچھالتی ہوئی کچن سدھاری، جہاں اسے شام کے لئے نئے سرے سے تیاری کرنی تھی۔

☆☆☆

وہ آفس سے واپسی پر کمرے میں آیا تو خلاف معمول فروا کا موڈ آف تھا، وہ تن فن کرتی کمرا سمیٹتی بڑبڑا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔'' وہ ٹائی کھولتا حیرت سے بولا، اس کا جواب نہ پا کر وہ جھنجھلا کے بولا۔

''ہوا کیا ہے، تمہارا موڈ کیوں آف ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''آپ کو تو کچھ دکھتا ہی نہیں، میں بتاؤں گی تو آپ کو پتا چلے گا۔'' وہ غصے سے بھرائی آواز میں گویا ہوئی۔

''ہر وقت کا کیا تماشا ہے، آج شکیلہ آ رہی ہے تو کل شازیہ، اس گھر میں تو سکون نام کی چیز ہی نہیں ہے، آج مجھے اسی وجہ سے امی کے گھر جانا ملتوی کرنا پڑا۔'' اس کا اتنا سخت ردعمل دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گیا۔

''تمہارا دل اتنا چھوٹا ہے، اتنا بغض رکھتی ہو تم میری بہنوں سے تمہیں میری بہنوں کا آنا کھٹکتا ہے افسوس ہے تمہاری سوچ پر، یعنی کے اب وہ دونوں اپنی ماں کے گھر آنے کے لئے تم سے اجازت لیں گی کہ بھابھی آج ہم آ جائیں، تمہیں جانا تھا ناں، نہیں جا سکیں تو کل چلی جانا، ایسی کون سی قیامت آ گئی، کل چلی جانا۔''

''نہیں جانا مجھے۔'' وہ زور سے چیخی۔

ایسی بدتمیزی اس نے آج تک ظہیر سے نہیں کی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا اور وہ تنبیہہ لہجے میں غصہ دبا کر بولا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔'' اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس نے بیگ میں دو چار جوڑے اور امی کو فون کر دیا کہ خالد بھائی کو بھیج دیں نہیں تو میں اکیلی ہی نکل آؤں گی مجبوراً امی نے جلدی سے خالد بھائی کو بھیج دیا، ادھر ظہیر نے بھی غصے میں جانے سے روکا نہیں۔

☆☆☆

''بیٹا تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یوں میکے آ جانا اچھی بات نہیں۔'' امی پریشان ہوئیں۔

''یہ چھوٹی بات ہے۔'' وہ صدمے کی سی کیفیت میں بولی۔

''امی ظہیر نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا اور آپ کہہ رہی ہیں چھوٹی بات ہے۔'' اس کے آنسو بھل

بھل بہنے لگے۔

''اچھا اب تم بھی چپ ہو جاؤ ناں۔'' امی کو اس کی حالت پر رحم آیا تو اس کی تسلی کو بولیں۔

''صبح ظہیر کو بلا کر بات کرتی ہوں۔'' وہ بھی کیا کرتیں ماں تھیں، حالانکہ سراسر غلطی فروا کی دکھ رہی تھی پھر بھی بیٹی کی محبت کے آگے مجبور تھیں اور مسئلے کا حل نکالنا بھی ضروری تھا۔

فروا اور ظہیر کی شادی کو بہ مشکل چار ماہ ہی ہوئے تھے، اس کی ساس اور نندیں عادت کی بہت اچھی تھیں، روایتی نئی نہ تھی شازیہ، شکیلہ بھی میکے آ کر سارا کام بھابھی سے کروانے کی قائل نہ تھیں وقتاً فوقتاً فروا کا ہاتھ بٹا دیتی تھیں اور پھر ساس خود صلح جو خاتون تھیں، مگر نہ جانے فروا کو کیوں نندوں کے آنے سے چڑ ہونے لگی تھی اور اسی وجہ سے وہ ساس سے بھی پرخاش رکھنے لگی۔

☆☆☆

''آنٹی یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، بس غصے میں ہاتھ اٹھ گیا، ایسی بات سن کر کسی کو بھی غصہ آ سکتا ہے، خیر کہاں ہے فروا میں اس سے سوری کر لیتا ہوں۔'' ساس کے سامنے وہ مودبانہ لہجے میں بولا، وہ جھٹ پٹ بہن کو بلا لائی، وہ بھی کھنچی کھنچی سی سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

''آئندہ ایسا نہیں ہوگا، چلو گھر چلو، امی بھی ساتھ آ رہی تھیں مگر میں ساتھ نہیں لایا، چلو تیاری کر و گھر چلیں۔'' وہ بولا۔

''جاؤ بیٹا اپنا بیگ لے آؤ۔'' اس سے پہلے کہ فروا کوئی شکوہ کرتی، امی نے موقع غنیمت جان کر اسے وہاں سے ٹالا، بیٹی داماد کو ساتھ جاتا دیکھ کر انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

''پتا نہیں اس لڑکی کو کب عقل آئے گی۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

وہ واپس آ تو گئی تھی مگر اس کا موڈ ٹھیک ہونے میں نہیں آ رہا تھا، چند دن بعد شازیہ، شکیلہ آئیں تب بھی اس نے بے رخی اختیار رکھی، یہاں تک کہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کی نہ ہی کسی کام میں حصہ لیا۔

حد تو یہ کہ شازیہ کے بیٹے نے اس کے جہیز کا قیمتی گلاس توڑ دیا تو اس نے چھوٹے سے بچے کو تھپڑ مار دیا، ظہیر کو شدید غصہ آ گیا مگر اس کی ساس جو کافی صلح جو خاتون تھیں، معاملہ رفع دفع کر دیا۔

یہ مسئلہ آئے روز کا بنتا جا رہا تھا، معمولی باتوں پر فروا غصے سے لال پیلی ہو جاتی اور نتیجہ وہی ان دونوں کا جھگڑا، جسے اس کی ساس معاملہ فہمی سے حل کر دیتیں، مگر بات یہیں تک محدود نہ تھی، جھگڑا ختم ہو جانے کے باوجود فروا روٹھ کے میکے جا کر ضرور بیٹھتی، جسے امی یہ سمجھا کر کہ ''تمہاری چھوٹی بہن بھی ہے اس طرح تو اس کا رشتہ کس طرح ہوگا، آخر کو اس کی بھی شادی کرنی ہے۔''

مگر وہ فروا ہی کیا جسے کوئی نصیحت یاد رہے اس کی بودی دلیلوں کے آگے امی جز بز ہو کر پہلو بدل لیتیں۔

☆☆☆

وہ صبح سے خوش تھی، امی کا فون آیا تھا، خالد بھائی کے لئے لڑکی دیکھنے جانا تھا، وہ صبح ناشتا کر کے ظہیر کے ساتھ امی کے گھر آ گئی تھی، ظہیر چھوڑ کے آفس چلا گیا۔

''پتا ہے آپی! سنا ہے ہماری ہونے والی بھابھی کوکنگ میں ماہر ہیں، ہم سب کی تو موجیں ہو گئیں، بریانی قورمہ، نہاری، پائے بنانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، خوب شوق ہے پکوا کر کھائیں گے۔'' وہ چہکی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں ضرور وہ وقت تو آنے

دو۔" وہ جلدی جلدی جیولری پہنتی تینوں ہنسی مذاق کے ساتھ تیاری میں مگن تھیں، تب ہی ابو پکارتے ہوئے آ گئے۔

"بھئی کیا ہوا؟ تیاری مکمل ہوئی کہ نہیں۔" وہ تینوں جلدی سے فائنل ٹچ دے کر بھاگم بھاگ باہر نکلیں۔

لڑکی والوں کے ہاں بڑی خوش اسلوبی سے تمام معاملات طے پا گئے، لڑکی پسند آ گئی، دونوں گھرانوں کے متفقہ فیصلے سے شادی اگلے ماہ طے پا گئی، دونوں خاندان بڑے خوش تھے، ان کو بھی خالد بھائی بہت پسند آئے تھے، گھر آ کر بھی دانیہ اور فروا مسلسل خالد بھائی کو چھیڑتی رہیں۔

"سچ بھائی، بسمہ بھابھی بہت خوبصورت ہیں آپ دیکھ لیتے تو تو......" دانیہ نے مسکرا کر کہا۔

"بس بس میرے نیک بچے کو تم دونوں ستاتی رہو گی۔" امی نے مسکرا کر دونوں بیٹیوں کو ڈانٹا جو بھائی کو ستانے کے فل موڈ میں تھیں، خالد بھائی بھی مسکرا کے رہ گئے۔

☆☆☆

بڑی دھوم دھام سے دلہن کو رخصت کر کے لے آئے تھے اور تمام رسمیں بڑے خوش گوار ماحول میں ادا کی جا رہی تھیں، تمام گھر والے خوش تھے اور تو اور ظہیر نے بھی کل کی آفس کی چھٹی لے لی تھی، ولیمے میں شرکت کر کے تمام مہمان بھی اپنے گھر ہو لئے تھے، ظہیر اور فروا بھی جانے کی تیاری میں تھے، دانیہ پورا گھر سمیٹتی پھر رہی تھی، لگتا تھا کہ پورا گھر الٹ گیا ہے، بڑی مشکل سے اپنی روٹین پر سب چیزیں آئیں، حسب معمول گھر کی روٹین اچھی چلنے لگی، بسمہ کی عادت بھی بہت اچھی تھی یہ رائے تمام گھر والوں کی چند دن میں ہی قائم ہو گئی تھی، خالد اور بسمہ ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش تھے۔

☆☆☆

حسب روایت آج پھر شازیہ، شکیلہ آئی ہوئیں تھیں، ان کے بچوں نے اچھل کود اور ادھم مچایا ہوا تھا اور فروا کا موڈ بھی حسب روایت خراب تھا، وہ اپنے کمرے سے نکلی، کچن کی جانب جانے لگی تو ساس کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے شازیہ کی آواز سنی، تو وہ رک گئی، وہ دکھ بھری آواز میں ماں سے کہہ رہی تھی۔

"امی بھابھی ہم سے اتنی اکڑی اکڑی کیوں رہتی ہیں، ہم جب بھی آتے ہیں تو ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتیں، بچوں کو بھی ڈانٹتی رہتی ہیں، ہم نے تو انہیں کبھی بھابھی نہیں سمجھا، انہیں بہن کی طرح ہی سمجھتے ہیں مگر...... کیا امی آپ کے ساتھ بھی بھابھی اسی طرح رہتی ہیں۔" وہ ابھی بول ہی رہی تھی کہ دروازہ ڈھاڑ کی آواز کے ساتھ کھلا اور وہ غصے بھرا چہرہ لئے کاٹ دار آواز میں بولی۔

"کیا برائیاں کر رہی ہو میری، ایسا کون سا ظلم کر دیا میں نے تم پر اور تمہاری مظلوم ماں پر اور آپ۔" وہ ساس کی طرف مڑ کے بولی۔

"آپ کو شرم آنی چاہیے بہو کی برائیاں کرتے ہوئے۔" اس کا جملہ پورا ہونے بھی نہ پایا تھا کہ چٹاخ کی آواز کے ساتھ ظہیر کی آواز بھی گونجی۔

"چپ کرو، تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری ماں کے ساتھ اس لہجے اور ایسے الفاظ میں بات کرنے کی۔" وہ گال پر ہاتھ رکھے حیرت سے پھٹی آنکھیں لئے ششدر سی بیٹھتی چلی گئی۔

"تمہیں کچھ کہا نہیں تو تم سر پر ہی چڑھتی جا رہی ہو۔" وہ غصے میں بولا۔

''میں اب اس گھر میں ایک پل نہیں رہوں گی، میں جا رہی ہوں۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں جاؤ آج میں تمہیں رکوں گا بھی نہیں۔'' ساس اس کو روکتی رہ گئیں مگر ان کی بات نہ بیٹے نے سنی نہ بہو نے اور آج فروا اکیلی ہی میکے روانہ ہوگئی تھی۔

☆☆☆

جس وقت وہ روتی دھوتی میکے پہنچی، امی ابو اور دانیہ گھر پر جبکہ بسمہ خالد کے ساتھ اپنی امی کے گھر گئی ہوئی تھی۔

''میں اس گھر میں اب کبھی واپس نہیں جاؤں گی اب تو حد ہوگئی، سب ختم ہوگیا۔'' وہ شکستہ لہجے میں روتے ہوئے بولی۔

''ایسا کیا کہہ دیا تھا میں نے ان کی امی کی شان میں ایسی کون سی گستاخی کردی تھی۔''

''بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے میں نے پہلے بھی تمہیں سمجھایا تھا وہ تمہارا سسرال ہے، اچھی بری بات برداشت کیا کرو، معمولی باتوں پر گھر چھوڑ چھوڑ کر میکے آ بیٹھنا، اپنی چھوٹی بہن کو بھی یہ سبق دو گی تم، میرا پڑھایا سبق تو تم یاد رکھتی نہیں ہو پانی پھیر دیتی ہو میری نصیحتوں پر، بات ہوں میں کل ظہیر کو اور بات کروں گی۔'' امی غصے سے بولیں۔

''غضب خدا کا اب تو گھر میں بھاوج بھی آ گئی ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے نہیں جاؤں گی میں اس گھر میں۔'' وہ روتے ہوئے اٹل لہجے میں بولی۔

بسمہ اور خالد بھی آ گئے تھے اور سیدھے ڈرائننگ روم میں آ گئے جہاں تمام گھر والے بیٹھے تھے۔

''فروا.....اس وقت خیریت تو ہے ناں۔'' خالد بھائی فکرمندانہ لہجے میں بولے۔

''ظہیر سے جھگڑا ہوگیا ہے۔'' امی نے خالد بھائی کو بتایا، جسے سن کر بسمہ کا چہرہ تن گیا، وہ بیزار سے لہجے میں ''خالد مجھے نیند آ رہی ہے کمرے میں جلدی آ جایئے گا'' کہتی ہوئی کمرے میں جانے لگی۔

''جلدی آیئے گا۔'' کہہ کر وہ اک سرد بیگانی سی نظر فروا پر ڈال کر چلتی بنی۔

اور فروا جیسے آٹھ نو ماہ سے امی کی نصیحت سمجھ نہیں آ رہی تھی ان کا دیا سبق سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

بسمہ کی ایک نگاہ نے وہ سبق دے دیا تھا، اس کی چبھتی نگاہ نے فروا کے جسم میں سنسنی دوڑا دی اور اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ صبح امی ظہیر کو بلائیں گی تو وہ منع نہیں کرے گی۔

☆☆☆

حنا اصغر

کچھ دنوں سے حمزہ کی سرگرمیاں بہت مشکوک ہوگئی ہیں وہ گھر پر پہلے بھی کم ہی ٹکتا تھا لیکن کچھ دنوں سے وہ رات کے ڈیڑھ بجے آتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا جب وہ رات آٹھ بجے آتا تو ڈیڑھ دو بجے بستر پر موجود نہ پا کر میرا سانس رک جایا کرتا تھا میں اس کو پورے گھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو جایا کرتی تھی پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہوتا تھا اور حمزہ موجود ہوتا تھا سب موجود ہوتا سوائے اس کے جب میں رو دھو کر فارغ ہو جاتی تو وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتا مجھ پر نظر پڑتے ہی ایکدم ٹھٹک جاتا پھر بے نیازی کا چولہ پہن کر کہتا۔

"میرا دم گھٹ رہا تھا اس لئے نیچے واک کرنے گیا تھا، تم تو جانتی ہو مجھے فلیٹوں میں رہنے کی عادت کہاں ہے چلو آؤ اندر چلیں۔"

اس کی اتنی بڑی وطویل وضاحتیں میرا دم گھونٹنے کو کافی ہوتیں لیکن میں یہ ساری دبی دبی چیخیں اس کے وسیع وعریض سینے میں دفن کر دیا کرتی تھی اور وہ بظاہر پھر بڑا انجان بنا لیٹا رہتا تھا اور اکثر وہ بظاہر سگریٹ پیتے پیتے بڑبڑایا کرتا تھا میرے پکارنے پر وہ ایسے چونکتا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو پھر سگریٹ کو جوتوں سے ایسے مسلتا جیسے میری پوری ہستی کو مسل رہا ہو، اس کی خستہ حالی میرا دل ہلا دیا کرتی، آخری بار تو وہ نیند میں کسی ثمرین کو یاد کر رہا تھا اس کے منہ سے غیر عورت کا نام سن کر میرا پورا جسم انگاروں پر لوٹنے لگا تھا۔

☆☆☆

"وہ مجھے کہتا ہے کہ میں بلاوجہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دیتی ہوں۔" اس نے تائیدی انداز میں افشاں کو دیکھا۔

"ہو سکتا ہے وہ درست کہتا ہو۔"

"لیکن کل رات اس نے جو چادر اوڑھی تھی اس میں لیڈیز پرفیوم کی خوشبو تھی میرا دل سونگھ کر بیٹھنے لگا تھا افشاں حمزہ مجھ سے بے وفائی کر رہا ہے۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

"لیڈیز پرفیوم تو تم بھی استعمال کرتی ہو، کون سا پرفیوم تھا؟"

"بلو لیڈی۔" وہ بے دھیانی میں بولی۔

"وہ تو تم استعمال کرتی ہو، ہے ناں۔"

واقعی وہ بھی یہی پرفیوم استعمال کرتی تھی، شاید کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ بھولنے لگی تھی الجھنے لگی تھی۔

"خود کو غیر ضروری ابہام میں مت الجھاؤ حمزہ تمہارا ہے، اس کو خود سے متنفر نہ کرو اس طرح کے شکوک وشبہات سے تم اس کو خود سے دور کر دو گی وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔" افشاں نے رسان سے کہا ایک پل کو وہ خاموش ہوگئی تھی۔

"یہ بتاؤ حماد بھائی کب آرہے ہیں؟"

"ابھی تو ٹائم ہے ان کے آنے میں۔"

افشاں بے نیازی سے کہہ کر چائے پینے لگی تھی اور کبھی کبھار الوینہ کو اس کی بے نیازی پر رشک آتا تھا کاش وہ بھی ایسی بے نیازی کا چولہ پہن کر سکون سے ایک رات، صرف ایک رات سکون

سے سو سکتی؟ لیکن وہ تو کسی بھٹکی روح کی طرح ہر وقت جاگتی رہتی تھی طرح طرح کے وسوسوں ابہام میں الجھنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی لیکن شکوک و شبہات سائے کی طرح ہر وقت اس کے دماغ سے چمٹ سے گئے تھے، حمزہ کو ہر وقت شک کی نظر سے دیکھنا، اس کی چوریاں پکڑنا ہی اس مشغلہ بن گیا تھا، وہ اس کے کپڑے اس کی جیبیں ٹٹولتی اس کا موبائل فون چیک کرتی، رات کو جاگ جاگ کر اس کو دیکھتی وہ کسی متاع عزیز کی طرح حمزہ کے لٹ جانے کا خدشہ دل

کے نہاں خانوں میں چھپائے بیٹھی تھی اور یہی ڈر یہی خوف لاشعور سے شعور تک پہنچ چکا تھا۔

کبھی کبھار حمزہ کی بے وقت فکری اس کو ہولا دیتی تھی، کبھی اس کا حد درجہ احساس محبت اور توجہ اس کو الجھن میں مبتلا کر دیتا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے کس جرم کس کوتاہی کس غلطی کا ازالہ کرنا چاہ رہا ہو، لیکن شاذونادر ہی ایسا ہوا تھا جب اس نے حمزہ کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہو یا اس کو پکڑنے میں کامیاب ہوئی ہو۔

وہ پکا منجھا ہوا کھلاڑی تھا وہ اپنی ہر کارروائی کے بعد انتہائی صفائی سے ثبوت مٹا دیتا تھا۔

اور کبھی کبھار اس کو لگتا کہ جیسے وہ دھاگہ دھاگہ شک کا جال بناتی ہو اور خود ہی اس جال کو بھول بھلیوں میں الجھ جاتی ہو، سکون کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہو اور خود ہی بے سکون ہو جاتی ہو۔

کچھ دنوں کے لئے وہ کراچی چلی گئی وہاں اس کا میکہ تھا سسرال تھا وہاں رہ کر بھی اس کا دل بے کل رہا دل کو کسی طور سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا، حمزہ کا فون آیا وہ بے چین تھا گھنٹہ وہ اس سے لایعنی باتیں کرتا رہا اور ان لایعنی باتوں میں وہ شک کی پگڈنڈیوں پر سفر کرتی رہی آنسو اس کا چہرہ بھگوتے رہے۔

"تم رو رہی ہو؟" حمزہ کے قیاس پر وہ حق دق رہ گئی۔

"نن...... نہیں...... نہیں تو۔"

"جان کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ، کسی نے کچھ کہا ہے کسی کی کوئی بات بری لگی ہے۔" اس کی آواز میں لگاوٹ وحلاوت کے جذبات امڈ رہے تھے، وہ بے ساختہ روتے ہوئے ہنس دی۔

"حمزہ تم میرے ہو ناں۔" یقین کی کئی ڈوروں کو تھامتی ہوئی ہوا میں اڑنے لگی تھی۔

"ہاں میری جان میں تمہارا ہوں، قسم سے۔" ہزار بار کا دیا ہوا جواب اس نے اسی جذب سے دیا جس جذب سے وہ دیتا تھا، دل بے اطمینان کو کسی طور اطمینان نصیب ہوا تھا۔

"اب جلدی سے گھر آنے کی کرو تمہارے بغیر دل نہیں لگ رہا میرا، ہر رات کانٹوں پہ گزارتا ہوں ہر دن تنہائی دن کو طویل کر دیتی ہے۔" اس کا سرگوشیانہ لہجہ ہمیشہ اس کو خود میں سمٹنے پر مجبور کر دیتا تھا وہ مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

حمزہ اس کا کلاس فیلو تھا وہ دل ہی دل میں اس کو چاہنے لگا تھا لیکن الوینہ انتہائی پڑھاکو اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی اس کے لئے دیئے انداز سے حمزہ کا دل مسوس رہ جاتا وہ اپنی تمام ہمتیں مجتمع کر کے اس کی جانب بڑھتا لیکن اس کے چہرے پہ لگا نو لفٹ کا بورڈ اس کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا تھا اور پھر اس کے بے نیازی کے چولے میں آہستہ آہستہ شگاف پڑنے لگے تھے وہ بے نیازی سے نیاز مندی کا روپ دھار چکی تھی، حمزہ کے جلتے شعلوں جیسے احساسات نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، وہ خود اسی دہکتی آگ میں جھلسنے لگی تھی لیکن اس جھلسے میں بھی شبنم جیسی ٹھنڈک اور تروتازگی تھی۔

اور ایک دن حمزہ سورج کا دیوتا بنا کھڑا تھا تپا ہوا کہ اس کے سامنے کھڑے رہنے کی اس میں تاب نہیں تھی۔

"تمہارے والدین نے آخر کیا سوچ کر انکار کیا ہے میرے گھر والے اب کسی صورت دوبارہ رشتہ لینے نہیں آئیں گے تم آخر اپنے گھر والوں کو کیوں نہیں سمجھاتیں؟" اس کے الفاظ پگھلتے شیشے کی طرح اس کے اعصاب پر گرے تھے۔

"کیا مطلب؟" وہ بھونچکی رہ گئی۔
"مطلب یہ کہ تمہارے بابا جان نے کل پھر انکار کر دیا ہے اور اب میرے والدین بھی ہتھے سے اکھڑ گئے ہیں وہ تین ماہ میں تین دفعہ جا چکے ہیں تمہارے گھر لیکن تمہارے بابا اپنی بات پر اڑے کھڑے ہیں۔" وہ کہہ کر جا چکا تھا اور الوینہ کا یہ سوچ سوچ کر ہی برا حال ہو رہا تھا کہ وہ اب حمزہ کو کیسے منائے گی۔

☆☆☆

آخر کار ان کے والدین کی ان دونوں کے جذبات کے آگے سرتابی کرنا پڑی اور یوں الوینہ حسن، الوینہ حمزہ خان بن گئی۔ حمزہ کے گھر والوں نے اس کو دل و جان سے قبول کیا تھا، وہ ان کی لاڈلی بہو تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ حمزہ جس نے نئی نئی جاب شروع کی تھی اس کا تبادلہ لاہور ہو گیا تھا اور وہ کسی صورت بھی اس کے بغیر جانے کو تیار نہ تھا گھر والوں نے بہت آنا کانی کی لیکن وہ ڈٹا رہا اور آخر نا چاہتے ہوئے الوینہ اس کے ساتھ دربدری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی یہاں آ کر اس کا بالکل بھی دل نہیں لگا تھا اگرچہ اس نے دل لگانے کی بہت کوشش کی تھی اور یوں اس شہر کی بھول بھلیوں میں پانچ سال کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا۔

اولاد نہ ہونے کی محرومی نے اس کو اور حمزہ کو سمندر کے دو کنارے بنا دیا تھا جو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں اور اسی دوری نے اس کے دل میں شک کے بے پناہ بیج بونا شروع کر دیے تھے ان بیجوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے پودے اور پھر تناور درختوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

اب وہ چاہ کر بھی نہ تو ان کو کاٹ سکتی تھی اور نہ ہی ان کی جڑوں کو زمین سے کھینچ کر نکال سکتی تھی، وہ کراچی سے لاہور واپس آ گئی تھی اعصاب شکن سفر اس نے کر تو لیا تھا لیکن ابھی بھی اعصاب چٹک گئے تھے، اولاد نہ ہونے کا غم کسی پہاڑ سے غم کا تھا جو وہ ہمہ وقت سہتی تھی لوگوں کی باتیں، معنی خیز جملے اس کو اور زیادہ اذیت میں مبتلا کر دیا کرتے تھے۔

لاہور آنے کے بعد وہ افشاں سے ملنے آ گئی تھی جو کہ نہ صرف اس کی دوست تھی بلکہ نیچے والا فلیٹ بھی اسی کا تھا، اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد افشاں کی تسلی و تشفی نے اگرچہ اس کا حوصلہ کس حد تک بلند کیا تھا لیکن سامنے میز پر رکھی گھڑی نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے یہ تو حمزہ کی گھڑی ہے۔ اس کے ذہن میں خطرے کے بیک وقت کتنے ہی الارم بجے تھے یا یہ وہی ہی ہے؟ لیکن افشاں کا شوہر تو دوبئی ہوتا ہے وہ اپنے اکلوتے بچے کے ساتھ یہاں ہوتی ہے پھر یہاں مردانہ گھڑی کا کیا کام، اس نے اپنے ذہن پر لاکھ زور دیا لیکن پھر بھی اس کے شعور میں یہ بات نہ ابھری کہ حمزہ نے آج گھڑی پہنی تھی یا نہیں؟

افشاں اپنے دو سالہ بیٹے کو دودھ پلا رہی تھی اور وہ پیاسی نظروں سے اس کے گل گوتھنے کو دیکھ رہی تھی اس پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے اس کے ذہن سے حمزہ اور گھڑی کی بات محو ہو گئی تھی۔

اس کا بیٹا بہت خوبصورت تھا، یا پھر دنیا کے سارے بچے اتنے ہی حسین ہوتے ہیں جتنا کہ وہ تھا، افشاں بچہ اس کو پکڑا کر اپنے شوہر سے محو گفتگو ہو گئی تھی جس کی کال آئی تھی اور وہ اپنے لمس کی حدت بچے کے وجود میں اتارنے لگی، بچہ اس کے لمس پر بوکھلا اٹھا اس نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ دیوانہ وار اس کو چومے گئی تھی یہاں تک اس کی دلدوز چیخوں نے افشاں کو بھاگ کے

آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کک..... کیا ہوا ہے الوینہ؟" افشاں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں شاید بھول گیا ہے مجھے۔" اس نے انتہائی پیار سے اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرا افشاں نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھا لیا۔

"حماد بھائی کب آرہے ہیں پاکستان؟"

"ابھی تو ٹائم ہے ان کے آنے میں دو دن بعد میری ساس رہنے کے لئے آرہی ہیں۔"

تبھی اس کا موبائل بجا، حمزہ کی کال آرہی تھی وہ ٹھٹک گئی وہ گھر آچکا تھا اور اس کو بلا رہا تھا وہ سرعت سے گھر آگئی حمزہ کی کلائی میں گھڑی نہ دیکھ کر اس کے خوف خدشات ایک بار پھر تناور ہو چکے تھے۔

اس نے انتہائی بددلی سے کھانا بنایا حمزہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اس نے کھانا اس کے سامنے تقریباً پٹخا تھا، وہ تحیر سے اس کو دیکھنے لگا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" حمزہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کھانا تو کھا لو۔" حمزہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"کوئی ناراضگی ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" الوینہ نے بامشکل اپنی آنکھیں جھپکائیں آنسو باہر آنے کو بے چین تھے۔

"بتاؤ ناں۔" حمزہ نے لاڈ سے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپایا۔

"کچھ نہیں ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"پلیز۔" حمزہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں ہے کہا تو ہے، کیوں تنگ کر رہے ہو، چھوڑ دو مجھے میرے حال پر اپنی دنیا میں مست رہو۔"

"کون سی دنیا کہاں مست ہوں میں، میں سارا دن تمہارے پیچھے بھاگتا ہوں اور تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے، گھر پر تم توجہ نہیں دیتیں، میرا بات کرنا تمہیں گراں گزرتا ہے زندگی عذاب ہو گئی ہے میری کوئی شے وقت پر نہیں ملتی نہ صبح کا ناشتہ نہ دوپہر کا کھانا ہمہ وقت تمہاری شکی کھوجتی نگاہیں ایکسرے کرتی رہتی ہیں میرا، میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہوں ہمہ وقت اپنا وجود کسی کٹہرے میں کھڑا محسوس کرتا ہوں پھر بھی تم خوش نہیں ہوتیں اذیت دے کر بھی پریشان رہتی ہو خوش دیکھ کر بھی ہراساں ہو جاتی ہو پتہ نہیں تم کہاں کھو گئی ہو میں کہاں سے تمہیں تلاش کروں۔" وہ کرسی ایک طرف دھکیلتا تن فن کرتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

اس کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا، اس نے اپنا بیگ کپڑوں سے بھر لیا تھا، سہاگن وہ جو پیا من بھائے۔

وہ تو نہ سہاگن تھی اور نہ ہی ابھاگن تھی، اس کے ہر وقت کے شکوک نے حمزہ کے دل میں اس کے لئے رہا سہا مقام بھی ختم کر دیا تھا اب تو اس کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ بہتے پانی میں کھڑی ہو پانی اس کے قدم ہی نہیں دے رہا تھا، اب مجھے چلے جانا چاہیے، وہ میرا نہیں ہے وہ میرا نہیں رہا میں اس کو کچھ نہیں دے سکی نہ سکون نہ خوشی اور سب سے بڑھ کر نہ اولاد، اس کے اندر کوئی بول رہا تھا کوئی احتساب کر رہا تھا، وہ مجرم بنی کٹہرے میں کھڑی تھی سامان اٹھا چکی تھی رخت سفر کی تیاری تھی۔

زاد راہ میں افسوس، حسرت اضطراب تھا اور کچھ بھی نہیں، اس کے آنسو تھے کہ تھمنے میں ہی

نہیں آ رہے تھے۔

واپسی کا سفر اعصاب شکن تھا ابھی سے حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔ اس کے قدم افشاں کے فلیٹ کے سامنے خود بخود رک گئے۔

وہ آخری بار اس کے گل گوتھنے بچے سے ملنا چاہتی تھی، اس کا آخری لمس اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی، اس نے اس کے فلیٹ کے قریب جا کر اپنا بیگ رکھ دیا فلیٹ کا دروازہ کھلا تھا، ادھ کھلے دروازے سے اس کو ڈرائنگ روم کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

حمزہ بیٹھا تھا اس کی گود میں ننھا علی ہمک رہا تھا، آہ آج یقیناً قیامت کا دن تھا اس کے لئے قیامت کا دن تھا، اس کے سارے ابہام حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے تھے، اس کا دل پسلیوں سے باہر نکلنے کے بے تاب تھا۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح نیچے بیٹھ گئی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا، دھندلائی ہوئی آنکھوں . سے اس نے حمزہ کو اپنے قریب آتے دیکھا تھا۔

جب اس کو ہوش آیا تو حمزہ اس سے قریب بیڈ پر بیٹھا تھا۔

"کاش میں مر جاتی، آہ مرنا بھی آسان نہیں۔" آنسو تھے کہ آنکھوں کی باڑیں توڑ توڑ کر باہر امڈ رہے تھے حمزہ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا، اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

سہاگ لٹ چکا تھا، گود ہری نہ ہوئی تھی ایک عورت کی المیہ و دکھ بھری داستان اس سے زیادہ سفاک اور عبرتناک نہیں ہوئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

"اپنی زندگی میں اپنے حصے کے غم سمیٹے تمہیں تمہاری خوشیوں کے حوالے کر کے، جا رہی ہوں میرا ہاتھ چھوڑو تم آزاد ہو اپنی ہر خوشی کے لئے۔" اس نے اعلیٰ ظرفی کی انتہا کر دی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو، میں افشاں بھابھی کے پاس کیوں جاتا ہوں؟" اس نے آئی برو اچکا کر پوچھا۔

"میں اتنے دنوں سے شش و پنج میں مبتلا تھا آخر آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔"

"یہ فیصلہ ہماری زندگی میں بہاریں لے کر آئے گا تم دیکھنا۔" وہ بول رہا تھا، وہ تاسف سے اس کو دیکھ رہی تھی آنکھوں سے خواب نوچ کر وہ نئے خوابوں کی تلاش میں نکلا تھا۔

مرد دنیا کی سب سے سفاک قوم ہے بے حس جو عورت پر حکمرانی کرتی ہے اس کو محکوم بناتی

ہے اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرتی ہے اور پھر بھی اس کو تسکین نہیں ملتی اس کی ظلم و زیادتی کی کوئی انتہا نہیں، اس کی جفا کی کوئی انتہا نہیں۔

وہ اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ چکی تھی اور پھر بھی وہ دیدہ دلیری سے جھوٹ بول رہا تھا، کسی نتیجے پر پہنچنے کی بات کر رہا تھا۔

اب ہم خوش رہیں گے ہماری زندگی میں روشنی آ جائے گی، وہ چہک رہا تھا اور الوینہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی، وہ اس کو تاریکیوں میں دھکیل کر کس روشنی کی بات کر رہا تھا؟ وہ حواس باختہ ہو چکی تھی اس کا جسم خزاں رسیدہ سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

باہر بیل ہو رہی تھی اور وہ والہانہ نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا پہلی بار اس کا استحقاق بھرا ہر ہر انداز تکلیف کے علاوہ اور کچھ نہیں دے رہا تھا، وہ اس کو اپنے لمس سے نواز رہا تھا اور وہ طوعاً کرہاً اس کا وجود برداشت کر رہی تھی۔

"ہماری زندگی آواز دے رہی ہے؟" اس کی سرگوشی اس کا لہو مزید پر اشتعال کر رہی تھی کھولن تھی کہ کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ان کا استقبال کرنے کو بے تاب تھا، اس کو چھوڑ کر وہ باہر کی جانب لپکا تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے پیر پکڑ کے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ لے وہ مانگ بھی لیتی لیکن معاف کرنے والا کمرے سے جا چکا تھا۔

وہ کسی بچے کی طرح دھاڑے مار مار کر رونے لگی تھی کمرے میں کچھ نفوس داخل ہو چکے تھے اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا، پھر سر اٹھایا، آنسوؤں کی دھند میں اپنی چیخوں کی آواز میں وہ کچھ نہیں سننا چاہتی تھی، کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اس کی چیخیں تھمی تو ایسا لگا جیسے اس کے ساتھ اس کے غم میں کوئی اور بھی شریک ہو، اس نے آنسو پونچھے اپنے قریب نظر دوڑائی، ایک گل گوتھنا اس کے قریب لیٹا رو رہا تھا اور اس کے قریب حمزہ تھا، باقی سب چلے گئے تھے، اس نے غور سے دیکھا وہ افشاں کا بچہ نہیں تھا اس نے پھر غور سے دیکھا وہ واقعی اس کا بچہ نہیں تھا حمزہ مسکرا کر اس کے پاس آ بیٹھا۔

"یہ ہمارا بچہ ہے؟"

"ہمارا صرف ہمارا۔" حمزہ نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھا، اس نے بے یقینی سے حمزہ کی جانب دیکھا۔

"میری جان مجھے تم سے عشق ہے میں جانتا ہوں تمہارے ابہام کو تمہاری ہر الجھن کو تمہارے ہر شک کو اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم بچہ اڈاپٹ کر لیں، میں افشاں بھابھی سے اسی کی بات کرنے گیا تھا، ان کے توسط سے یتیم خانے سے اس کو لیا ہے لیکن یہ یتیم نہیں ہے۔"

"اس کا نام ہم خود رکھیں گے۔"

"یہ ہمارا بیٹا ہے؟" الوینہ نے بچے کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل یہ ہمارا ہے۔" حمزہ نے بچہ اس کی گود میں ڈال دیا اور اس کو لگا کہ کل کائنات کی خوشیاں ایکدم سے اس کی جھولی میں آ گئی ہوں۔

"اب مجھے نہ بھول جانا۔" حمزہ نے سرگوشی کی اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ حمزہ کو کیسے بھول سکتی تھی اس نے تو اس کو اس کی ذات کا مان لوٹایا تھا، بچے کی قلقاریوں کے ساتھ وہ دونوں بھی ہنس دیئے غم کے بادل ایکدم سے الوینہ کی زندگی سے چھٹ گئے تھے۔

☆☆☆

معجزہ ہی تو ہے
نوشین اقبال

جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کی زندگی بے مقصد ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں رہا، جب ہر طرف سے آپ کو ناکامی کی امید ہو یہ پہلے سے معلوم ہو جائے کہ آپ کی زندگی میں آگے کچھ نہیں کر سکیں گے، بلکہ آگے تو دور کی بات ہے آپ ابھی سے زندگی کو مکمل طور پر بسر نہیں کر رہے، الٹا زندگی آپ کو بسر کر رہی ہے، زندگی بہت آگے نکل گئی ہے اور آپ بہت پیچھے رہ گئے ہیں اتنے پیچھے کہ آپ لپک کر زندگی کا ہاتھ تھامنا چاہیں تو تھام نہ سکیں، دوڑ کر اس کے برابر پہنچنے کی کوشش کریں تو منہ کے بل گریں تو پھر کیا کرنا چاہیے؟

وہ آج پھر زندگی پر تلخ ہو جانے کی حد تک بول رہی تھی، اس کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ہی سچ ہے مگر اس کے مقابل بھی راحم حیات تھا، جس نے ہار ماننا تو سیکھا ہی نہیں تھا (حالانکہ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اسے کنوینس کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ابھی تک ناکام رہا تھا مگر پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ شفق کو علاج کے لئے باہر جانے کے لئے راضی کر لے گا)

تبھی وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا پھر طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

”شفق حیات! تم زندگی کو ہمیشہ نیگیٹو ہی کیوں لیتی ہو؟ کبھی اس کے پوزیٹو بھی سوچ لیا کرو، تصویر کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں مگر تم ہمیشہ اس کا الٹا رخ دیکھتی ہو تبھی تم کو زندگی سے اتنی چڑ ہے، اتنی بے زار رہتی ہو تم زندگی سے۔“ وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بول رہا تھا۔

”مگر......“ شفق حیات ابھی شاید اس کی بات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”آپ نے ابھی زندگی کو قریب سے نہیں دیکھا ناں، اس لئے یہ ساری باتیں کر رہے ہیں، آپ پر تو زندگی صدا سے مہربان رہی ہے ناں تبھی ہمیشہ اس کی فیور میں بولتے ہیں کبھی مجبوری اور بے بسی سے آپ کا واسطہ نہیں پڑا راحم حیات اسی لئے زندگی پہ اتنا بولتے ہیں ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتے ہیں۔“ وہ بولتے بولتے تھک گئی تو صوفے پر ڈھنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی اس کی آواز بھرا سی گئی تھی اور راحم حیات بھلا کب اس کو دکھی دیکھ سکتا تھا وہ تو اس کی خوشیوں کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا، مگر وہ تھی کہ مان کر نہ دیتی تھی، سو اب بھی اس کو شکستہ سا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی جانب آیا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اب وہ نرمی سے بول رہا تھا۔

”دیکھو شفق! کیوں اتنا پریشان ہوتی ہو؟ خود کو اتنا ڈس ہارٹ کرتی ہو، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ جو اوپر بیٹھا ہے وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، وہ کسی پہ اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا دکھ نہیں دیتا، تم کیوں یہ بھول جاتی ہو؟ دیکھنا تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ دھیرے دھیرے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بس خاموشی سے اسے سنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، خود کو بے حد مخلص اور محبت کرنے والے رشتوں کے درمیان پایا تھا، وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس کے پاپا یعنی عمر حیات ایک بزنس مین تھے اور اپنے بڑے بھائی توثیق حیات کے ساتھ مل کر بزنس کرتے تھے، توثیق حیات کے دو بچے تھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ امریکہ شفٹ تھی، اس کے بعد بیٹا تھا راحم حیات جو کہ تعلیم مکمل

کرنے کے بعد اب بزنس میں اپنے پاپا کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

راحم حیات، شفق حیات سے تین سال بڑا تھا، شفق حیات اکلوتی ہونے کی وجہ سے بے حد لاڈلی تھی، ایم اے کر رہی تھی، صورت کے ساتھ ساتھ خدا نے اسے سیرت بھی عطا کی تھی، امیر ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود غرور اور گھمنڈ جیسی کوئی چیز اس میں نام کو نہیں تھی۔

وہ چہکتی مینا کی طرح سارے گھر میں پھرا کرتی تھی، دکھ، غم سے بے پروا چہرا، خوشیوں سے مہکتا آنگن جس میں وہ ایک پھول کی طرح رہتی تھی، وہ زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھی۔ یوں ہی خوشیوں اور محبتوں کے ہنڈولوں میں جھولتے جھولتے نجانے کب وقت نے کوئی چال چلی تھی۔

اس دن وہ یونیورسٹی سے گھر آئی تو اس کے پیٹ میں بہت سخت درد اٹھا تھا، درد اتنا شدید تھا کہ ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود بھی اس کی چیخ ہی نکل گئی، اس نے ماما کو پکارہ تو ماما اس کی آوز سن کر گھبرا گئی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کے کمرے تک آ گئی تھیں۔

"کیا ہوا شفق بیٹا؟" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھیں، شدت درد سے اب اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے اور وہ رو رہی تھی، اس نے روتے ہوئے ماما کو درد کے بارے میں بتایا وہ پریشان ہی ہو گئیں تھیں کہ اچانک یہ کیسا درد اٹھا تھا؟ وہ جلدی سے پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر کو فون کرنے لگیں، مگر اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوب چکا تھا، رات کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے سب کو اپنے کمرے میں اپنے بیڈ کے اردگرد جمع دیکھا، تو شفیق انکل، آنٹی ماما پپا سب اس کے پاس تھے، عمر حیات نے جو شفق کو آنکھ کھولتے دیکھا تو جلدی سے اس کے پاس آئے۔

"اب کیا حال ہے بیٹا؟" پاپا اس کی پیشانی کو چھوتے ہوئے پوچھ رہے تھے، ماما بھی اس کے قریب آ گئیں تھیں، انکل اور آنٹی بھی پریشان سے تھے، وہ سب اس سے بہت محبت کرتے تھے یہ وہ جانتی تھی۔

"ٹھیک ہوں پاپا اب۔" اس نے ہلکی سی آواز میں بتایا۔

"بیٹا کیا ہو گیا تھا آپ کو؟" اب انکل پوچھ رہے تھے۔

"پتہ نہیں انکل مجھے کیا ہوا تھا بس اچانک ہی پیٹ میں سخت درد اٹھا تھا۔"

"کیا پہلے بھی ایسا درد ہوا تھا کبھی۔" آنٹی محبت سے اس کے سر میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں آنٹی اتنا شدید تو نہیں ہاں کبھی کبھی ہلکا ہلکا درد ہوتا تھا مگر میں نے کبھی اتنا محسوس نہیں کیا۔"

"بیٹا آپ کو کم از کم ہمیں بتانا تو چاہیے تھا ناں۔" اب ماما بولیں تھیں۔

"ماما ہلکا سا درد ہوتا تھا اور خود ہی ختم ہو جاتا تھا، میں نے کبھی سیریس نہیں لیا تھا۔" اس نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں تمہارے لئے دودھ لاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں لے آئیں اور ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی لیتی آیئے گا۔" پاپا نے پیچھے سے کہا تھا اور ماما سر ہلاتے ہوئے چلی گئی تھیں۔

"اچھا بیٹا اب تو خدا کا شکر ہے کہ آپ ٹھیک ہو اب ہم چلتے ہیں راحم بھی ابھی گھر میں نہیں آیا تھا، جب ہم آئے تھے اس لئے وہ پریشان ہو رہا ہو گا، ہم اسے جا کر بتاتے ہیں۔"

آنٹی نے محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''اچھا بیٹا خدا حافظ۔'' انکل نے بھی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

''او کے عمر اب ہمیں چلنا چاہیے صبح اگر شفق کی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو تم آفس نہ آنا میں اور راحم سنبھال لیں گے، اب چلتے ہیں خدا حافظ۔'' انکل، آنٹی چلے گئے تو وہ پاپا کو دیکھنے لگی جو بہت فکر مند سے لگ رہے تھے۔

''پاپا اب آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ پاپا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''جی پاپا کی جان مجھے پتہ ہے آپ ٹھیک ہو مگر آپ کو کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروانے ہیں ڈاکٹر نے کہا ہے۔'' پاپا نے محبت سے اس سے کہا تھا۔

''جی پاپا ٹھیک ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

اتنے میں ماما دودھ کا گلاس اور ساتھ سینڈوچز وغیرہ لئے آئیں۔ پھر اس نے پاپا کے اسرار پر تھوڑا سا کھایا اور اس کے بعد کافی دیر تک ماما، پاپا اور وہ باتوں میں مشغول رہے تھے۔

انسان نہیں جانتے کہ آنے والا وقت سب اچھا ہے کا پیغام دیتا ہے یا کوئی بری خبر ہماری منتظر ہو گی۔ ہاں بس خود کو تسلی دینے کے لئے یہ امید رکھتے ہیں کہ سب اچھا ہو جائے گا، مگر کبھی کبھی امید کے برعکس بھی ہو جاتا ہے کہ یہ زندگی ہے اور زندگی میں دکھ اور سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں، یہ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور یوں بھی کچھ غم کچھ تکالیف ہماری تقدیر میں لکھی ہوتی ہیں جنہیں بہتر طور پر جینا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے جو خبر انہیں سنائی تھی وہ تو گویا کوئی بم تھا جو اچانک بلاسٹ ہوا تھا، اس کی رپورٹس آ گئی تھیں اور ڈاکٹر نے اسے کینسر بتایا تھا، ماما، پاپا کے پاؤں تلے سے تو گویا زمین ہی نکل گئی تھی، وہ ابھی تک بے یقینی کی سی کیفیت میں تھے۔

''پلیز ڈاکٹر آپ ایک دفعہ پھر رپورٹس دیکھیں، کہہ دیں یہ جھوٹ ہے ہماری بیٹی کو کچھ نہیں ہوا کوئی بیماری نہیں ہے اسے پلیز پلیز ڈاکٹر صاحب۔'' ماما جذباتی ہو رہی تھیں۔

''دیکھیں مسز عمر، ہم نے اچھی طرح چیک کر کے ہی آپ کو بتایا ہے۔'' ڈاکٹر نے انہیں سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

''مگر ڈاکٹر صاحب اس کا کوئی علاج تو ہو گا؟'' اب کے پاپا بولے تھے۔

''جی سرجری ہے کرنی پڑے گی مگر پاکستان میں نہیں لندن جانا پڑے گا آپ لوگ دعا کریں، دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا تھا اور ماما، پاپا ڈاکٹر کی بات سن کر وہاں سے گھر آ گئے تھے اور راحم حیات کو یہ خبر ملی تو کتنے ہی لمحے وہ ساکت سا ہو کر رہ گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ زندگی کے شوخ رنگوں جیسی لڑکی اسے بھلا یہ خطرناک مرض کس طرح ہو سکتا ہے؟'' وہ شاکنگ کیفیت میں تھا ابھی تک، وہ کتنے ہی لمحے اسی کیفیت میں سوچتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ شفق کے گھر آیا تھا۔

''دیکھیں انکل، آنٹی شفق کو یہ نہ بتایئے گا کہ اسے کینسر ہے، ورنہ تو وہ سوچ سوچ کر ہی پریشان ہوتی رہے گی۔'' وہ اسی لئے انکل آنٹی کے پاس آیا تھا کہ تفصیل سے ساری بات کر سکے۔

''مگر بیٹا یہ بات کس طرح اس سے چھپی رہ سکتی ہے؟ آخر اسے لندن بھی جانا ہے آپریشن

کے لئے۔" پاپا نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے مگر اسے یہ کس طرح بتائیں کہ......؟" ابھی وہ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے کہ شفق کمرے میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم!" وہ خوش دلی سے مسکرائی اور سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹا بیٹھو۔" پاپا نے اسے اپنے پاس صوفے پہ بیٹھنے کو کہا۔

"اوہ آج تو راحم بھائی بھی آئے ہوئے ہیں۔"

"کیسے ہیں راحم بھائی آپ؟" اس کی نظر ابھی ابھی راحم پر پڑی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور تم کیسی ہو؟"

"میں بھی اچھی ہوں دو دن پہلے درد ہوا تھا مگر آج تو ٹھیک ہوں پر ماما، پاپا ابھی تک پریشان ہیں، آپ ہی سمجھائیے ناں انہیں راحم بھائی کہ اب تو یہ پریشان نہ ہوں۔" وہ راحم سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں بھئی تم تو اچھی خاصی نظر آ رہی ہو؟" وہ بظاہر ہشاش بشاش سے لہجے میں کہہ رہا تھا، وہ بھی مسکرا رہی تھی، یوں فی الحال یہ موضوع ختم ہو گیا تھا۔

مگر آخر کب تک رات اسے پھر شدید درد اٹھا تھا اور وہ شدت درد سے بلبلا اٹھی تھی، ماما پاپا اٹھ گئے تھے اور ماما نے جلدی سے اسے درد کی ٹیبلٹ دی تھی جو کہ ڈاکٹر نے اس صورت حال میں کھانے کو دی، اس نے پانی کے ساتھ ٹیبلٹ کھائی تو کچھ آرام آ گیا اب وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور ماما پاپا اس کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

"پاپا آخر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ مجھے کیا مسئلہ ہے؟" وہ پاپا سے پوچھ رہی تھی۔

"شفق بیٹا! آپ بالکل ٹھیک ہو۔" پاپا نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا اور ماما چپکے سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرنے لگیں۔

"تو پھر یہ درد کیوں ہوتا ہے پاپا؟ آپ بتائیں ناں ماما آخر ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟ اب تو میری رپورٹس بھی آ گئی ہیں۔" وہ اب ماما سے مخاطب تھی۔

"جانی آپ کو کچھ نہیں ہوا کوئی بیماری نہیں ہے۔" ماما نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اور آپ کی رپورٹس بھی بالکل ٹھیک ہیں، یہ درد ان دوائیوں سے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر کب ماما؟ میں ٹیبلٹ کھا کھا کر تنگ آ چکی ہیں اور جب یہ درد ہوتا ہے تو مجھے لگتا ہے میں مر جاؤں گی۔" اس نے نڈھال سے لہجے میں کہا۔

"اللہ نہ کرے بیٹا آپ کیسی باتیں کر رہے ہو۔" ماما پاپا دہل کر رہ گئے تھے اس کی بات سن کر۔

"آئندہ یہ بات منہ سے کبھی مت نکالنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔" پاپا نے پیار بھری دھمکی دی تھی اور وہ پیا کی کوئی بات رد کر دے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا سو وہ مسکرا کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالے کہہ رہی تھی۔

"میں تو مذاق کر رہی تھی پاپا۔"

"مگر آئندہ مذاق میں بھی یہ بات کبھی مت کہنا بیٹا۔"

"او کے پاپا جیسے آپ کا حکم۔" وہ پیار سے پیا سے مخاطب تھی اور پھر وہ بہت دیر تک ماما پاپا سے باتیں کرتی رہی تھی۔

اس دن اسے پتہ چلا کہ ماما پاپا اس سے کتنی بڑی بات چھپا رہے تھے، وہ سو کر اٹھی تو نیچے جانے کے ارادے سے باہر نکل آئی وہ ابھی

لاؤنج میں قدم رکھنے ہی والی تھی کہ اپنا نام سن کر رک گئی ماما پاپا اس کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے، ماما شاید رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ہم شفق سے کیسے یہ بات کریں گے کہ اسے کیسے بتائیں گے کہ اسے کینسر ہے یہ لفظ سنتے ہی اس کے قدموں سے گویا زمین نکل گئی تھی، وہ ساکت رہ گئی تھی، وہ بامشکل خود کو سنبھالتی اپنے کمرے تک آئی تھی اور اگلے دن وہ ماما پپا سے بڑی بہادری سے کہہ رہی تھی۔

''آپ نے مجھے اتنی سی بات نہیں بتائی؟''

ماما نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

''جانی آپ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے (انشا اللہ)۔''

''ہاں بیٹا ڈاکٹرز بہت پرامید ہیں بس آپ کو لندن جانا پڑے گا آپریشن ہو گا اور ہمارا شفق بیٹا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' پاپا بھی اس کو بتا رہے تھے۔

''جی پپا مجھے یقین ہے آپ سب کی دعاؤں سے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''بالکل بیٹا انشا اللہ۔'' پاپا نے اسے پیار سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا تھا اور اس نے ضبط سے بہت آنسو اپنے اندر اتار لئے تھے۔

اور یہ وہی جانتی تھی کہ بظاہر ہنستی مسکراتی یہ لڑکی اندر سے کتنی دکھی تھی، ماما پاپا انکل آنٹی اور سب کے سامنے جو خوش رہنے کا اور جتنی بہادری کا وہ مظاہرہ کرتی تھی حقیقت میں وہ اتنی بہادر تھی نہیں، وہ خدا کے سامنے کتنا روئی تھی، اس دن جب وہ ماما پاپا کی باتیں سن کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی، کتنے ہی لمحے وہ خالی ذہن کے ساتھ بیٹھی رہی تھی، بہت دیر تک رونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ماما پاپا کے سامنے کبھی نہیں روئے گی۔

☆☆☆

راحم حیات کو اپنی یہ بھولی بھالی معصوم سی کزن شروع سے ہی اچھی لگتی تھی نہ جانے کب وہ اس کے دل میں بہت خاص مقام بنا گئی تھی۔

اب راحم حیات کے لئے یہ خبر کسی شاک سے کم نہ تھی۔

ابھی تو اس نے اپنے ان کہے جذبوں کا اظہار بھی نہیں کیا تھا اسے یہ تک نہیں بتایا تھا وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے اور یہ کہ شفق حیات اسے کتنی عزیز ہے ابھی اس نے تو بس ماما پپا سے بات کی تھی کہ وہ رشتہ لے کر جائیں اور ماما پپا یہ بات سن کر کھل اٹھے تھے ان کا اپنا ارادہ بھی یہی تھا، کہ ان کے چھوٹے بھائی عمر حیات کی اکلوتی خوبصورت بیٹی اور ان کی لاڈلی بھتیجی ان کی بہو بنے اور اب اتنی بری خبر نے ان کو دہلا کے رکھ دیا تھا، وہ پریشان ہو گئے تھے اور راحم حیات سوچ رہا تھا کہ وہ دل کی باتیں دل میں رہیں گی؟ کیا ان کہے جذبوں کو اظہار کی مہلت نہیں ملے گی؟ اس نے تو ابھی اپنے اس خالص اور سچے جذبے کی شفق کو ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔

وہ تو کسی خوبصورت موقع کی تلاش میں تھا اور یہ اچانک ایک دم سے کیا ہو گیا تھا، اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا، انکل آنٹی ماما پاپا کو دلاسے تسلیاں دیتے دیتے وہ اندر سے خود بہت کمزور ہو گیا تھا، ڈھے سا گیا تھا۔

''راحم بھائی آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟ آپ تو مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے پھر مجھے اس بیماری کے بارے میں کیوں نہیں بتایا آپ نے؟'' وہ آج راحم حیات سے پوچھ رہی تھی اور وضاحت دیتا ہوا بولا کہ محض اس لئے کہ تم دکھی نہ ہو پریشان نہ ہو۔

''آپ نے سمجھا ہوگا شاید میں اتنا بڑا غم سہہ نہیں پاؤں گی، جی نہیں مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں اپنی بیماری کے بارے میں سن سکوں کہ مجھے کیا بیماری ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''او کے شفق سوری ہمیں بتا دینا چاہیے تھا تمہیں میں مانتا ہوں اپنی غلطی مگر اب مسئلہ تو یہ ہے کہ تم مان جاؤ لندن جانے کے لئے، دیکھو ماما پپا انکل آنٹی بہت پریشان ہیں تمہاری وجہ سے تم لندن آپریشن کے لئے چلی چلو پلیز۔'' وہ اب اپنے اصل موضوع کی طرف آرہا تھا۔

(کیونکہ انکل آنٹی نے اسے لندن جانے کے لئے راضی کرنے کی ذمہ داری اسے سونپی تھی سو وہ اس وقت اسے کنوینس کر رہا تھا۔)

''نہیں راحم بھائی میں لندن نہیں جاؤں گی، جب میری قسمت میں ہی یہ لکھا ہے تو یوں ہی سہی، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

''مگر شفق ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ یہاں رہ کر علاج نہیں ہو سکتا اور پھر قسمت کا لکھا ہمیں خود بدلنا پڑتا ہے۔'' وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''پلیز راحم بھائی آپ مجھے مجبور مت کریں میں نہیں جاؤں گی۔'' اب کے اس نے سخت انداز میں کہا تھا اور راحم حیات نجانے کیوں چپ رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''بیٹا آپ راضی کرو کسی بھی طریقے سے کیونکہ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں چانسز کم ہوتے جا رہے ہیں۔'' اس وقت ماما پپا انکل آنٹی اور راحم حیات لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اور انکل نے راحم کو کہا تھا۔

''انکل میں پوری کوشش کر رہا ہوں مگر وہ مانتی ہی نہیں عجیب ضد ہو گئی ہے اسے لندن جانے سے۔'' اس نے بے بس سے لہجے میں کہا۔

''مگر راحم بیٹا ایسا کب تک چلے گا اسے اب بھی درد ہوتا ہے اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔'' ماما نے بتایا تھا، ان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''بھابھی آپ پریشان نہ ہوں راحم بیٹا آپ پھر ایک دفعہ اسے راضی کرنے کی کوشش کرو اسے سمجھاؤ کہ اس کا جانا بہت ضروری ہے۔'' توشیق حیات نے رافعہ بیگم کو تسلی دینے کے ساتھ ہی راحم کو بھی کہا تھا۔

''ٹھیک ہے پاپا میں دوبارہ کوشش کرتا ہوں اور انکل آنٹی آپ پلیز پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' راحم حیات نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''شفق حیات آخر تم مان کیوں نہیں جاتیں؟'' آج راحم حیات پھر اس کے مقابل تھا، اسے راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''راحم بھائی آپ نے مجھ سے یہ بات اس لئے چھپائی تھی ناں کہ میں دکھی ہوں گی پریشان ہوں گی؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا، راحم نے سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

''آپ نے مجھے اتنا کمزور کیوں سمجھ لیا تھا کہ میں اتنی سی بات کو دل پہ لے لوں گی۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس وقت راحم سے کہہ رہی تھی۔

''اتنی سی بات؟ شفق حیات تم اسے اتنی سی بات کہہ رہی ہو کینسر کو تم عام سی بیماری سمجھتی ہو؟ یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے اور تم جو میرے سامنے سب کے سامنے اتنا بہادر نظر آنے کی کوشش کرتی ہو ناں، تو میں جانتا ہوں کہ تم اتنی

بہادر ہو نہیں جتنا خود کو پوز کرتی ہو، تم سب کو اپنی اس ظاہری بہادری اور ہنستے مسکراتے چہرے سے دھوکا دے سکتی ہو مگر راحم حیات کو نہیں، شفق میں جانتا ہوں تم اس وقت اندر سے کتنا ٹوٹ چکی ہو مگر دیکھو مجھے پورا یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی بس تم لندن چلی چلو آپریشن کروانے کے لئے پلیز دیکھو سب تمہارے لئے بہت پریشان ہیں۔" وہ حتی الامکان اسے راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ مان کر نہ دے رہی تھی۔

"نہیں راحم بھائی نہیں اگر میں نے ٹھیک ہونا ہوا تو یہاں بھی ہو جاؤں گی اور اگر میں نے اس بیماری کی وجہ سے ہی مرنا ہے تو پھر کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر موت ہی میرا مقدر ہے تو وہ لندن میں بھی آ جائے گی اور یہاں بھی تو کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہے کہ میں اپنی مٹی میں اپنے لوگوں کے درمیان مروں۔" وہ بظاہر مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑی بہادری سے کہہ رہی تھی اور اس لمحے یہ نازک سی لڑکی واقعی راحم حیات کو بڑی مضبوط اور بہادر لگی تھی، مگر وہ اس کی آنکھوں میں پھیلی نمی کو دیکھ چکا تھا، تبھی رسان سے اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"شفق! کیا تم نہیں چاہتیں کہ تم زندگی کے ہر لمحے سے خوشیاں کشید کرو، کیا تم نہیں چاہتیں کہ انکل آنٹی خوشیوں بھری زندگی گزاریں اور ان کی ہر خوشی تم سے وابستہ ہے شفق حیات تم سے، تم نہیں جانتیں کہ تمہاری زندگی کتنے لوگوں کے لئے اہم ہے، کتنے لوگ ہیں جو تمہیں صحت یاب مکمل اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں تم سے کتنی محبت کرتے ہیں، آنٹی انکل ماما پپا اور......" وہ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"اور کون راحم بھائی؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اور شفق میں راحم حیات تمہیں خوش صحت یاب اور مکمل دیکھنا چاہتا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں شفق۔" وہ جو کسی خوبصورت موقع کی تلاش میں تھا اب اچانک اظہار کر گیا تھا اور شفق حیات تو حیرت سے گنگ رہ گئی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ اس لمحے خود پہ نازاں ہوتی کہ یہ تو اس کی بھی دلی خواہش تھی کہ راحم حیات اس کا ہو جائے وہ بھی تو شروع سے ہی اس کی تمنائی تھی دل پتہ نہیں کب سے اس کے نام پہ بے ساختہ دھڑک اٹھتا تھا، وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ شعور کی منزل پہ قدم رکھتے ہی دل نے جس کے نام کی، جس کی ذات کی خواہش کی تھی وہ راحم حیات تھے مگر اس نے آج تک راحم حیات سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا، کہ وہ محبت کے معاملے میں بڑی انا پرست واقع ہوئی تھی، خود اپنے منہ سے اقرار محبت کرنا اور محبت کی بھیک مانگنا کہاں گوارہ تھا اسے اور یوں بھی اسے ڈر تھا کہ راحم حیات جو کہ کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا بہت اچھا دوست بھی ہے، تو وہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں، کہیں اس کے جذبوں کا مذاق نہ اڑائیں وہ اپنے جذبوں کا مذاق نہیں بنانا چاہتی تھی، اپنی ذات پہ اپنے نام پہ حرف نہیں آنے دینا چاہتی تھی تو اب تک خاموش تھی اور اسے امید نہیں تھی راحم حیات بھی اس سے محبت کرتا ہے اس کی محبت یکطرفہ نہیں ہے، وہ یقیناً خوش ہوتی اگر......؟ حالات کچھ اور ہوتے مگر اس وقت حالات مختلف تھے وہ دکھی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی تھی اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی؟

"راحم حیات! کیا آپ نہیں جانتے کہ مجھے کیا بیماری ہے؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ یہ کہہ رہے ہیں؟ زندگی پتہ نہیں میرا ساتھ دیتی بھی ہے یا نہیں؟ میں تو خود اس دیے کی مانند

ہوں جو تند و تیز ہوا کے سامنے رکھا ہوتا ہے، نہ معلوم کون سا ہوا کا جھونکا اس دیے کو بجھا دے، میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گی راحم حیات، پتہ ہے ناں آپ کو کہ میری زندگی کے چانسز کتنے کم رہ گئے ہیں؟ اس کے باوجود آپ مجھے اپنی محبت کا احساس دلا کر اور دکھی کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ راحم حیات کے سامنے کھڑی ان سے پوچھ رہی تھی وہ راحم حیات کو لوٹنے کا کہہ رہی تھی کہ جائیں اپنی روشن راہوں کی طرف جہاں خوشیاں، روشنیاں آپ کا مقدر ہیں، راحم حیات نے غور سے اس کی ساری باتیں سنی، پھر دھیرے دھیرے سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا پھر اگلے لمحے اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہا تھا۔

میں نے مانا کہ یہ تقدیر کا لکھا ہے اٹل
میرا ایمان کہ دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
تم کو مانگوں گا میں جنون کی حد تک
عشق جب حد سے گزرتا ہے امر ہوتا ہے

"کیوں مایوس ہوتی ہو شفق، ناامیدی کو کیوں دل میں جگہ دیتی ہو؟ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی دعاؤں میں واقعی بڑا اثر ہوتا ہے، یہ تقدیریں بدل دیا کرتی ہیں اور تم کہتی ہو کہ میں لوٹ جاؤں اپنی راہوں کی طرف تو شفق میری روشن راہیں، میرے سارے راستے تم تک ہی تو آتے ہیں، میری منزل تم ہی تو شفق، میں جانتا ہوں کہ تمہیں کیا بیماری ہے مگر اس بیماری کا علاج جو ہے وہ تو کرنا چاہیے ہمیں چانس تو لینا چاہیے ناں، پلیز آنٹی انکل کی خاطر میری خاطر مان جاؤ شفق زندگی بہت خوبصورت ہے اور تمہارا اس زندگی پر حق ہے۔" وہ محبت کے ساتھ اسے سمجھا رہا تھا۔

"شفق کیا میری محبت پہ تمہیں یقین نہیں ہے؟ آنٹی انکل کی محبت میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ تمہیں جانے کے لئے راضی نہ کر سکیں؟ بولو شفق میری محبت پہ یقین ہے ناں۔" وہ بڑے مان سے اس کا ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا اور شفق حیات اس مان کو توڑنا نہیں چاہتی تھی، تبھی اس کے ہاتھ پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا تھا اور پتہ نہیں اس لمحے اسے کیا ہوا تھا وہ راحم حیات کے ہاتھوں پہ اپنا ماتھا ٹکا کر رونے لگی تھی، راحم حیات نے اسے رونے دیا تھا تاکہ اس کے دل کا غبار دھل جائے، جب وہ رو چکی تو بولی۔

"راحم بھائی مجھے لگتا ہے میں زیادہ دیر جی نہیں سکوں گی آپ مجھے کہتے ہیں کہ میں لندن چلی چلوں مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں لندن چلی گئی تو پھر کبھی واپس نہیں آ سکوں گی۔" اس کی آواز رونے کے سبب بھاری ہو گئی تھی۔

"شفق تم کیوں اس طرح سوچتی ہو تمہیں کچھ بھی نہیں ہو گا، تم دیکھنا تم آپریشن کروا کے وہاں سے کامیاب اور صحت مند ہو کر لوٹو گی انشا اللہ۔" وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مگر آپ جانتے ہیں ناں کہ چانسز کتنے کم ہیں راحم بھائی۔"

"ہاں جانتا ہوں مگر مجھے خدا پر اور اپنی محبت پر یقین ہے اور ایک بات اور کہ اب تم مجھے راحم بھائی نہیں کہو گی او کے۔" راحم حیات نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

بالآخر راحم حیات نے اسے لندن جانے کے لئے راضی کر لیا تھا ماما اور پپا بھی اور راحم بھی اس کے ساتھ جا رہے تھے، پھر آپریشن تھیٹر جانے سے پہلے وہ ماما پپا سے ملنے کے بعد راحم حیات کے سامنے اس وقت بیٹھی ہوئی تھی۔

"راحم اگر زندگی نے میرا ساتھ نہ دیا تو؟"

وہ خوف زدہ تھی (اور راحم کی خواہش پہ ہی اب وہ اسے بھائی نہیں کہتی تھی بلکہ صرف راحم کہنے لگی تھی)۔

"ضرور دے گی شفق میں خدا سے تمہارے لئے زندگی مانگوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"راحم اگر میں زندہ نہ رہی تو ماما پاپا کو حوصلہ دیجئے گا اور پتہ نہیں کیوں راحم اب میں زندہ رہنا چاہتی ہوں مگر مجھے لگتا ہے میں ایسا کر نہیں پاؤں گی، مجھے لگتا ہے موت مجھ کو ماما پاپا اور آپ سے چھین لے گی۔" یہ بات کہتے ہوئے دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پہ آ گئے تھے۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا شفق خدا پہ بھروسہ رکھو وہ بہت بہتر کرے گا مجھے یقین ہے ہم سب کی محبت اور دعاؤں کی طاقت ضرور رنگ لائے گی تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔" راحم حیات نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے تھے اور اس کو حوصلہ دیا تھا اور وہ نم سی ہنسی ہنس دی تھی۔

☆☆☆

اس وقت وہ آپریشن تھیٹر میں تھی اور آپریشن جاری تھا، پپا مسجد میں چلے گئے تھے، راحم حیات بھی اس وقت خدا کے سامنے سجدہ ریز تھا اور اس کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔

"یا اللہ اسے زندگی دے دے وہ پھولوں جیسی نازک لڑکی یا اللہ اسے زندگی عطا کر دے وہ تو زندہ رہنا چاہتی ہے زندگی جینا چاہتی ہے یا اللہ تو روف الرحیم ہے، رحم کر میرے مولا شفق حیات کو زندگی دے دے۔" وہ کب سے ایک ہی دعا مانگے جا رہا تھا ایک ہی لفظ کی تکرار کیے جا رہا تھا اور ادھر ماما جائے نماز پہ بیٹھی اپنی بیٹی کی زندگی کی دعا رو رو کر مانگ رہی تھی۔

"اے میرے پروردگار! اپنے پیارے محبوبؐ کے صدقے کوئی معجزہ ہی کر دے، دعائیں تو تقدیر بدل دیا کرتی ہیں شفق کی بھی تقدیر بدل دے اسے زندگی دے دے میری مالک۔" وہ ساری رات جاگ کر دعائیں مانگتی رہی تھیں۔

اور خدا تو واقعی روف الرحیم ہے وہ بھلا کب خالی ہاتھ لوٹاتا ہے کسی کو پتہ نہیں کون سی نیکی کام آ گئی تھی اور کسی کی دعا کو قبولیت کا شرف مل گیا تھا کہ اس وقت ان کی جھولی بھی بھری ہوئی تھی، کوئی معجزہ ہی تھا جو ڈاکٹر نے اطلاع دی تھی کہ شفق کو ہوش آ گیا ہے۔

"کون کہتا ہے کہ معجزے نہیں ہوتے؟ کون کہتا ہے کہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟ معجزے ہوتے ہیں اور اسی دنیا میں ہوتے ہیں، شفق کا بچ جانا آپریشن کامیاب ہو جانا اک معجزہ ہی تو تھا، جس نے پھر سے سب کو پھولوں کی طرف لوٹا دیا تھا اور وہ زندگی جیسی لڑکی بھی زندگی کی جانب لوٹ آئی تھی۔" راحم حیات سوچ رہا تھا اور اس کا دل ایک بار پھر خدا کی محبت سے بھر گیا تھا، اس نے احساس تشکر سے اک بار پھر آسمان کی جانب دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

واپس پاکستان آ کر شفق حیات کے آپریشن کی کامیابی کی خوشی میں گھر میں بہت شاندار سی دعوت تھی، جس میں سب ہی مدعو تھے، شفق کو سب نے ہی مبارک باد دی تھی، سب کھانے سے فارغ ہو کر اب چائے پی رہے تھے وہ اپنا کپ اٹھا کر ٹیرس پہ آ گئی تھی، جہاں چاند کی روشنی میں پورا آنگن جگمگا رہا تھا، وہ مسرور سی اس منظر سے لطف اندوز ہونے لگی، اچانک آہٹ پہ چونک کر دیکھا تو راحم حیات کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"راحم پتہ ہے مجھے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا کہ میری زندگی میں اتنا بڑا حادثہ ہو کر گزر بھی

چکا ہے اور یہ کہ آپریشن واقعی کامیاب ہو گیا ہے، مجھے لگتا ہے سب ایک خواب ہے۔" وہ راحم سے مخاطب تھی۔

"اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی عظیم ہے شفق وہ ہمیں کبھی ناامید نہیں ہونے دیتا، خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا اور اس نے مجھے بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا میں نے اپنی دعاؤں میں صرف تمہیں ہی مانگا ہے شفق اور اس نے میری دعاؤں کو قبول کر لیا، ہم انسان ہی ناشکرے ہوتے ہیں ورنہ وہ تو ہمیں اتنا کچھ دیتا ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔" راحم حیات بڑے جذبے کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں راحم واقعی مجھے معجزوں پر بھی یقین ہو گیا ہے میرا ایمان اس کی ذات پہ اور پختہ و کامل ہو گیا ہے، اس نے مجھے زندگی جیسی نعمت نئے سرے سے دوبارہ دی ہے، اس کا احسان ہے مجھ پر۔" شفق حیات اس لمحے خدا کی محبت میں پوری طرح گم تھی۔

"اچھا شفق اب تو تمہاری زندگی بے مقصد نہیں رہی ناں۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں اب زندگی بے مقصد نہیں رہی، اب میں اپنی پڑھائی مکمل کروں گی اور پاپا کے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹاؤں گی یا پھر جاب کروں گی۔" وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ کر بہت خوشی سے کہہ رہی تھی اور راحم حیات اس کی سادگی پہ ہنس دیا تھا پھر سوچ کر بولا۔

"اچھا ماما پاپا آئے ہوئے ہیں آج وہ ہمارے رشتے کی بات کریں گے، بتاؤ مایوس تو نہیں کرو گی اب تو لوٹ جانے کا نہیں کہو گی ناں۔" وہ پوچھ رہا تھا اور اس لمحے اس کی آنکھوں میں بڑے خوبصورت جذبے تھے، شفق حیات نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں راحم اب میں آپ کو لوٹ جانے کا نہیں کہوں گی۔"

"میری محبت کا یقین ہے ناں۔" راحم حیات نے اک بار پھر پوچھا تھا راحم نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔

"ہاں راحم مجھے یقین ہے آپ کی محبت پر، مجھے تو اس لمحے سے یقین تھا جب آپ نے ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح میرا ساتھ دیا، میرے دکھ سکھ بانٹے مجھے جینا سکھایا، میں آپ کی بے حد مشکور ہوں راحم۔" شفق نے کہا تھا۔

"مگر دوستوں میں یہ شکریہ وغیرہ نہیں ہوتا اور یوں بھی اب تو ہم یہ دکھ سکھ زندگی بھر بانٹیں گے، ہر خوشی ہر غم کو اکٹھا منائیں گے، آنے والے تمام موسموں کو ایک ساتھ جئیں گے انشاء اللہ۔" راحم حیات نے پر یقین لہجے میں اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا، زندگی پھر سے بہت خوبصورت ہو گئی تھی، وقت ایک بار پھر ان پر مہربان تھا۔

انہوں نے خدا پہ یقین کیا تھا اس کی ذات پہ بھروسہ کیا تھا سو خدا نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا، خالی ہاتھ نہیں لوٹایا تھا، آج ان کا دامن خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں بڑھتی ہوئی آوازیں، سرسراہٹیں تھیں، اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی فلیش لائٹ آن کی، فلیش لائٹ کی روشنی سے آس پاس کا منظر روشن ہوگیا، اس نے سامنے کی طرف سے آتی آوازوں پہ روشنی ڈالی اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، گھر کے بڑے سے آنگن میں لگے اس گھنے سایہ دار درخت کی شاخیں بہت تیزی سے پھیل رہی تھیں، اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان شاخوں نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور کچھ ہی دیر میں سارے گھر کو ڈھانپ لیا تھا، وہ خوف سے چند قدم پیچھے ہٹا، کیونکہ درخت کی شاخیں تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی تھیں، اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے بھاگتا باریک شاخوں نے تیزی سے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی مگر پھر تھک ہار کر اپنا آپ وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، شاخوں نے اسے پوری طرح خود میں چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ!'' حمزہ علی تیار ہوکر ڈائننگ ٹیبل کے پاس آتے ہوئے بولا اور جھک کر ناشتہ کرتی ہوئی اپنی پانچ سالہ بیٹی عشنا کو پیار کیا۔

''گڈ مارننگ پاپا!'' اس کے دونوں بیٹوں آٹھ سالہ عارب اور دس سالہ جواد نے جواباً کہا۔

''جلدی جلدی اپنا ناشتہ ختم کرو، تم لوگوں کو سکول ڈراپ کرکے، مجھے آفس بھی جانا ہے اور پلیز حمزہ آج واپسی پہ آپ ان تینوں کو پک کرلینا، مجھے دیر ہو جائے گی۔''

نازش نے گرم گرم آملیٹ حمزہ علی کے آگے رکھتے ہوئے کہا اور خود بھی ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی، وہ بھی آفس جانے کے لئے بالکل تیار تھی، تینوں بچوں کا سکول اس کے راستے میں پڑتا تھا اس لئے انہیں پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمہ داری نازش کی ہی تھی، حمزہ علی کا آفس کافی دور تھا، مگر آج اسے مجبوراً آفس سے ہاف ڈے کی لیو لینی پڑے گی۔

''اوکے میں پک کرلوں گا، یو ڈونٹ وری۔'' حمزہ علی نے کانٹے سے آملیٹ کھاتے ہوئے کہا۔

''پھر ساری رات جاگتے رہے ہیں آپ؟'' نازش نے حمزہ علی کے چہرے کی تازگی میں بھی آنکھوں سے جھانکتی رات کی تھکن دیکھ لی تھی، نازش کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے حمزہ علی کے ہاتھ رکے تھے اور وہ ''ہوں'' کرکے رہ گیا۔

''کیا وہی خواب؟ آپ میڈیسن تو باقاعدگی سے لے رہے ہیں نا؟'' نازش نے پریشانی سے مگر دھیمے لہجے میں پوچھا تاکہ بچے نہ سن لیں۔

''تم پریشان مت ہو، میں بہتر ہوں اب چلو بچوں، ہری اپ دیر ہو رہی ہے مما کو آفس سے۔'' حمزہ علی نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بچوں سے کہا اور اٹھ کر اندر کمرے سے اپنا بریف کیس اور لیپ ٹاپ لینے چلا گیا، حمزہ علی کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی نازش بھی بچوں کو

لئے گھر کو لاک کر کے چلی گئی، غم روزگار کے جھمیلوں سے نبرد آزما ہوتے ہر سوچ، ہر خیال پس پشت چلا جاتا ہے، امریکا جیسے تیز رفتار ملک میں، اپنی اور اپنے خاندان کی بقاء کے لئے اسی تیز رفتاری سے چلنا پڑتا ہے، ہر دن کا آغاز اسی روٹین اور بھاگ دوڑ سے ہوتا تھا اور اختتام پہ جہاں رات بانہیں پھیلائے سکون کی نیند دینے کو تیار کھڑی ہوتی ہے، وہ رات ہی حمزہ علی کے ڈر

کے ساتھ جاگنے کی ہوتی تھی، ہر روشن دن کا اختتام اسی آدھی سوئی، جاگی رات کے اختتام پہ ہوتا تھا، پچھلے کئی سالوں سے حمزہ علی کا یہ معمول بن چکا تھا، بلکہ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ اس خواب کا دورانیہ بڑھنے لگا تھا، کبھی کبھی نظر آنے والا خواب، اب بغیر کسی تعطل کے روز نظر آنے لگا تھا۔

نازش کے بہت زیادہ اصرار اور زور دینے پر حمزہ علی، ایک ماہر نفسیات مائیکل جونز سے کافی عرصہ سے علاج بھی کروا رہا تھا، حمزہ علی کی عمر چالیس کے قریب تھی مگر وہ اپنی عمر سے کئی سال کم نظر آتا تھا، چاق و چوبند اور اپنی صحت کا مکمل خیال رکھنے والا حمزہ علی جسمانی طور پر فٹ تھا، اپنی محنت اور خداداد ذہانت کی بدولت بہت جلد ترقی کر کے نیویارک شہر میں کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔

اس کی چھوٹی سی دنیا، جنت کی نظیر تھی، مگر پچھلے کچھ عرصے سے مسلسل نظر آنے والے اس خواب نے اسے پریشان اور مضمحل کرنا شروع کر دیا تھا، بقول ڈاکٹر مائیکل جونز کے۔

''حمزہ علی جسمانی و ذہنی طور پر بالکل تندرست ہے، مگر اس کے ذہن میں کوئی گرہ یا ایسی بند کھڑکی ہے جسے چاہ کر بھی وہ کھول نہیں پا رہا تھا، جس دن وہ اس بند کھڑکی کا راز پا لے گا وہ خواب کے اس طلسم سے آزاد ہو جائے گا۔''
نازش کے سوالوں کے جواب میں بہت تفصیل سے ڈاکٹر مائیکل نے بتایا تھا اور اتنے سال گزرنے کے باوجود وہ گرہ اپنی جگہ آج بھی موجود تھی۔

☆☆☆

حمزہ علی اور نازش کی شادی کو بارہ سال گزر چکے تھے، دونوں کا تعلق سولہ سال پہلے تب بنا تھا جب حمزہ علی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور کچھ بننے کی لگن لے کر نیا نیا امریکہ آیا تھا، دونوں کلاس فیلو تھے، امریکہ جیسے آزاد ماحول میں اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت گزارنے والی نازش کو یہ وجیہہ، محنتی اور ذہین لڑکا بہت پسند آیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، حمزہ علی کی شخصیت کے مزید جوہر کھل کر سامنے آنے لگے اور نازش کے دل میں بڑھتی پسندیدگی، محبت میں ڈھل گئی تھی، حمزہ علی کے جذبات بھی مختلف نہیں تھے، نازش کی شخصیت میں مغربی انداز اور مشرقی روایات کی واضح جھلک نظر آتی تھی، ویل آف فیملی سے اس کا تعلق تھا مگر مزاج میں سادگی تھی، پراعتماد تھی مگر اوور کونفیڈنٹ نہیں تھی، اس کی زیادہ تر فیملی امریکہ میں رہائش پذیر تھی، وہ اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ رہتی تھی، جبکہ والدین اور ایک چھوٹی بہن پاکستان میں رہائش پذیر تھے، مگر امریکہ بھی آتے جاتے رہتے تھے، نازش کے والد مشہور بزنس مین تھے، جن کا کاروبار ملک میں اور ملک سے باہر پھیلا ہوا تھا۔

حمزہ علی کا تعلق مڈل کلاس فیملی سے تھا، چھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا، پانچوں بہن بھائی اس سے عمر میں کافی بڑے اور بال بچوں والے تھے، اس کی پیدائش کے کچھ عرصے کے بعد ہی لاڈ اٹھانے والی ماں خالق حقیقی سے جا ملی تھی، چار سال کے روتے بلکتے حمزہ علی کو ابا میاں نے کچھ اس طرح سمیٹا تھا کہ وہ ہی اس کی ماں بھی تھے اور باپ بھی، تینوں بڑے بھائی اور دو بہنیں بھی اس پر جان چھڑکتے تھے، وہ ان سب کا ''بابو بچہ'' تھا، بھابھیاں بھی آئیں تو حمزہ علی ان کا بھی چہیتا بن گیا تھا۔

ابا میاں ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے، حمزہ علی کی وجہ سے اپنے بڑے بیٹوں کے لاکھ کہنے کے

باوجود ابا میاں نے کام کرنا نہیں چھوڑا تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ حمزہ علی کو کسی کی بھی بات یا طعنہ ہی سننا پڑے۔

حمزہ علی کو ہر وہ چیز مہیا کی گئی جو بہتر سے بہترین تھی، حمزہ علی، ابا میاں کو بڑھاپے کی اولاد تھی اور ان کا عشق تھا اور کہتے ہیں کہ اولاد سے عشق بہت خوار کرواتا ہے، ایم بی اے کرنے کے بعد حمزہ علی اسکالر شپ پہ پڑھنے امریکہ چلا گیا، تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد اسے بہت اچھی جاب مل گئی تھی جہاں ترقی کے مواقع بہت تھے۔

اسی دوران حمزہ علی نے نازش کو پرپوز کیا، نازش پہلے ہی اس کی منتظر تھی، اس کی فیملی بھی حمزہ علی سے مل چکی تھی اور پسندیدگی کی سند مل گئی تھی، حمزہ علی نے ابا میاں کو ساری تفصیل بتا کر شادی کی اجازت مانگی تھی کیونکہ فی الحال فوراً پاکستان آنے ممکن نہیں تھے اور ابا میاں کی طرف سے اجازت ملتے ہی دونوں کی شادی سادگی سے ہو گئی، جس میں نازش کی تقریباً تمام فیملی ہی شامل تھی۔

حمزہ علی نے شادی کی تصویریں اور مووی ابا میاں کو بھیجی تھی، چھ مہینے بعد حمزہ علی، ایک مہینے کی چھٹی لے کر پاکستان آیا تھا، تب اس کا ولیمہ بہت دھوم دھام سے، سارے رشتہ داروں کو بلا کر کیا گیا تھا، نازش کو ملنے والا پروٹوکول بہت شاندار تھا۔

دن بہت تیزی سے گزرے تھے اور ان دوڑتے بھاگتے دنوں میں واپسی کا دن بھی آ پہنچا تھا، واپس آ کر وہی تیز رفتار اور مشینی زندگی ان کی منتظر تھی، پھر حمزہ کو اللہ نے صاحب اولاد کیا، ابا میاں بہت خوش ہوئے مگر حمزہ کے بچے کو گود میں کھلانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی، تصویروں سے آگے بات نہ بڑھ سکی اور دوسرے بیٹے کی ولادت کے کچھ عرصے کے بعد ابا میاں بھی چل بسے، نازش کی خراب حالت کے پیش نظر حمزہ علی اسے چھوڑ کر پاکستان نہیں جا سکتا تھا اور اس کے بغیر ہی ابا میاں کی تدفین کر دی گی، پاکستان سے اس کا رابطہ کم سے کم ہو کر رہ گیا تھا۔

ان دوڑتے بھاگتے دنوں میں نازش کی چھوٹی بہن کی شادی کی تاریخ رکھی گئی، شادی پاکستان میں ہونا تھی، نازش بہت پرجوش تھی، مگر حمزہ علی بہت مصروف تھا ان دنوں، اس کے لئے چھٹی لینا بہت مشکل تھا، مگر وہ نازش اس اور بچوں کو پاکستان بھیج رہا تھا، نازش اس کے بغیر نہیں جانا چاہتی تھی، مگر وہ حمزہ علی کی مجبوری کو بھی سمجھتی تھی، اس لئے چپ کر گئی تھی۔

☆☆☆

وہ گھبرا کر اٹھا تھا، اس کے وجیہہ چہرے پہ خوف بہت واضح تھا، ماتھے پہ پسینہ چمک رہا تھا، اس کا تنفس بہت تیز تھا، حمزہ علی نے گہری گہری سانس لے کر خود کو نارمل کیا اور وال کلاک پہ نظر ڈالی، جس کے سنہری ہندسے چمک رہے تھے، رات کے تین بجے تھے، حمزہ علی نے گردن گھما کر بے خبر سوئی نازش پہ نظر ڈالی، جو سوتے ہوئے بہت سادہ اور معصوم لگ رہی تھی، اس کے ہونٹوں پہ ہمہ وقت رہنے والی مسکراہٹ چہرے کو نرمی عطا کرتی تھی، حمزہ علی نے پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے اور سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں کو لگایا۔

حواس بحال ہوئے تو خاموشی سے اٹھا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے پاس پہنچا، نائٹ بلب کی روشنی میں ہر چیز بہت واضح تھی، رات کے اس پہر نیو پارک کی جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھنا بہت بھلا لگ رہا تھا۔

کبھی کبھی ہوتا ہے ناں کہ خاموش اور جلتے بجھتے سائن اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور بہت گہری خاموشی اور اداسی میں خاموش اور ساکن منظر عجب تقویت پہنچاتے ہیں۔

حمزہ علی کچھ دیر خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا، پھر واپس مڑا اور ایک طائرانہ نظر سارے کمرے پہ ڈالی اور پھر دھیرے دھیرے چلتا وہ دیوار میں نصب قد آور آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا اور آئینے میں ابھرنے والے اپنے عکس کو غور سے دیکھنے لگا۔

''میں حمزہ علی! اپنی زندگی میں کامیاب و کامران مٹی کو بھی ہاتھ لگاؤں تو سونا بن جاتی ہے، ایسی زندگی جس کا خواب سب دیکھتے ہیں، خوبصورت بیوی، تین پیارے پیارے بچے، ویل سیلیڈ لائف، جیسے یہ جنت کا کوئی ٹکڑا ہو مگر......'' اس نے گہری سانس لی اور پھر گھوم کر کمرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔

''اگر یہ جنت ہے تو اس میں یہ ڈر، یہ خوف کیسا، اتنی مدت سے نظر آنے والے اس خواب کا مطلب کیا ہے؟ یہ خواب میری جنت کو مکمل نہیں ہونے دیتا، کتنی مدت ہو گئی میں سکون کی نیند نہیں سویا، ٹریکولائز لینے کے باوجود، ہر چیز اپنا اثر کھو رہی ہے اور یہ خواب...... اف کیا کروں؟ کس سے کہوں؟'' حمزہ علی نے اپنے گھنے والوں میں بے چینی سے ہاتھ پھیرا، پھر وال کلاک پہ نظر ڈالتا سر جھٹکتا واش روم کی طرف بڑھ گیا، کچھ دیر میں وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس کانوں میں ہینڈ فری لگائے لفٹ سے گراؤنڈ فلور میں پہنچا، اس کی ہر صبح کا آغاز ایسے ہی ہوتا ہے، اپنی صحت کا مکمل خیال رکھتا تھا اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا، چاہے کتنا بھی ذہنی طور پر پریشان ہو مگر اپنے معمولات میں تبدیلی نہیں کرتا تھا۔

کچھ دیر کھلی ہوا میں سانس لینے کے بعد وہ بہت فریش موڈ میں جاگنگ کر رہا تھا، اپنے پسندیدہ گانے کو سنتے، وسلنگ کرتا وہ اپنے مخصوص روٹ پہ بھاگ رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہو رہا ہے؟'' حمزہ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے کافی دیر سے سو کر اٹھا اور فریش ہو کر لاؤنج میں چلا آیا، عارب اپنی کتابیں کھولے بیٹھا ہوا تھا، جبکہ نازش، عشنا کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں بچوں کو پڑھا رہی تھی، جواد ابھی اٹھ کر اپنے روم میں گیا ہے۔''

نازش نے تفصیل سے جواب دیا، اسی وقت عشنا نے اپنے کپڑوں پہ چاکلیٹ گرا لیا، نازش اس کے کپڑے تبدیل کروانے کے لئے اٹھ گئی۔

''پاپا یہ دیکھیں، ٹیچر نے مجھے بہت شاباش دی آج۔'' عارب اپنی ڈرائنگ بک اٹھا کر باپ کے پاس آیا، حمزہ نے مسکراتے ہوئے اس کی نوٹ بک پکڑی، عارب کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی اور اس کے تخلیقی ذہن کے نئے اور منفرد آئیڈیاز سب کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔

حمزہ صفحے پلٹتا، اس کی ڈرائنگ دیکھ رہا تھا، ہر صفحے پہ ٹیچرز کے تعریفی ریمارکس تھے، اسی وقت جواد نے آواز دی تو عارب ''ابھی آیا'' کہہ کر کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

صفحے پلٹتا حمزہ ایک دم ہی ٹھٹک کر رک گیا، اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ایک دم ہی غائب ہو گئی، آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لئے وہ بہت خاموشی سے صفحے کو گھور رہا تھا، کچھ سوچتا، یاد کرتا وہ ایک دم ہی چونکا تھا، ایک پردہ سا سرکا تھا نظروں کے سامنے سے۔

بڑے سے گھنے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑے کچھ لوگ۔

بظاہر بہت عام سا منظر تھا یہ مگر اسے خاص بنا رہے تھے عارب کے لفظ، ایک آٹھ سال کے بچے کی سوچ کتنی شفاف اور مضبوط تھی۔

حمزہ علی کے ذہن میں لگی گرہ آج کھل گئی تھی، اس نے گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض دفعہ سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی ہے اور ایسا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو ساری عمر خود سے بھاگتے ہیں اور جب تھک ہار کر رکتے ہیں تو اسی سچ کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں، جس سے بچنے اور چھپنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہے ہیں، مگر اس سچ کو نہیں ڈھونڈ پاتے ہیں اور ایسا ہی حمزہ علی کے ساتھ ہوا تھا۔

''یہ لیجئے گرما گرم ناشتہ۔'' نازش نے ٹرے میز پہ رکھتے ہوئے کہا، تو حمزہ آنکھیں کھولتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''میں کل چھٹیوں کے لئے اپلائی کر رہا ہوں، ہم سب مل کر پاکستان جائیں گے، تم تیاری شروع کر دو۔'' حمزہ علی نے سنجیدگی سے کہا اور نازش کے حیران چہرے کو نظر انداز کرتا ناشتہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نازش کو لاہور، اس کے گھر چھوڑ کر وہ اپنے سسر کی نیو چمکتی کار میں گوجرانوالہ کی طرف عازم سفر ہوا، شادی میں ابھی کچھ دن رہتے تھے، نازش اور بچوں نے ابھی اپنی شاپنگ بھی کرنی تھی، حمزہ علی کو یہ وقت غنیمت لگا، نازش کے اصرار کے باوجود وہ اسے اور بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لے کر جا رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ پہلے خود جائے بعد میں بیوی بچوں کو سب سے ملوائے گا۔

گوجرانوالہ شہر کی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا وہ گہری سوچ میں گم تھا، بڑے سے آبائی گھر کے سامنے جب وہ اترا تو اس کے سارے وجود پہ لرزش طاری تھی، یہ وہ ہی گھر ہے جہاں کسی نے اس کی آمد کے انتظار میں ہر لمحہ میں انتظار کے کتنے ہی چراغ جلائے اور بجھائے تھے، اس گھر کی دہلیز مدتوں سے اس کی چاپ کی منتظر تھی اور دہلیز پہ کانپتے ہاتھوں کی لرزش اور منتظر آنکھوں کے دیئے آج بھی روشن تھے۔

حمزہ علی کے سارے بہن بھائی اپنی آل اولاد کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے موجود تھے، نئی نسل جوان ہو چکی تھی، جن کا وہ آئیڈیل تھا، آج بھی وہ سب میں منفرد اور الگ نظر آتا تھا۔

اپنوں کے درمیان آ کر اور ان سے مل کر حمزہ علی نے جانا کہ اپنے پن کی مٹھاس اور اس کی خوشبو کیا چیز ہوتی ہے۔

☆☆☆

یہاں آتے ہی یادوں کی پٹاری کھل گئی تھی، اس کا بچپن، لڑکپن، جوانی سب ان در و دیوار میں بستا تھا، ہر ایک کی زبان پہ یادیں تھی، باتیں تھیں اور ان باتوں کی ابتداء اور اختتام ایک ہی لفظ پہ ہوتی تھی۔

''ابا میاں!''

ابا میاں یہ کہتے تھے، ابا میاں وہ کہتے تھے، حمزہ علی سے ابا میاں کا عشق ایک مثال کے طور پہ پیش کیا جاتا تھا، جتنی فکر اور محبت ابا میاں کو حمزہ سے تھی، کسی اور اولاد سے نہیں تھی، اسے سائیکل پہ بٹھا کر سکول چھوڑنے سے لے کر اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے تک کا خیال ابا میاں رکھتے تھے۔

حمزہ علی کو یاد ہے سکول سے واپسی پہ اکثر چھٹی والے دن وہ اور ابا میاں گھر سے نکل

جاتے اور اس بڑے سے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کرتے، مستقبل کے خواب بنتے، دکھ سکھ شیئر کرتے یا پھر پتا نہیں کب کیوں اور کیسے حمزہ علی کے خوابوں میں دیار غیر میں بسنے کی خواہش جاگ اٹھی، اسے آج بھی یاد ہے کہ اس کے اسکالرشپ پہ باہر جانے کا سن کر ابا میاں کتنی دیر خاموش رہے تھے۔

''یار تجھے خود سے گلے لگا کر جو ٹھنڈ ملتی ہے تو دور چلا جائے گا تو میں کیا کروں گا؟'' ابا میاں آزردہ سے لہجے میں مسکرا کر بولے تھے۔

''اف او ابا میاں! آج کل تو رابطہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے، میں اپنی تصویریں وغیرہ بھیجتا رہا ہوں گا۔'' حمزہ علی نے جھنجلا کر کہا تھا، ابا میاں خاموش ہو گئے کہ تصویریں، لمس کا نعم البدل تو نہیں ہوتیں، پھر وہ چلا گیا، کبھی واپس نہ آنے کے لئے اور ابا میاں دیوانہ وار اس کے خط، تصویروں کے منتظر رہتے، بار بار اپنے بیٹوں، پوتے پوتیوں کو نیٹ لگانے کا کہتے، حمزہ علی سے بات کرنے کا شوق، اسے دیکھنے کی حسرت، ہر دم انہیں بے چین رکھتی۔

حمزہ علی کی شادی بھی ایسے ہی ہوئی، وہ پاکستان آیا بھی تو بہت مختصر وقت کے لئے اور وہ بھی یار دوستوں سے ملنے میں مگن، ابا میاں منتظر ہی رہتے اور وہ واپس بھی چلا گیا، پھر حمزہ علی صاحب اولاد ہوا، ایک اور حسرت اس کے بچوں کو گود میں کھلانے کی، جو حسرت ہی رہ گئی اس لئے کہ آگے سے آگے بڑھنے کی دھن میں مگن حمزہ علی کو ابا میاں کے انتظار کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

آج بھی سب اکٹھے ہوئے تو سب کی زبان پہ یہ ہی باتیں تھیں، جو ایک سوئی کی طرح حمزہ علی کو چبھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن حمزہ علی ابا میاں کی قبر پہ گیا، ساتھ ہی اس کی ماں کی بھی قبر تھی، کتنی دیر اس کی سرخ ہوتی آنکھیں ضبط کی گواہ تھیں، کافی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھا اور کار میں بیٹھ کر ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہا۔

کچھ دور اپنے سکول جانے والی سڑک پہ اس نے گاڑی رکوائی، حمزہ علی گاڑی سے اترا تو آس پاس کھیلتے کتنے ہی بچوں اور بڑوں نے بڑی شاندار سی گاڑی سے ایک ہینڈسم اور شاندار شخص کو اترتے دیکھا تھا۔

سکائی کلر کی ہاف سلیوز شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس، آنکھوں میں گلاسز لگائے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا، بڑے سے گھنے اور تناور درخت کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا، کتنے ہی لمحے یہاں قید تھے۔

''ابا میاں اکثر یہاں اکیلے آ کر بیٹھ جاتے تھے، خاص کر اپنے آخری دنوں میں وہ اکثر پیدل چل کر یہاں تک پہنچتے اور تب تک بیٹھے رہتے جب تک گھر سے کوئی ڈھونڈتا ہوا، وہاں تک نہیں پہنچتا تھا، ابا میاں کہتے تھے کہ مجھے اس درخت سے حمزہ علی کی خوشبو آتی ہے، اس کا لمس محسوس ہوتا ہے۔''

حمزہ علی کو بڑے بھائی نے کل رات بتایا تھا حمزہ علی نے گلاسز اتارے اور خاموشی سے آگے بڑھ کر درخت کے تنے پہ ہاتھ پھیرنے لگا، کچھ دیر بعد ہی دیکھنے والوں کی آنکھوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا تھا۔

ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص دونوں بازوؤں کو درخت کے گرد لپیٹے، دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور ابا میاں ابا میاں پکار رہا تھا۔

وہ روتا ہوا شاندار شخص ان حیران کن

نظروں کو کیا بتایا کہ دنیا میں اپنی چھوٹی سی جنت بنا لینے کے باوجود وہ راتوں کو کیوں سو نہیں پاتا تھا، اس دن عارب نے ایک ڈرائنگ بنائی تھی، جس میں ایک درخت بنایا تھا اور اس کے نیچے ایک عورت اور تین بچے بنائے تھے، عارب نے باپ کو گھنے سایہ دار درخت سے تشبیہہ دی تھی جو اپنی فیملی کو ہر سرد گرم سے بچا کر اپنی پناہ میں رکھتا ہے۔

ایک باپ خود زمانے کی سختی گرمی جھیل کر اپنے گھر والوں کو آرام اور سکون مہیا کرتا ہے، اس تصویر کو دیکھ کر حمزہ علی کے لاشعور میں لگی گرہ کھل گئی تھی، اسے اپنے خواب میں درخت دیکھنے کا مطلب سمجھ آ گیا تھا۔

ابا میاں بھی اسی بوڑھے شجر کی مانند تھے، جنہوں نے ہمیشہ اسے تحفظ اور چھاؤں فراہم کی تھی، ہمیشہ اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹا تھا اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کا احساس اور دعائیں حمزہ علی کے گرد رہتی تھی۔

حمزہ علی اپنے احساس جرم کو چھپائے بظاہر بہت کامیاب زندگی گزار رہا تھا، مگر اس کا اندر ایک خوف، ایک ڈر بڑھتی عمر کے ساتھ زور آور ہونے لگا تھا، جب جب وہ اپنے جوان ہوتے بیٹوں کی طرف دیکھتا تھا، اس کے اندر کا خوف پوری طرح سامنے آنے لگتا تھا، جس طرح وہ اپنی خود غرضی اور بے حسی کے ہاتھوں ابا میاں کو چھوڑ گیا تھا کہیں اس کے بچے بھی ایسا ہی نہ کریں جو ویسے ہی مغربی معاشرے کی پیداوار تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حمزہ علی کو بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ بھی ایک مضبوط و توانا درخت کی مانند ہے، آج اسے ابا میاں کی محبت اور قربانیوں کا احساس ہو رہا تھا اور یہی خلش اور پچھتاوا تھا جو اسے راتوں کو سونے نہیں دیتا تھا۔

اسے احساس بھی ہوا تب جب وہ خود بوڑھا شجر بننے جا رہا تھا۔

اس بات کو ایک سال سے زائد گزر گیا ہے، حمزہ علی پاکستان سے آنے کے بعد بہت بدل گیا تھا، خاص کر اب وہ خواب میں نہیں ڈرتا تھا۔

نازش اکثر بہت حیران ہوتی اور حمزہ سے پوچھنے لگتی۔

''حمزہ! اب آپ کو وہ خواب نظر نہیں آتا۔''

تو حمزہ علی اداسی سے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیتا، نازش خوش ہو جاتی اسے لگتا تھا کہ یہ سب ڈاکٹر مائیکل جونز کے علاج کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔

حمزہ علی نے بھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ آج بھی اس درخت کو خواب میں دیکھتا ہے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اب وہ درخت بہت خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے، اس کی شاخیں حمزہ کی طرف نہیں بڑھتی ہیں۔

بلکہ اب حمزہ علی اس درخت سے لپٹ کر روتا ہے، مگر وہ شاخیں اسے اپنی پناہ میں نہیں لیتی ہیں، جس پناہ کو وہ خود کئی سال پہلے چھوڑ آیا تھا۔

وہ بوڑھا شجر تو شروع سے اپنی جگہ موجود رہا تھا، بس حمزہ علی کو احساس نہیں تھا اسے احساس تب ہوا جب وہ خود بھی ایک ''بوڑھا شجر'' بننے لگا تھا۔

نجانے ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنے گھر کے اس ''بوڑھے شجر'' سے بے خبر کیوں ہوتے ہیں؟ اور ہمیں احساس تب ہوتا ہے جب ہم اس شجر کی چھاؤں سے محروم ہو جاتے ہیں اور دنیا کی تپتی گرم دھوپ احساس دلاتی ہے کہ ہم نے کس کو کھویا ہے اور کس قیمت پہ......!!!

☆☆☆

القرآن

○ ''کیا تو نے نہیں دیکھا بے شک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور (خصوصاً) پرندے بھی جو پر پھیلائے (اڑتے پھرتے) ہیں، سب کو اپنی اپنی دعا اور تسبیح یاد ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں۔'' (سورہ نور، رکوع ۶)

○ ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر خوب کثرت سے کرو اور صبح شام اس کی تسبیح کرو۔'' سورہ احزاب رکوع ۶)

○ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہیں بچاؤ، اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے، اسے بجا لاتے ہیں، (اس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو تمہیں تو ویسا ہی بدلا دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔'' (التحریم)

○ ''جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اللہ نے ان کے عمل برباد کیے اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمدؐ پر اتارا گیا اور وہی ان رب کے پاس سے حق ہے، اللہ نے ان کی برائیاں اتار دیں اور ان کی حالتیں سنوار دیں۔''

(محمدؐ)

نازیہ عمر، پشاور

پانچ عمل

نبی آخر الزمان مصطفیٰ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا۔

''اے علی! روزانہ رات کو پانچ کام کر کے سویا کرو۔''

اول: چار ہزار دینار صدقہ دے کر سویا کرو۔

دوم: ایک قرآن شریف پڑھ کر سویا کرو۔

سوئم: جنت کی قیمت دے کر سویا کرو۔

چہارم: دو ناراض لوگوں میں صلح کرا کے سویا کرو۔

پنجم: ایک حج کر کے سویا کرو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ امر تو محال ہے میں کیسے کر سکوں گا؟'' فرمایا۔

''چار مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر سویا کرو، اس کا ثواب ایک قرآن پاک پڑھنے کے برابر ہے، دس مرتبہ درود شریف پڑھ کر سویا کرو یہ جنت کی قیمت ادا کرنے کے برابر ہو گا، دس مرتبہ استغفر اللہ پڑھ کر سویا کرو یہ دو لڑنے والوں میں صلح کرانے کے برابر ہو گا، چار مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھ کر سویا کرو ایک حج کا ثواب ملے گا۔''

اس پر حضرت علی نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اب تو میں ہر رات یہی عمل کر کے سویا کروں گا۔''

علینہ طارق، لاہور

بکھرے موتی

○ کبھی کبھی ہر انسان کو بڑے گناہ سے بچنے کی خاطر چھوٹا گناہ بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔

○ امن کی فاختہ وہیں اترتی ہے جہاں پیار اور صلح کی دھوپ پھیلتی ہو۔

○ جو شخص وعدہ کرنے سے جتنا زیادہ گریز کرتا ہے وہ وعدے کا اتنا ہی زیادہ پابند ہوتا ہے۔

○ آپ کو اس دنیا سے جانے کے بعد دوبارہ کبھی لوٹ کر نہیں آنا تو پھر جو نیکی بھی کرنی ہے بڑے خلوص سے فوراً کر ڈالیے۔

زارا علی، منڈی بہاؤالدین

روشن سطریں

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

میں اپنے بندوں کے گمان کے مطابق ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتے تو میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔

اگر وہ جماعت یاد کرے تو میں اسے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو ان سے بہتر ہے۔

اگر وہ ایک بالشت میرے قریب آئے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔

اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب آئے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔

اگر وہ میرے پاس چلتا ہوا آئے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔

(حدیث قدسی: بحوالہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

رمشا احمد، لاہور

انمول موتی

☆ ستاروں سے روشن رہنے کا سبق ضرور سیکھو مگر ستارہ بننے کی خواہش نہ کرو کیونکہ یہ راستہ دکھا سکتے ہیں، منزل نہیں ہوتے۔

☆ گناہ کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کی رحمت کی امید رکھنا بدقسمتی کی علامت ہے۔

☆ رشتے اہم نہیں ہوتے ان کو سمجھنے کے طریقے اہم ہوتے ہیں۔

☆ وہ انسانی شخصیت کبھی کھوکھلی نہیں ہوتی جس میں جذبوں اور انسانی عظمت کے اوصاف موجود ہوں۔

☆ وہ شخص ہمیشہ بے فیض رہتا ہے جو اپنے استاد کی عظمت و بزرگی کا خیال نہیں رکھتا جس سے ایک نقطہ سیکھو، اس کی دل سے عزت کرو۔

☆ جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہو، اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لئے تیار ہونا چاہیے، کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

لائبہ رضوان، فیصل آباد

دلچسپ و حیرت انگیز معلومات

☆ ہمنگ برڈ وہ پرندہ ہے جو اڑ تو سکتا ہے مگر چل نہیں سکتا اور یہی وہ واحد پرندہ ہے جو جتنی رفتار سے سیدھا اڑتا ہے اتنی ہی رفتار سے پیچھے کی طرف بھی اڑ سکتا ہے۔

☆ بلجیم دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے اور اس جرم پر باقاعدہ سزا دی جاتی ہے۔

☆ ناروے کے بادشاہ الیسپن نے اپنے پالتو کتے کو ایک ریاست کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا تھا۔

☆ سارس وہ گونگا پرندہ ہے جو کچھ بھی بول نہیں سکتا۔

☆ وسطی افریقہ کے باکی نامی گاؤں میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو ہر وقت گول گول

گھومتا ہے۔

☆ جبوتی ملک کی پولیس صرف چار افراد پر مشتمل ہے۔

☆ چمگادڑ دنیا کا وہ واحد اڑنے والا جانور ہے جس کے دانت ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے۔

عالی ناز، گوجرانوالہ

سب کا خیال رکھیں

مدینہ میں بنوسلمہ نے اپنے محلے میں ایک مسجد بنائی تھی، جہاں حضرت معاذ بن جبل نماز پڑھایا کرتے تھے، ایک دن عشاء کی نماز میں انہوں نے سورہ بقرہ پڑھی یہ قرآن پاک کی سب سے لمبی سورہ ہے، پیچھے کی صفوں میں ایک صاحب تھے جو سارا دن کھیت میں کام کر کے آتے تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے، حضرت معاذ کی نماز ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ نیت توڑ کر مسجد سے چلے گئے، حضرت معاذ کو خبر ہوئی تو کہنے لگے کہ وہ منافق ہے، اس شخص نے جب یہ سنا تو اسے بہت رنج ہوا اور حضورؐ کے پاس آیا اور حضرت معاذ کی شکایت کی۔

حضورؐ نے حضرت معاذ کو بلایا اور فرمایا۔

''چھوٹی سورتیں پڑھا کرو کیونکہ تمہارے پیچھے پڑھنے والوں میں سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بوڑھے بھی اور وہ بھی جنہیں کوئی کام ہوتا ہے، تم کو سب کا خیال رکھنا چاہیے۔''

مہناز فاطمہ، خوشاب

بڑے لوگوں کی باتیں

○ حقیقی خوبصورتی کا چشمہ دل ہے اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔ (بو علی سینا)

○ محبت کے لحاظ سے ہر ایک باپ یعقوبؑ اور حسن کے لحاظ سے ہر ایک بیٹا یوسفؑ ہے۔ (بو علی سینا)

○ جو شخص لوگوں کو عمل صالح کی ہدایت کرے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس کی مثال اس اندھے شخص کی مانند ہے جسے کے ہاتھ میں چراغ ہو اس سے وہ دوسروں کو تو روشنی دے اور خود نہ دیکھ سکے۔ (حکیم افلاطون)

○ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔ (سقراط)

○ زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو پانا ہے، اگر نفس نے دل پر فتح پائی تو سمجھو کہ وہ دل مردہ ہے۔ (ارسطو)

○ کوئی شیشہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔ (بین جونس)

○ اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیے، یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہو جائے گا۔ (ایڈیسن)

○ عمدہ چیز کو حاصل کرنا کوئی خوبی نہیں بلکہ اس کو عمدہ طریقے سے استعمال کرنا خوبی ہے۔ (جونسن)

○ انسان کی عقل کا اندازہ غصے کی حالت میں لگانا چاہیے۔ (ہوشنگ)

○ اگر غرور کوئی عمل ہوتا تو اس کے سند یافتہ بہت ہوتے۔ (ہربرٹ سپنسر)

○ میری ہر تکلیف اور غم میں میری ماں کا تصور میرے لئے فرشتہ نجات بن کر آتا ہے۔ (ابو الفضل)

○ سب سے خوبصورت اور شیریں ماں کا پیار ہے۔ (چارلس ڈکنز)

شازیہ ثمن، جھنگ

☆☆☆

نائمہ ثمن: کی ڈائری سے ایک نظم

جانے کون نگر کی چڑیا
شام منڈیر پر آبیٹھی ہے
چونچ میں اک نازک سی ڈالی
اس پہ ایک سنہرا پھول
جیسے عشق سفر کی دھول

زارا علی: کی ڈائری سے ایک نظم

خواہشوں کے سمندر کے سب موتی تیرا مقدر ہوں
پھول لہجے پھول چہرے تیرے ہمسفر ہوں
تیری سماعت کی دسترس میں
کبھی وہ لفظ نہ آئے
کہ دل کو ملال ہو
تیری بصارتوں میں ہر وہ منظر اترے
روشن ہو صاحب جمال ہو
تیری شام و ہجر تیرے برگ و ثمر
تیرے لیل و نہار تیرا رنگ عارض و رخسار
امنڈتی بہاروں کی مثال ہو
یوں اتریں تیرے لئے رحمتوں کا موسم
کہ تیرے دعا کوئی حرف مدعا
آسمانوں سے کبھی رد نہ ہو
تیرے نام کی دعاؤں میں شامل
کسی کا کوئی حرف بد نہ ہو
کہکشاں راستوں پر پیہم رواں رہے
میری دعا ہے کہ تیری عمر کا ہر لمحہ جاوداں رہے

مریم ماہ منیر: کی ڈائری سے ایک نظم

"تعلق"

کہتے ہیں کہ شام اور اداسی کا
تعلق گہرا ہوتا ہے
مگر یہ بات بھی طے ہے کہ
جب دل میں خوشیوں کے
پھول کھلتے ہیں
تو شام بھی ان
گلوں کے رنگوں سے
کچھ رنگ چرا کر
ان میں نہا کر
دھل کر حسین لگتی ہے
دل کو اچھی لگتی ہے

پنکی گڑیا: کی ڈائری سے ایک نظم

ہماری ان کہی باتوں سے
زیادہ خوب صورت ہیں
جنہیں کوئی نہیں لکھتا
جنہیں کوئی نہیں سنتا
جو ہونٹوں تک نہیں آتیں
جو کانوں تک نہیں جاتیں
زبان کا لمس چھولے تو
اندیشے لپکتے ہیں
ہماری ان کہی باتیں

کرن خان: کی ڈائری سے ایک نظم

"مان ٹوٹنے کا دکھ"

محبت و وفا کی راہ پہ چلتے ہوئے
بہت دکھ سہے ہیں میں نے
اس راہ پہ چلتے چلتے
میرا دل کرچی کرچی ہوا
اور روح
ریزہ ریزہ لیکن
نہ تو مجھے یہ دکھ ہے کہ
دل کرچی کرچی ہوا

اور نہ یہ رنج
کہ روح ریزہ ریزہ
بلکہ دکھ تو ان رشتوں کا ہے
جو ٹوٹے اور جن پر مجھے
مان تھا بہت
عائلہ ناز: کی ڈائری سے شہیدوں کے لیے نظم
''میں کیسے پرسہ دوں؟''
میرے کانوں میں چیخیں ہیں
میرے معصوم بچوں کی
میری آنکھوں کے تاروں کی
کہ جن کے کھیلنے کے دن تھے
لیکن ان ظالموں نے ان سے کیسا کھیل کھیلا تھا؟
میرے بچوں سے اس دن ''موت'' کھیلی تھی
میری آنکھوں میں منظر ہیں
بہت سفاک منظر ہیں
کہیں بکھری کتابیں ہیں
کہ جن پر موت لکھی ہے
کہیں بستہ ہے کاپی ہے
کہ جن پر خون کے دھبے رلائیں خون کے آنسو
کسی منظر میں مائیں بین کرتی ہیں
کہیں پھولوں کی لاشوں پر بہت سے پھول رکھے ہیں
مجھے ماؤں کی چیخیں رات بھر سونے نہیں دیتیں
کہ میں ان سرد راتوں میں یہ گھنٹوں سوچتی ہوں بس
میں پرسہ دے سکوں گی کیا؟
انہیں اب اپنی نظموں سے؟
میں کیسے ان کے دکھ کو اپنی نظم میں ڈھالوں؟
خدا سے پوچھنا چاہوں کہ یارب
تیری دھرتی پر اگر یہ ظلم ٹوٹا ہے
زمین کیونکر سلامت ہے قیامت کیوں نہیں آئی؟
میں شکوہ کر نہیں سکتی
جواب آئے گا شکوے کا
تمہارا فرض بھی کچھ تھا
اگر تم اک قوم بن جاتے
تو یہ دن بھی نہیں آتا
مجھے شکوہ نہیں کرنا
مجھے پرسہ تو دینا ہے
مجھے ان سب دکھوں کو اپنی نظموں میں بھی لکھنا ہے
میرے آنسو بھی حاضر ہیں
میری یہ نظم نذرانہ
مگر میں کیسے پرسہ دوں؟
کہ یارب...... میں بھی تو ماں ہوں
سو ماں کا دکھ سمجھتی ہوں
مجھے معلوم ہے ایسے دکھوں کا تیری دنیا میں
مداوا ہو نہیں سکتا
کبھی بھی دل گرفتہ ماں کو پرسہ ہو نہیں سکتا
تڑپتی ماں کو اب دلاسہ دیا نہیں جا سکتا
بلکتی ممتا کو اب دلاسہ دیا نہیں جا سکتا
ارم آنچل: کی ڈائری سے ایک نظم
''آسمان کا فیصلہ''
ہاتھوں پہ
کتابوں پہ
درختوں پہ
کسی کا نام لکھنے سے
کوئی اپنا نہیں ہوتا
نام سے نام جوڑنا
اتنا آساں نہیں ہوتا
آسمان کا فیصلہ ہے یہ
زمیں پہ نہیں ہوتا
سارا حیدر: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
دل چاہتا ہے میں بنجارن بن جاؤں
ہر شہر، ہر گاؤں اپنا میں ڈیرہ لگاؤں
صدا یہ لگاؤں میں ہر گلی گلی
تیرے پیار کی جوگن بن جاؤں
ناچوں میں اپنے دل کی تال پہ
باندھوں گھنگرو اور مر جاؤں
ہر جگہ تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ ہاروں

ہر سمت محبت کے اپنے قلعے بناؤں
محبت میں مرتو سبھی ہی جاتے ہیں
میں کوئی دوسرا ایسا کام کر جاؤں
لوگ روتے ہیں محبت کے مزاروں کو
میں گمنام سی اپنی قبر بناؤں
جہاں پیپل کا پرانا درخت ہو
نام جس پہ اپنا اور تیرا لکھواؤں
اور کوئی خواہش نہ کروں یا قیامت
بس اک تیرے نام سے پہچانی جاؤں

فرحانہ خان: کی ڈائری سے ایک غزل

راہ عمل میں اختیار تو سفر کرو
پھر گلہ بجا ہے کہ اب تو سحر کرو
بہتر ہے ایسے دوستوں کی دوستی سے کہ
اپنے بھی تم حصار میں جیون بسر کرو
عزیز بھی رکھتے ہیں وہ کیسے ہیں ستم گر
کر کر کے ستم کہتے ہیں جاناں صبر کرو
سنا ہے کہ وہ مہرباں ہر دل عزیز رہیں
ویراں ہے کب سے دل مرا اس کو تو گھر کرو
دیکھیں ذرا ناراضگی میں لگتے ہیں کیسے آپ
کیوں منہ گھمائے بیٹھے ہو چہرہ ادھر کرو
محفل یاراں میں وہ مگن ہیں کس قدر
تنہائی کی میری ذرا ان کو خبر کرو
کہتے ہو بھولنے کا جو سنتو میری یہ شرط
ہم تم کو بھول جائیں تم کبھی مگر کرو
رقیب نہ بن جائے راز داں ہے جو
شمال کے سخن میں کہ ان کا ذکر کرو

سباس گل: کی ڈائری سے ایک غزل

پھول سے خوشبو کو جدا کون کرے
اس قدر ستم ظریفی بتا کون کرے
پل میں بجھ جائے گا یہ زندگی کا دیا
سرکشی میں ہواؤں کی بچا کون کرے
ملنا ہو گا تو مل ہی جائے گا
گلی گلی اب اس کا پتہ کون کرے
سر پہ جو افتاد پڑی اپنے بھی ہوئے بیگانے
ایسے حالات میں اپنا ہوا کون کرے
دل میں سو چھید ہوں اپنوں کے دیئے جب
بات ہنسنے کی نہیں ہو پھر بھی ہنسا کون کرے
زندگی ہر ایک کو ہے فقط اپنی ہی پیاری
یوں کسی کی خاطر بتاؤ مرا کون کرے
یہ تو گل نے ہی سر آنکھوں پہ بٹھا رکھا ہے اسے
ورنہ اس کی کہانیاں قصے سنا کون کرے

رمشا احمد: کی ڈائری سے ایک نظم

''ضروری بات''

ذرا ٹھہرو
کہ تم سے اک ضروری بات کرنی ہے
ادھر آؤ
کہ رستے میں کھڑے ہونا ہمیں اچھا نہیں لگتا
یہاں بیٹھو
کہ باتیں تو ہمیشہ ہم تسلی ہی سے کرتے ہیں
ہمیں اس طرح مت دیکھو
نہیں تو ہم تمہارے سامنے کچھ کہہ نہ پائیں گے
تو ہاں بس بات اتنی ہے
چلو چھوڑو
کبھی موقع ملا تو پھر بتائیں گے

نازیہ عمر: کی ڈائری سے ایک نظم

یونہی زندگی گزار دی
ہم نے وصل کی چاہ میں
فراق کے زنداں میں
رتجگوں کے عذاب جھیلے
صحرائے آبلہ پا میں
تمہاری یاد کے عوض
اپنی ہر سانس وار دی
ہم نے وصل کی چاہ میں
یونہی زندگی گزار دی
سدا لاحق رہی بے کلی
سدا پریشاں رہے
کچھ بھی حاصل نہ ہوا

☆☆☆

زارا علی ---- منڈی بہاؤالدین
س: سوال گندم، جواب چنا کیا بات ہے آپ کی؟
ج: اگر آپ کو جواب سمجھ نہیں آتا تو اس میں جواب کا نہیں آپ کی عقل کا قصور ہے، سمجھ آیا۔
س: لیجئے برامان گئے...... کرلو گل؟
ج: کرلو گل نہیں سمجھو گی۔

سبیلہ خان ---- جھنگ
س: یوں بھی ہوا ہے جرم ناحق کیے بغیر لٹکے ہیں سولیوں پہ کچھ؟
ج: بے جرم شگفتگی کی سزا مرگ مفاجات۔
س: ان کی یادوں کے دیئے جلتے کیوں نہیں جب دیکھوں بجھتے ہی رہتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے عیار جی؟
ج: دیئے دل سے جلاؤ پھر دیکھو جلتے ہیں کہ نہیں۔
س: تیری حیثیت ہو جاؤں گا اڑا کر ان کی قبر؟
ج: یہ کس کی قبر کی سامت آئی ہے؟ لگتا ہے کہ جھنگ کے قبرستان تم خراب کرتی ہو۔
س: عیار جی پھر چپت لگی نہ آپ کے خلاص میں کہا بھی تھامت جایئے اپنی ان کی طرف چھ بھائی ہے ان کے؟
ج: اس کو چھوڑو یہ بتاؤ تمہارے کتنے ہیں؟
س: تم کو تصور میں لانے کی غلطی کبھی نہیں کرتی، کمزور دل جو رکھتی ہو۔
ج: میں طاقتور دل رکھنے کے باوجود تمہارے تصور میں نہیں آنا چاہتا کہ برداشت نہ کر پاؤں گا۔
س: عیار جی لگتا ہے ناراض ہو گئے آپ؟
ج: آپ کو کیسے لگا۔
س: چلو اچھا ہے ناراض نہیں ہو مجھے لگا پھر منانا پڑے گا گنجے کو؟
ج: یہ گنجا کون ہے؟ وہ تو نہیں جس کے یاد کے دیئے جلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

رمشا احمد ----- لاہور
س: کھو دیتے ہیں ہم اپنا ضبط کچھ اس طرح سے
خاموش تیری محفل سے چلے جاتے ہیں
ج: زمانہ خود بتا دے گا میں کچھ نہیں کہتا
کبھی پردے اٹھاؤ گے میں کچھ نہیں کہتا
س: اداسیاں جب پھیل جائیں سینے میں حد کی صورت
تو محبت کے سلسلے وہاں مشکل سے ہی ملتے ہیں
چاند کے تمنائی اب بھی ہیں بے شک موجود
اس لئے پروانوں کے شیدائی کم ہی ملتے ہیں
ج: محبت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی
کہ جل اٹھتا ہے امجد دل چراغ شام سے پہلے
س: جتنا میں فاصلوں سے بھاگتی تھی
دوریاں اتنی ہی مرے مقدر میں لکھی گئیں
ج: اس سے کیا ہے قدر دانی کا گلہ
ہم نے قدر اپنی کہاں جانی بہت

مہناز فاطمہ ---- خوشاب
س: عینی جی بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلط فہمی پیدا نہیں کی جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اب آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: ہو کیوں جاتی ہے اس بات پر بھی تو غور کرو۔
س: جب کسی کی یاد ستائے تو کیا کرنا چاہیے؟ تجربے کی روشنی میں ثابت کریں؟
ج: اس سے ملنا چاہیے۔
س: اگر کوئی آپ کو سبز باغ دکھانا چاہے تو کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے؟
ج: آپ دکھائیں گے تو۔
س: اکثر میاں روٹیاں جل جاتی ہیں، کیوں؟
ج: کوئی کام ڈھنگ سے کرلیا کرو۔
س: ہمارے حافظ آباد کا گندا نالہ بہت مشہور ہے تو پھر کب آرہے ہیں سیر کرنے کے لئے؟
ج: اب پتہ چلا کہ تمہیں سبز باغ کیوں پسند ہیں اب کوئی تمہیں سبز باغ کھا کر گندے نالے کی سیر کرائے تو یہی حال ہوگا۔
س: سنا ہے مسجد میں سے جوتیاں چرانے میں آپ ماہر تصور کیے جاتے ہیں؟
ج: کیا تم نے مقابلہ کرنا ہے۔

شازیہ ثمن ---- جھنگ

س: وہ خوابوں میں آکر ڈراتی ہے کیا تعبیر ہوگی؟
ج: یہ وارننگ ہے۔
س: میٹھے خربوزے کی کیا نشانی ہے؟
ج: کھانے میں میٹھا ہوگا۔
س: ارمیلا جب پاکستان آئی تو سنا ہے تم نے آٹو گراف کے لئے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے؟
ج: اس لئے کہ دونوں ہاتھوں سے تو وہ تمہیں پیٹ رہی تھی۔
س: رحیم یار خان میں لگے زخموں کے کیا حال ہیں؟
ج: میرے تو معمولی تھے ٹھیک ہو گئے تم ہسپتال سے کب آئے۔
س: کبھی شہد کی مکھیوں کے چھتے پر ہاتھ مارا ہے؟
ج: نہیں تمہارا حال دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی۔
س: کبوتر بلی دیکھ کر اور تم کسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہو؟
ج: اگر میں بھی آنکھیں بند کر لیتا تو تمہیں رحیم یار خان میں بلی سے کیسے چھڑاتا۔

صدف عمران ---- حیدر آباد

س: سچ سچ بتا دوں؟
ج: میں نے کب کہا ہے جھوٹ بولو۔
س: میں آج تک آپ کو سمجھ نہیں پائی؟
ج: آپ کو مجھے سمجھنے کی ضرورت کیوں پڑی۔
س: کوئی درد انو کھا دے گیا؟
ج: کسی معالج سے رجوع کرو۔

نعمانہ لطیف ---- حیدر آباد

س: میں سوچتی ہوں...... بھلا کیا؟
ج: سوچنا بند کرو سمجھ جاؤ گی۔
س: عین غین جی آپ آدمی تو سمجھدار ہیں کہیں کبھی کبھی پھسل جاتے ہیں؟
ج: کہاں پھسل جاتے ہیں۔
س: چلتی کا نام گاڑی اور کھڑی کا نام؟
ج: وہ بھی گاڑی ہی ہوتی ہے ذرا نعمانشی۔
س: بوجھو تو کون ہوں؟
ج: نعمانہ...... بوجھ لیا نا۔

شاہینہ یوسف ---- عمر کوٹ

س: عین غین جی چلو معاف کیا تم بھی کیا کہو گے کس رئیس سے پالا پڑا تھا؟
ج: میں نے تمہاری مج (بھینس) چوری کر لی تھی۔
س: تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبڑ تو؟
ج: یہ جواب دے کر اپنی ہی نبڑ رہا ہوں۔
س: میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے؟

☆☆☆

بلقیس بھٹی

مزاحیہ غزل

تمہارے شہر کا کتا بڑا دیوانہ ہے
میں ایک اینٹ اٹھا لوں اگر برا نہ لگے
اس کے بس میں اگر ہو تو کاٹ ڈالے ہمیں
کہ آس پاس کے لوگوں کو بھی پتا نہ لگے
تمہارے شہر میں آنا عذاب ہے جاناں
کہیں یہ دھکا کہیں فکر کہیں یہ تھانہ لگے
وہ اور بات کہ آئے تھے ذوق و شوق سے ہم
یہاں سے لوٹ کر جانا ہی اب سہانہ لگے
لئے ہی جاتے ہو حساب دوستاں اب تک
ہمارے ضبط کا تم کو بڑا پیمانہ لگے
بس ایک بار نکل جائیں اس شہر سے یوں ہم
کہ تمہیں تو کیا تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہ لگے
پکارا تم نے تو سر کے بل چلے آئے
سوائے اپنے ہمیں ہر کوئی سیانہ لگے
یہ روز روز کی کل کل عذاب ہے اے گل
یوں تیر کمان سے پھینکو کہ صحیح نشانہ لگے

زارا علی، منڈی بہاؤ الدین

شادی

ایک سردار جی کسی سیاسی میٹنگ میں گئے جہاں چند نمائندہ خواتین بھی موجود تھیں، سردار جی نے اپنے ایک دوست سے احتیاطاً پہلے پوچھ لیا تھا کہ عورتوں سے کیسی باتیں کرنی چاہئیں، دوست نے بتایا تھا کہ یہی کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ شادی ہو چکی ہے وغیرہ، اتفاق سے ایک خاتون سردار جی کے پاس بیٹھی، سردار جی نے ان سے پوچھا۔
''آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' خاتون نے جواب دیا۔
''تین۔''
سردار جی نے پوچھا۔
''کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟''

رمشا احمد، لاہور

قطعہ

یادوں کے جھروکوں سے جب جھانکتی ہیں یادیں
کچھ پل کو ہم اب ٹھٹک سے ہی جاتے ہیں
سنا ہے پیچھے مڑ کر دیکھیں تو پتھر سے ہو جاتے ہیں
زخم پرانے جانے کے بعد ہی یاد آتے ہیں

افشاں احمد، ٹوبہ ٹیک سنگھ

تنقید

آرٹسٹ نے اپنے دوست سے شکوہ کیا۔
''تم نے اخبار میں مصوری کے نقاد وارثی صاحب کا تبصرہ پڑھا؟ انہوں نے میری تمام پینٹنگز پر سخت تنقید کی ہے اور ان کی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہے۔''
''تم ان کی تنقید کی بالکل پرواہ مت کرو۔''
دوست نے غمزدہ آرٹسٹ کو تسلی دی۔
''ان کی تو اپنی کوئی رائے ہے ہی نہیں جو ساری دنیا کہہ رہی ہوتی ہے وہی وہ اپنے کالم میں لکھ دیتے ہیں۔''

معکون شاہ، لاہور

بیگم

ایک صاحب ہوٹل میں داخل ہوئے تو سامنے ہی ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھی دکھائی دی، وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی، موصوف نے اس حسین

اتفاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کو اپنی میز پر آنے کی دعوت دی، جسے اس نے منظور کر لیا پھر باتوں باتوں میں وہ ان کے ساتھ رہنے پر بھی آمادہ ہو گئی، ان صاحب نے ہوٹل کے رجسٹر میں اسے اپنی مسز لکھوایا، دوسرے دن جب وہ جانے لگے تو ہوٹل کا بل دیکھ کر چکرا گئے جو بہت زیادہ تھا وہ گرجتے ہوئے بولے۔

''میں تو صرف چوبیس گھنٹے یہاں ٹھہرا ہوں، اتنا زیادہ بل کیسے بن گیا؟''

منیجر نے جواب دیا۔

''آپ کی مسز گزشتہ دو ماہ سے یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔''

علینہ طارق، لاہور

ہمیں تو......

ایک پاپ سنگر کو ایک صاحب نے اپنے گھر گانا سنانے کے لئے بلایا۔

گلوکار نے بڑے اسٹائل سے پوچھا۔

''سب سے پہلے کون سا گانا سناؤں؟''

''کوئی سا بھی گانا سنا دو، ہمیں تو پڑوسیوں سے مکان خالی کروانا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

نازیہ عمر، پشاور

مستقل مزاج

کلرک ایک خاتون سے۔

''محترمہ آپ پچھلے پانچ سال سے ہماری نمائش کا ٹکٹ لیتے وقت اپنی عمر اٹھارہ سال لکھواتی ہیں، کیا وجہ ہے؟''

خاتون۔

''اس لئے کہ میں بات کی پکی ہوں۔''

نائمہ احسن، سرگودھا

تاج محل

''شاہجہان نے تاج محل کی ہر گھڑی کو دیکھا، ہر دروازے ہر جھروکے ہر دیوار ہر دلان کو دیکھا ایک بار نہیں بار بار دیکھا لاتعداد بار دیکھا اور آخر میں لمبی سی ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

''کیا بولا......؟''

''ماں قسم بہت خرچا ہو گیا۔''

لائبہ رضوان، فیصل آباد

عادت

ایک لیڈر کو تقریر کرنے سے پہلے مائیک درست کرنے کی عادت تھی، وہ جہاں بھی تقریر کرنے جاتے مائیک کو ضرور ہاتھ لگا کر درست کرتے، ایک بار الیکشن کے دوران ان کے مخالف نے جہاں ان کو تقریر کرنا تھی، اس مائیک میں کرنٹ چھوڑ دیا، تقریر کرنے کے لئے لیڈر صاحب اسٹیج پر آئے اور حسب عادت جوش میں آ کر مائیک کو درست کرنے کے لئے ہاتھ لگایا تو حاضرین نے سنا انہوں نے کہا۔

''میرے پیارے بھائیو، میری بہنوں؟ ہائے میں مر گیا۔''

مہناز فاطمہ، خوشاب

کلنک کا ٹیکہ

ہمارے ہاں اچھے بھلے بڑی کلاسوں کے طلبہ بھی محاورے کی وہ ٹانگ توڑتے ہیں کہ رہے نام اللہ کا، ایف اے کے ایک پرچے میں ایک طالبہ نے ''کلنک کا ٹیکہ لگنا'' کو بھی انجکشن کی کوئی قسم سمجھا تھا اور اسے کچھ یوں جملے میں استعمال کیا۔

''ہمارے محلے میں سب نے کلنک کے ٹیکے لگوائے میں گھر پر نہ تھی اس لئے نہ لگوا سکی۔''

(امجد اسلام امجد کے سفر نامے ''ریشم ریشم'' سے اقتباس)

شازیہ ثمن، جھنگ

کاروبار

ایک فقیر نے ایک راہ گیر کے آگے ہاتھ پھیلایا تو اس آدمی نے کہا۔

''معاف کرو۔''

فقیر نے حسب عادت پھر سے سوال کیا تو آدمی نے کہا۔

''میرے پاس ریزگاری نہیں ہے واپسی پر لے لینا۔''

فقیر نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔

''ادھار کے اس کاروبار میں میرے لاکھوں ڈوب گئے ہیں۔''

نعیمہ رانا، ملتان

بہت خوب

پارٹی میں ایک خاتون دوسری خاتون کو بتا رہی تھی۔

''میرے باس نے مجھے ہیرے کی انگوٹھی تحفے میں دی ہے بغیر لالچ کے۔''

''بہت خوب۔'' دوسری خاتون نے کہا۔

''میرے باس نے مجھے ڈیفنس میں بنگلہ بھی لے کر دیا ہے اور وہ بھی بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔'' پہلی خاتون نے مزید بتایا۔

''بہت خوب...... بہت خوب!'' دوسری خاتون نے کہا۔

''انہوں نے مجھے ایک ہنڈا اکارڈ اور ڈرائیور بھی دیا ہے اور وہ بھی بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔''

''بہت خوب بھئی بہت خوب۔'' دوسری خاتون نے سر ہلا دیا۔

تب پہلی خاتون نے پوچھا۔

''اور تم سناؤ آج کل کیا کر رہی ہو؟''

''میں آج کل تمیز اور شائستگی سکھانے والی کلاس اٹینڈ کر رہی ہوں، وہاں سب سے پہلے یہ سکھایا جاتا ہے کہ جب آپ کسی سے کہنا چاہیں کہ کیوں بے پر کی چھوڑ رہی ہو، تو اس کی جگہ ''بہت خوب، بہت خوب'' کہنا چاہیے۔'' دوسری خاتون نے کہا۔

رضوانہ علی، ساہیوال

جواب

''آپ کا بچہ حساب میں کمزور ہے میں نے کل اس سے پوچھا کہ تین انڈے حسن کو چار انڈے اکرم کو اور پانچ انڈے تمہیں دوں تو بتاؤ میں نے کل کتنے انڈے دیئے؟''

آپ کے بچے نے جواب دینے کے بجائے شرماتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر آپ انڈے نہیں دے سکتے۔''

ثوبیہ احمد، قصور

فیصلہ

شیر خوار اور گھٹنوں کے بل چلنے والے بچے نے پہلے لیمپ توڑا، پھر ایش ٹرے ٹی ٹرالی کے شیشے پر دے ماری، نوجوان ماں نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے غصے سے کہا۔

''بس...... ہو گیا فیصلہ تم اس گھر کے پہلے اور آخری بچے رہو گے۔''

زاہدہ افضل، کراچی

ماموں

ناکام محبت کا ہر اک دکھ سہنا
ہر حال میں انجام سے ڈرتے رہنا
قدرت کا بڑا انتقام ہے جیدی
محبوبہ کی اولاد کا ماموں کہنا

عفرا ثاقب، جہلم

☆☆☆

تسنیم طاہر

سہیلہ خان ---- جھنگ

جو وقت گزرے تو سینے پہ بوجھ بن جائے
کچھ اس کا حال بھی اس قرض بے طلب کا تھا
خود اس کے گھر کی ہی دیوار گر پڑی اس پر
یہ فن آج ہوا ہے مرا تو کب کا تھا

....

کھلائے رکھنا امید گلشن یونہی ہمیشہ
اداس چہرے پہ زندگی کا جمال رکھنا
مٹا نہ دینا ہجوم غم میں نشان منزل
جنوں سفر میں نمو کی خواہش بحال رکھنا

....

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھ سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

عالی ناز ---- گوجرانوالہ

دھیما دھیما خوش ادا خاموش سا اچھا لگا
پہلی ہی نظر میں وہ شخص جانے کیوں اچھا لگا
حلقہ احباب میں سب سے الگ سب سے جدا
گہری گہری سوچ میں کھویا ہوا اچھا لگا

....

اس سے کب ہم نے ملاقات کا وعدہ چاہا
دور رہ کر تو اسے اور زیادہ چاہا
یاد آیا ہے وہ کچھ اور بھی شدت سے ہمیں
بھول جانے کا اسے جب بھی ارادہ چاہا

....

کبھی تو کرے گا وہ شخص وفا آخر
کبھی تو ختم ہو گی اپنی یہ سزا آخر
میرے گھر کی دیوار پر یہ کون لکھ گیا؟
کب تک جیو گی تم میرے سوا آخر؟

....

جنہیں عزیز انا تھی جو شہر چھوڑ گئے
وہ لوٹ آئیں مگر کس طرح کوئی صورت
چھپائے پھرتے ہیں کتنی کہانیاں ہم بھی
تجھے سنائیں مگر کس طرح کوئی صورت

رمشا احمد ---- لاہور

میری آنکھوں کے خواب بن کر تم
کھو جانا سراب بن کر تم
میری سانسوں میں تیری خوشبو ہو
مجھ میں رہنا گلاب بن کر تم

....

میں بھی دیکھوں گا تمہاری زندگی کا ہر ورق
تم کبھی میرے روز و شب کا ہر شمارہ دیکھنا

....

جب تک نہ اس کو چاہا گم نام ہی رہا
اک شخص میرے نام سے مقبول ہو گیا

عالیہ بٹ ---- چنیوٹ

میری محبتیں میرے سلام تیرے نام
میری نگاہوں کے سب احترام تیرے نام
دیکھوں تجھے تو میری رات کا سویرا ہو
میری حیات کی ہر صبح و شام تیرے نام

....

کبھی جو شوخ آنچل سے تمنا جگمگائی ہے
تصور میں تجھے پا کر یہ دنیا بھول جاتی ہے
محبت کے سنہرے خواب دیکھے جب کوئی راہی
یہ چھٹکی چاندنی اکثر ترے سناتی ہے

....

میں چند دن روؤں گی رو کر چپ کر جاؤں گی
تیری بے وفائی کے درد کو بھول جاؤں گی
دستور زمانہ کارساز قدرت ہی ہے

چند دن یاد رکھوں گی پھر بھول جاؤں گی
حنا ناز ---- پنڈ دادنخان

تو مرے قریب رہا تیرا نشاں نہ ملا
دور سے سارے نشاں تیرے ملے

....

کہتے ہیں جب کوئی پیار کرے تو نیند اڑ جاتی ہے
کوئی ہم سے پیار کرے ہمیں نیند بہت آتی ہے

....

میں جب دیکھوں جدھر دیکھوں تجھے دیکھوں
تو میری آنکھ کی پتلی پہ یوں تحریر ہو جائے
عاتکہ نظام الدین ---- لیہ

جہاں بھی جانا آنکھوں میں خواب بھر لانا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اداس کر لانا
میں صرف برف رتوں میں چلا تو اس نے کہا
پلٹ کر آنا تو کشتی میں دھوپ بھر لانا

....

ہم نے غم سہے ہیں اوروں سے اس قدر
کہ اب زندگی خود سہارا تلاش کرتی ہے
خود ہی چھوڑ دیا دوستوں کو ہم نے
لیکن نہ جانے کیوں نظر پھر ملنے کی آس کرتی ہے

....

کتنی عام سی بات ہے لیکن اتنی عام سی بات نہیں
سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں میرا حصہ کھو جاتا ہے
روما تنویر ---- شیخوپورہ

اک ستارہ ٹوٹ کے بکھرا خلاؤں میں کہیں
اک مسافر کھو گیا ہے راستوں کے درمیاں
یا تو ہیں میرے تعاقب میں میرے ہی وسوسے
یا فقط پاگل ہوا ہے راستوں کے درمیاں

....

زرد پتے شاخ سے گرتے ہیں جب روتے ہوئے
سوچتا ہوں کتنی آرزوؤں کا مدفن ہے ہوا
کھل گئے ہیں جھونکے سے کئی چہروں کے پھول
آج کی شب چاند نکلا ہے روشن ہے ہوا

....

ہر طرف آپ کی یادوں کے لگا کر پہرے
جی کڑا کر کے میں بیٹھا تھا کہ مت یاد آئے
ناگہاں کسی بات پہ دل ایسا دکھا
میں بہت رویا مجھے آپ یاد آئے
اُم حاجرہ ---- لاہور

کتنا کم ظرف ہے وہ شخص
اپنے فن پہ جسے غرور ہوتا ہے
کوئی کتنا ہی فن میں ماہر ہو
وہ ناقص ضرور ہوتا ہے

....

جب کبھی خود کو سمجھاؤں کہ تو میرا نہیں
دل میں کوئی چیخ اٹھتا ہے نہیں ایسا نہیں
کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

....

اگر ہم فیصلہ کر لیں کہیں سے کوچ کرنے کا
تو پھر واپس مہاروں کو کبھی موڑا نہیں کرتے
ہمیں معلوم ہے ہر جیت بالآخر ہماری ہے
سو ہم وقتی شکستوں پر دل چھوٹا نہیں کرتے
علینہ طارق ---- لاہور

بجا کہ آنکھ میں نیندوں کے سلسلے بھی نہیں
شکستِ خواب کے اب مجھ میں حوصلے بھی نہیں
خفا اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اب کے
وہ برہمی ہے کہ ہم سے انہیں گلے بھی نہیں

....

ہر ایک بچھڑ کے خوش تھا چلو جان بچ گئی
یہ اپنے عہد اپنی وفا کا زوال تھا

....

آنکھوں میں آ کے بیٹھ گئی آنسوؤں کی لہر
پلکوں پہ کوئی خواب پرونے نہیں دیا
دل کو تمہارے نام کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا
نازیہ عمر ---- پشاور

وہ قیامتیں جو گزر گئیں

تمہیں امانتیں کئی سال کی
ہے منیر تیری نگاہ میں
کوئی بات گہرے ملال کی

....

زندگی میں ساتھ دینا تو نہیں کرتے پسند
دم نکل جائے تو کندھے پر اٹھا لیتے ہیں لوگ

....

چپ چپ گم صم رہنے والے
اپنے آپ سے جنگ کرتے ہیں
سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا
پچھتاوے پھر تنگ کرتے ہیں

فرح احسن ---- سرگودھا

دنیا تو کیا خود سے بھی کرتے رہے گریز
جب تک ملے کسی سے کسی سے نہیں ملے
جو بے طلب تھا اس کی ہمیں جستجو رہی
جو ملنا چاہتا تھا اسی سے نہیں ملے

....

خالی ہیں دل فقیر کے کشکول کی طرح
اس شہر بے وفا سے وفا کون لے گیا

....

جیسے غموں کے ہم ہو گئے عادی سے
مگر تجھ سے بھی ہو تو خود سے لڑنے لگتے ہیں
ساتھ ساتھ چلنا ہے بسنا اور اجڑنا بھی
بسنے ہم نہیں پاتے اور اجڑنے لگتے ہیں

فرحت نعیم ---- لاہور

بھول جانے کا تو بس ایک بہانہ ہو گا
کہ بہر طور اسے یاد تو آنا ہو گا
بند مٹھی سے جو اڑ جاتی ہے قسمت کی پری
اس ہتھیلی میں کوئی چھید پرانا ہو گا

....

نیند میری چھین کر ادائے دلبری سے
وعدہ وہ کر رہے ہیں آنے کا خواب میں

....

پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو پھر اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیست آسان ہو بھی سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہت کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا

لائبہ رضوان ---- فیصل آباد

اس کو الفاظ کا ادراک بھی ہو سکتا ہے
اس لئے جناب وہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے
تم جسے غم کے سمندر میں ڈبوتے ہو چلے
وہ اچھا سا تیرا اک بھی ہو سکتا ہے

....

کہنے کو اس سے عشق کی تفسیر ہے بہت
پڑھ لے تو صرف آنکھ کی تحریر ہے بہت
بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سوچتی رہی
خاموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

....

تمام رشتوں کو میں گھر پہ چھوڑ آیا تھا
پھر اس کے بعد کوئی اجنبی نہ ملا
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا پھر بھی کہیں نہ ملا

مہناز فاطمہ ---- خوشاب

تیری یاد میں مصرع کوئی لکھنے بیٹھا
میں نے کاغذ پر بھی چھالوں کا گلستاں دیکھا
تو نے دیکھا ہے منڈیروں پہ چراغوں کو فقط
میں نے جلتا ہوا ہر دور میں انساں دیکھا

....

ہم کو معلوم ہے کیا دست حنائی دے گا
کرب بوئیں گے تو وہ فصل جدائی دے گا
آنکھ نیلم کی بدن کانچ کا دل پتھر کا
اپنے شہکار کو کون اتنی صفائی دے گا

....

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں کا کانٹا نکال دیتا ہوں

☆☆☆

بھنی ہوئی لوکی

اشیاء

لوکی	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا پاؤ
ہلدی	چائے کا آدھا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
گرم مصالحہ	چائے کا ڈیڑھ چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
کوکنگ آئل	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد

ترکیب

لوکی چھیل کر اس کے قتلے کاٹ لیں، ایک دیگچی میں کوکنگ آئل ڈالیں، اب اس میں پیاز ڈال کر بادامی رنگ کا کرلیں، پھر اس میں باقی سب مسالے ڈال کر بھونیں، پانی کا چھینٹا دے کر بھونتے جائیں، مسالا اچھی طرح بھون جائے تو اس میں لوکی ڈال دیں، اوپر سے ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں اور دو چمچے پانی ڈال کر دم پر رکھ دیں، جب لوکی گل جائے تو اسے بھونیں اب اس میں پسا ہوا گرم مسالا اور ہرا دھنیا ڈال دیں اور اتار لیں۔

بیسن میں تلے ہوئے بینگن

اشیاء

بینگن لمبے	ایک پاؤ
بیسن	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
اجوائن	ایک تولہ
سوڈا	ایک چٹکی
کوکنگ آئل	تلنے کے لئے

ترکیب

بینگن بمع چھلکے لمبے اور پتلے پتلے کاٹ لیں اور ان میں نمک مل کر رکھ دیں، بیسن میں سوڈا، نمک، سرخ مرچ ڈال کر اچھی طرح گھول دیں، (بیسن اتنا پتلا ہونا چاہیے کہ بینگن پر اچھی طرح لگ جائے) اب بینگن دھولیں اور خشک ہونے کے بعد اجوائن ادھ پسا کر کے ہر ٹکڑے پر ذرا ذرا سا لگا دیں۔

فرائی پین میں کوکنگ آئل گرم کریں، اب بینگن بیسن میں ڈبو ڈبو کر تلتی جائیں گرم گرم کھانے کے لئے پیش کریں۔

آلو اور دھنیا

اشیاء

آلو	آدھا کلو
پیاز	آدھا پاؤ
ٹماٹر	آدھا پاؤ
ادرک	آدھی چھٹانک
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	حسب ذائقہ
سبز مرچ	چھ عدد
ہرا دھنیا	چار بڑی گٹھی
کوکنگ آئل	ایک کپ

ترکیب

آلو چھیل کر کاٹ لیں چھوٹے ٹکڑے کر لیں، ٹماٹر دھو کر کاٹ لیں، پیاز لچھے دار کاٹ لیں اور دھنیا صاف کر کے دھو کر باریک باریک کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں کوکنگ آئل ڈالیں گرم ہونے پر پیاز ڈالیں، جب پیاز بادامی رنگ کے ہو جائے تو آلو ڈال کر بھونیں تھوڑا بھوننے کے بعد ادرک اور ٹماٹر ڈال دیں ساتھ ہی نمک اور سرخ مرچ ڈال دیں پانچ منٹ بھونیں، اب ہرا دھنیا ڈال دیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر پکنے دیں، جب دھنیا اور آلو گل جائیں تو ہری مرچ ڈال کر اتار لیں اور اس میں پانی کا شوربا نہیں رہنا چاہیے۔

کریلے اور پیاز

اشیاء

کریلے	آدھا کلو
پیاز	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
کوکنگ آئل	ڈیڑھ کپ

ترکیب

کریلے اچھی طرح چھیل لیں اور بیج نکال کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، اب ان کو نمک لگا کر ایک گھنٹے تک رکھ دیں، ایک گھنٹے کے بعد ان کو خوب مل مل کر دھو لیں اور پانی اچھی طرح نچوڑ لیں۔

ایک دیگچی میں حسب ضرورت کوکنگ آئل گرم کریں اب اس میں آدھا پاؤ پیاز ڈال کر سرخ کریں اور نمک مرچ ہلدی ڈال کر مسالے کی طرح تیار کریں، اب ایک فرائی پین میں بقیہ کوکنگ آئل ڈال کر کریلے اس میں تل لیں، سرخ ہونے پر کوکنگ آئل کے ساتھ ہی تیار مسالے میں ڈال دیں اور اس میں باقی پیاز لچھے دار کاٹ کر ڈال دیں، ٹماٹر بھی ساتھ ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دم پر لگا دیں، جب پیاز گل جائے تو اتار لیں خیال رہے کہ پیاز کا پانی خشک ہو جائے، اگر پانی رہ جائے گا تو ذائقہ ٹھیک نہیں ہو گا۔

پالک پنیر

اشیاء

کاٹیج چیز کیوبز بنالیں	ایک پیکٹ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن باریک کٹے ہوئے	چار عدد
پالک	آدھا کلو
دودھ	ایک پیالی
ہری مرچ	چار عدد
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

پالک کو اچھی طرح سے دھو کر اپنے ہی پانی میں ابال لیں، جب پانی خشک ہو جائے تو بلینڈر میں پیس لیں، ایک دیگچی میں آدھا مکھن ڈال کر گرم کریں پھر لہسن کے جوے ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں، جب گولڈن براؤن ہو جائے تو پالک اور نمک ڈال کر ہلکا سا بھون کر دودھ ڈال دیں، پکنے دیں، جب خشک ہو جائے تو بھون لیں، فرائنگ پین میں مکھن ڈال کر گرم کریں پھر پنیر کے کیوبز مکھن میں فرائی کر کے پالک میں ڈال دیں اس کے بعد کالی مرچ ڈال کر پانچ منٹ کے لئے دم پر رکھ دیں۔

سبزیوں کی جالفریزی

اشیاء

آلو چپس کی طرح کاٹ لیں	دو عدد
گاجر کاٹ لیں گول	دو عدد
پیاز پرت الگ کرلیں	دو ڈلی
ادرک باریک کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ کٹی ہوئی	تین عدد
ثابت لال مرچ	تین سے چار عدد
ٹماٹو ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھی پیالی
بند گوبھی	ایک پھول
شملہ مرچ کیوبز بنالیں	تین عدد
مٹر چھیلے ہوئے	ایک پیالی
ہرا دھنیا کٹا ہوا	ایک گٹھی
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹو پیسٹ	دو کھانے کے چمچ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب

سب سے پہلے ایک دیگچی میں لال مرچ اور تیل ڈال کر ہلکا سا گرم کرلیں دو منٹ بعد گاجر، مٹر، بند گوبھی اور پیاز ال کر اسٹر فرائی کر لیں پھر ادرک، نمک، ہری مرچ اور کالی مرچ ڈال دیں، آلو الگ فرائنگ پین میں چپس کی طرح ڈیپ فرائی کرلیں جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو دیگچی میں سبزیوں کے اوپر پھیلا کر ڈال دیں اس کے اوپر سرکہ، ٹماٹو پیسٹ، ٹماٹو ساس اور زیرہ ڈال کر دس منٹ کے لئے ہلکی آنچ میں دم پر رکھ دیں، ہرا دھنیا ڈال کر گرم گرم چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

پنیر کے کباب

اشیاء

کاٹیج چیز	ایک پیکٹ
ڈبل روٹی کا چورا	ایک پیکٹ
ہری مرچ کٹی ہوئی	چار عدد
بادام باریک چھل لیں	پندرہ عدد
ہری پیاز پتوں سمیت	دو عدد
چکن کیوب ملا ہو میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن باریک کٹے ہوئے	چار عدد جوئے
ڈبل روٹی کے سلائس	چھ عدد
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا کٹا ہوا	ایک گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
انڈے	دو عدد
ادرک باریک کٹی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچہ

ترکیب

سب سے پہلے چیز کدوکش کرلیں، سلائس کے چاروں کنارے، کاٹ کر درمیانی حصہ باریک چورا کر کے چیز میں ملا دیں پھر سارے مصالحہ جات اچھی طرح ملا کر گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں، ڈبل روٹی کا چورا بھی ملا دیں پھر چھوٹے چھوٹے گول کباب بنا کر انڈے میں ڈبو کر ہلکی آنچ میں ڈیپ فرائی کرلیں جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال کر اخبار پر پھیلا دیں اور چٹکی بھر بیسن چھڑک دیں، گرم گرم ٹماٹو ساس کے ساتھ پیش کریں۔

پورن پوری

پوری کے لئے اشیاء

میدہ	ایک پیالی
تازہ دودھ	ایک پیالی
بادام باریک کاٹ لیں	بیس عدد
ناریل کا پاؤڈر	ایک پیالی
کشمش	ایک پیالی
سوجی	ایک پیالی
گھی، تیل	ایک پیالی

پستے باریک کاٹ لیں — بیس عدد
چینی — ایک پیالی
تلنے کے لئے تیل — حسب ضرورت

ترکیب

سب سے پہلے ایک بڑے پیالے میں دودھ اور سوجی بھگو کر رکھ دیں، جب سوجی دودھ میں اچھی طرح بھیگ جائے تو میدہ چھان کر سوجی میں ملا دیں گھی ملا کر آہستہ آہستہ سخت میدہ گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں، ایک دیگچی میں ایک کھانے کا چمچہ گھی ڈال کر پستے بادام مل کر نکال لیں، آدھے گھنٹے بعد تلے ہوئے بادام پستے میں ناریل پاؤڈر کشمش اور چینی ملا دیں، اب تیار کیا میدہ لے کر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لیں ایک ایک پیڑا لے کر پوری کی طرح بیل لیں، درمیان میں میوہ رکھ کر ڈی کی شکل میں بند کر کے کناروں کو سجا دیں، ساری ایک ساتھ بنا کر رکھ لیں، ان کے اوپر ایک ململ کا کپڑا گیلا کر کے پھیلا دیں، ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں جب تیل گرم ہو جائے تو آنچ ہلکی کر کے پوریاں تلنا شروع کریں اسٹیل کا چمچہ چلاتے رہیں، جب گولڈن ہو جائیں تو نکال کر چھلنی میں اخبار بچھا کر رکھتے جائیں تاکہ چکنائی جذب ہو جائے۔

آلو کی سبزی

اشیاء

آلو چھلکا اتار کر بھرتہ بنالیں — آدھا کلو
ہری مرچ باریک کٹی ہوئی — چھ عدد
چینی — ایک چائے کا چمچ
ہلدی — ایک چائے کا چمچ
رائی پسی ہوئی — ایک چائے کا چمچ
کڑی پتا — چند پتے
لیموں — دو عدد
پیاز باریک کٹی ہوئی — دو ڈلی
کلونجی — آدھا چائے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی — آدھا کھانے کا چمچ
سفید زیرہ — ایک چائے کا چمچ
نمک — حسب ذائقہ
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا — ایک گٹھی
املی کا رس — آدھی پیالی
تیل — آدھی پیالی

ترکیب

آلو کے بھرتے میں ایک گلاس پانی ملا کر دال کی طرح پتلا کر لیں پھر اوپر دی گئی ساری اشیاء ملائیں تیل بھی ڈال دیں، اچھی طرح ملا کر پندرہ منٹ کے لئے پکا کر اتار لیں، مزیدار آلو کی سبزی تیار ہے، گرم گرم پوری کے ساتھ پیش کریں۔

آلو چنے کی چاٹ

اشیاء

آلو ابال لیں چوکور — آدھا کلو
سفید کالی چنے بھگو دیں — آدھا کلو
ٹماٹر باریک کٹے ہوئے — چار عدد
پودینہ باریک کٹا ہوا — آدھی گٹھی

ترکیب

بھیگے ہوئے چنوں کا پانی پھینک دیں، دوبارہ پانی ڈال کر مسور کی دال ڈال کر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں، جب چنے ذرا گل جائیں تو سوڈا ڈال دیں، مسور کی دال زیادہ دیر تک پکنے کی وجہ سے چنوں میں گریوی بہت اچھی بن جاتی ہے، جب چنے اور دال اچھی طرح مکس ہو جائیں تو تھوڑا زیرہ، سونٹھ اور نمک ڈال کر اچھی طرح ملائیں، جب پیش کرنا ہو تو مصالحہ، چاٹ مصالحہ، آلو، ٹماٹر، پیاز لیموں اور کھٹی میٹھی چٹنی الگ الگ رکھ کر پیش کریں۔

☆☆☆

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

اپریل کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے فکر وعمل کی بہترین صلاحیتیں عطا کی ہیں، علم وحکمت کی تعلیم کے ذریعے اس کے شعور وآگاہی کو وسعت دی ہے، اس کی زندگی کے کچھ فرائض ومقاصد ہیں، انسانی زندگی مقاصد کے تعین، اہداف کے لیے جہد مسلسل اور ان کے حصول سے تعبیر کی جاتی ہے، اگر انسانی زندگی سے مقصد کو خارج کردیا جائے تو زندگی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے اور خود وہ فرد جس کی زندگی کا کوئی مقصد تعین نہ ہو، کار فضول کی مانند ہوکر رہ جاتا ہے۔

اپنی زندگی کے مقصد کا تعین کریں، اگر آپ کے دل میں کامیابی کے حصول کی تمنا ہے تو اپنی تمام تر فکری وجسمانی صلاحیتوں اور میسر مادی وسائل کو اپنی عملی جہتوں میں اللہ کی راہ میں بھرپور استعمال کریں، زندگی سے آپ کو وہی کچھ ملتا ہے جس کا آپ کو یقین ہوتا ہے۔

ہر کامیابی اور ناکامی کی ذمہ داری آپ پر ہی عائد ہوتی ہے بس اپنی ذات میں یقین کی قوت پیدا کیجیے، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عمل کرنا شروع کریں، تندہی سے، اعتماد سے، بلاخوف ہو کر مخلصانہ کوشش کریں اس ایمان ویقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہے۔

خوش رہیں، خوش رکھیں اپنا بہت سا خیال رکھیئے گا اور ان کا بھی جو آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کا خیال رکھتے ہیں۔

چلئے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں ہمیشہ کی طرح درود پاک، استغفار اور تیسرے کلمے کا ورد کرتے ہوئے۔

لیجئے یہ پہلا خط ہمیں نوشین حیدر کا پنڈی بھٹیاں سے موصول ہوا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح سے کررہی ہے۔

اس مرتبہ حنا کا شمارہ جلد موصول ہوگیا اللہ کرے یہ سلسلہ قائم رہے آمین، سب سے پہلے مدیر اعلیٰ کی باتیں پڑھیں ہمیشہ کی طرح موجودہ صورت کے عین مطابق تھیں، حمد ونعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں ایمان افروز تھیں، کیا بات ہے آپی مصنفین کے ساتھ دن گزارنا کیوں بند کردیا آپ نے؟ خیر آگے بڑھے اور نایاب جیلانی کے ناول کی دوسری قسط پڑھی ناول بہترین ہے ابھی تو ابتداء ہے انشاء اللہ آگے چل کر یہ دلچسپ ہوتا جائے گا، حنا میں نایاب جیلانی کا نام بہترین اضافہ ہے جبکہ سدرۃ المنتہیٰ کے سلسلے وار ناول میں بھی اس مرتبہ نئے واقعات کو سامنے لے کر آیا بہت سے الجھے واقعات سمجھ میں آنے لگے ہیں شکریہ سدرۃ المنتہیٰ اچھی تحریر قارئین کو دینے کا۔

مکمل ناول میں فرحت عمران کا ''بہار رت آئی'' بے حد پسند آیا، فرحت نے شروع سے آخر تک کہانی پر اپنی گرفت رکھی ہر کردار کے ساتھ

انصاف کیا جبکہ دوسرا مکمل ناول "چاہت کے رنگ" قرۃ العین رائے کے ناول کی دوسری آخری قسط شائع کی گئی، بائینڈنگ کی غلطی سے کہانی کا مزہ تھوڑا خراب ہوا، ہمیشہ کی طرح قرۃ العین رائے کی تحریر بہترین رہی، ناولٹ میں فرحت شوکت کا "رہا جو تیرا ہو کر" کوئی خاص متاثر نہیں کر رہا، اس پر فرحت کے ناولٹ کے صفحات بھی انتہائی کم ہوتے ہیں۔

افسانوں میں سب سے بہترین افسانے عظمیٰ شاہین رفیق اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے تھے، عظمیٰ شاہین آپ کے افسانے کے اینڈ نے ہمیں بے حد متاثر کیا بہت خوبصورت پیراگراف تھا آخر والا پڑھ کر آنکھیں بے ساختہ بھیگ گئی۔

سمیرا عثمان گل کا افسانہ "ایسا بھی ہوتا ہے" پڑھ کر نہ جانے کیوں لگا کہ یہ تحریر ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں پلیز سمیرا آپی ہماری یہ کنفیوژن دور کیجئے، ثمینہ رسول کا افسانہ "ابھی رسم وفا باقی ہے" پسند نہیں آیا نہ جانے محترمہ کیا لکھنے کی کوشش کر رہی تھیں، "بنت حوا" عابی ناز کا افسانہ تھا اس کو پڑھ کر دکھ بھی ہوا معاشرے کی بے حسی پر اور مصنفہ پر غصہ بھی آیا، وہ اس کے لئے کہ ایسی کہانیاں ہم روز ہی ٹی وی پر مختلف ناموں کے پروگرام میں دیکھتے ہیں، ہر روز اخبار میں ایسا ایک واقعہ ضرور ہوتا تو کیا ضروری ہے کہ ڈائجسٹ میں بھی ایسی سٹوری شائع کی جائے، پلیز عابی ناز صاحبہ آپ یہ مت سمجھئے گا کہ میں کوئی بے حس لڑکی ہوں نہیں ایسا ہرگز نہیں سوچ تو صرف یہ ہے کہ ایسے وقت جب ہمارے اپنے بے شمار مسائل ہیں ہم ان سے عارضی نجات حاصل کرنے کے لئے رسالوں کی دنیا میں پناہ لیں تو وہاں بھی ہمیں ڈپریشن میں مبتلا کر دینے والی تحریریں پڑھنے کو ملیں، پلیز اپنی تحریروں کو ہلکا پھلکا ہی رہنے دیں اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف تو رنگ حنا، حاصل مطالعہ، میری ڈائری سے بیاض، حنا کی محفل اور نامے تمام کے تمام سلسلے بہترین تھے۔

نوشین حیدر کیسی ہو ڈیئر؟ کافی عرصہ بعد آپ اس محفل میں آئیں، مارچ کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی تعریف اور تنقید دونوں ہمارے لئے اہم ہیں، عابی ناز کی تحریر کے بارے آپ کی رائے مصنفہ تک پہنچائی جا رہی ہے، عابی ناز کی یہ واحد تحریر تھی جس کو شائع کرنے سے پہلے ہم بھی شش و پنج میں تھے کافی عرصے تک اس کو نظر انداز کیا، لیکن پھر شائع کر دی یہ سوچ کر قارئین کے علم میں ہونا چاہیے کہ عابی صرف شوخ وشنگ تحریر ہی نہیں بلکہ حساس موضوع کو بھی اتنی خوبصورتی سے لکھ سکتی ہیں مارچ کے حنا کو پسند کرنے کا ایک مرتبہ پھر شکریہ، آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

افراح شاہ زیب: ننکانہ سے لکھتی ہیں۔

میں پہلی مرتبہ حنا کی اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں، موسم بہار کی مناسبت سے سرورق اس مرتبہ پسند آیا، سب سے پہلے اسلامیات والا حصہ پڑھا پھر آگے بڑھے اور نئے سلسلے وار ناول "پربت کے اس پار کہیں" میں جا پہنچے، ویل ڈن نایاب جیلانی جی آپ دوسری قسط میں ہی چھا گئی ہیں، آپ حالات و واقعات اور منظر کشی اتنی خوبصورتی سے بیان کر رہی ہیں کہ میں خود کو اس ماحول میں پاتی ہوں، ماشاء اللہ بہت خوبصورت انداز ہے آپ کے لکھنے کا، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے، اس کے بعد باقی سب کو نظر انداز کرتے "چاہت کے رنگ" دوسرے اور آخری حصے کو پڑھنا شروع کیا، قرۃ العین رائے نے حسب توقع وہی اینڈ کیا جو ہم نے سوچا تھا، قرۃ

العین آپ نے اچھا لکھا، فرحت عمران کی تحریر "بہار رت آئی" ان کی تحریر بس سو سو تھی، فرحت عمران کافی عرصے سے لکھ رہی ہیں (فوزیہ آپی نے بتایا تھا کہ پہلے متعاہل تناوش کے نام سے لکھتی تھیں) لیکن تب سے لے کر اب تک ان کی تحریروں میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی، اکثر وہ کہانی کا آغاز تو بہت اچھا کرتی ہیں مگر پھر بلاوجہ کے لمبے لمبے مکالمے لکھ لکھ کر کہانی کو یکسانیت کا شکار کر دیتی ہیں، پلیز اس طرف توجہ دیں، فرحت شوکت کی تحریر "رہا جو تیرا ہو کر" بھی کوئی خاص متاثر نہیں کر رہی پا رہی نہ جانے کیوں فرحت شوکت کی تحریر الجھی سی ادھوری سی محسوس ہوتی ہے فرحت شوکت کا انداز تحریر بڑا چاشنی بھرا ہوتا ہے پڑھ کر لطف آتا ہے مگر اس بار انتہائی روکھا پھیکا سا ہے جیسے وہ یہ تحریر نہ چاہتے ہوئے لکھ رہی ہو پلیز فرحت اپنا پہلے والا انداز برقرار رکھیں، "اک جہاں اور ہے" جی سدرۃ المنتہیٰ کی بے حد اچھی تحریر ہر قسط میں وہ اتنی محنت اور لگن سے لکھ رہی ہیں پڑھ کر لطف آجاتا ہے تمام بکھرے کرداروں کو اب انہوں نے اک لڑی میں پرونا شروع کر دیا ہے بلاشبہ مختلف واقعات سے سجی یہ تحریر کسی اور جہاں کی سیر کرا رہی ہے سدرۃ المنتہیٰ اتنی اچھی تحریر لکھنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد۔

اب بات کروں گی میں اس تحریر کی جس کی وجہ سے میں نے اس محفل میں شرکت کی وہ تحریر ہے عظمیٰ شاہین کی سانحہ پشاور کے پس منظر پر لکھی گئی یہ تحریر ایک مرتبہ پھر خون کے آنسو رلا گئی اس تحریر کو پڑھ کر شہید ہونے والے معصوم بچوں کا دکھ پھر تازہ ہو گیا، شاہین اتنی اچھی تحریر لکھ کر آپ نے ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا، حنا میں اس سے پہلے بھی دو ایک تحریر آپ کی نظروں سے گزری ہے مگر یہ تحریر تو آپ نے کمال لکھی، آپ نے اس سانحہ پشاور کے موضوع پر دوسری تحریر قرۃ العین خرم ہاشمی کی تھی، قرۃ العین نے بھی بے حد متاثر کن لکھا دعا گو ہیں کہ اللہ پاک ان شہیدوں کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام سے نوازے اور ان کے لواحقین کو صبر عطا کرے آمین، روشانے عبدالقیوم نے بھی اپنی کوشش کی جبکہ باقی افسانے بھی اچھے تھے، مستقل سلسلے بھی بہترین رہے، قیامت کے یہ نامے میں حسب عادت فوزیہ آپی محبتیں بانٹتی ملیں۔

افراح شاہ زیب خوش آمدید، اتنے پیارے سے نام والی گڑیا نے اس محفل کو رونق بخشی ہمیں بے حد اچھا لگا مارچ کے شمارے کے لئے پسندیدگی کا شکریہ، عظمیٰ شاہین کے افسانے کے پسندیدگی کا اظہار بے شمار قارئین نے کیا عظمیٰ شاہین اور قرۃ العین ہاشمی تک آپ کے جذبات پہنچائے جا رہے ہیں۔

اس محفل میں آتی رہیے گا ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ

عابی ناز: گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں۔

مارچ کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل سے سجا پانچ تاریخ کو ہی مل گیا، قدرے مایوسی کے ساتھ موصولی کر کے میں نے سوچا میری کہانی تو اس بار بھی نہیں لگی ہوگی، لیکن پھر فوزیہ آپی کی بات یاد آئی انہوں نے کہا تھا شاید مارچ میں آپ کی کہانی شائع ہو جائے اسی ہلکی سی امید کی کرن کو تھامے میں نے ریپر کھولا اور جلدی سے فہرست پر نظر دوڑائی تو اچھل ہی پڑی، فوزیہ آپی کی بات پوری ہوئی، میری کہانی لگ چکی تھی، ایک نظر اپنی تحریر پر دوڑاتے ہوئے ہم نے پورا ڈائجسٹ کھنگال مارا، قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ وہیں کچن میں بیٹھے بیٹھے ہی نمٹا ڈالا، سانحہ پشاور پر

لکھی گئی ایک خوبصورت اور پُر اثر تحریر اور اسی موضوع پر لکھی گئی عظمیٰ شاہین کی سٹوری ''تمہیں بھول نہ پائیں گے ہم'' دونوں ہی اپنے اپنے انداز پر لکھی گئی تھیں سبق آموز اور بہت سے دکھ سناتی بڑے اچھوتے انداز بیاں پر مبنی تھیں، اس کے بعد رات کو ایک بار پھر ڈائجسٹ کی شامت آئی تو میں اب کی بار پوری ترتیب سے اس کا مطالعہ شروع کیا، حمد و نعت پیارے نبی کی پیاری باتیں اور سردار صاحب کی کچھ باتیں ہماریاں پڑھیں پھر انشا نامہ میں لندن کے اردو اخبارات ملاحظہ کیے اور آگے مکمل ناول کی طرف بڑھے۔

''بہار رت آئی'' فرحت عمران کی کہانی بے حد پسند آئی مگر یہ کیا قرۃ العین رائے کی ''چاہت کے رنگ'' شمارے سے صفحات کے ہیر پھیر اور مس پرنٹنگ کی وجہ سے پھیکے پڑ گئے، کہانی تو بہت اچھی لکھی تھی، قرۃ العین نے عینی جی میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔

فرحت شوکت کا ناولٹ ''رہا جو تیرا ہو کر'' زبردست سٹوری ہے بھئی، دیکھتے ہیں فرحت جی نے آگے اس کہانی اور اس کے کرداروں کے لئے کیا سوچ رکھا ہے؟ نایاب جیلانی کی دوسری قسط ''پربت کے اس پار کہیں'' وقت کی کمی کے باعث ابھی تک پڑھ نہیں پائی اس کے لئے معذرت، جبکہ سدرۃ المنتہیٰ کی کہانی بہت اچھی چل رہی ہے، افسانوں میں سب سے مختصر روشانے عبدالقیوم کا ''پچھتاوا'' تھا لیکن اتنے مختصر الفاظ میں اتنی بڑی بات سامنے لانے پر روشانے کو مبارکباد دینا چاہوں گی کہ وہ اس کی مستحق ہیں۔

''ابھی رسم وفا باقی ہے'' ثمینہ رسول کی اچھی کاوش تھی لیکن سمیرا احسان گل کی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' سبقت لے گئی، اتنا زبردست موضوع اور اتنا اچھا لکھنے پر سمیرا گل کو سراہنا چاہوں گی۔

مستقل سلسلوں میں بیاض، میری ڈائری سے اور حنا کی محفل میں ہو کر لوٹے تو کس قیامت کے یہ نامے ایک بار پھر پڑھا حالانکہ وہ میں پہلی تحریر دیکھنے سے بھی پہلے پڑھ چکی تھی لیکن ایک بار پھر پڑھ کر پکا ارادہ کیا کہ اس بار شمارے پر تبصرہ ہم بھی کریں گے۔

دسترخوان میں موسم کی سبزیوں اور دالوں کی تراکیب دیکھ کر ہم پھولے نہ سمائے اور انہیں ٹرائی کرنے کا سوچنے لگے بظاہر دیکھنے اور پڑھنے میں تو یہ آسان ہی لگ رہی ہیں اب پتہ نہیں ٹرائی کریں گے تو کیا ہوگا۔

اب اس بار پھر اپنی آخری کوشش سمجھ کر کچھ غزلیں، اشعار اور دلچسپ معلومات ارسال کر رہی ہوں اس درخواست کے ساتھ کہ پلیز اس مرتبہ انہیں شائع کر دیجئے گا ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔

عالی ناز کیسی ہو بھئی، تمہاری ناراضگی ہم برداشت نہیں کر سکتے اس ماہ آپ کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے خوش، مارچ کے شمارے کے لئے پسندیدگی کا شکریہ آپ کی تحریر سنبھال کر رکھ لی ہے اور ہاں ذرا جلد کوئی اپنے جیسی نٹ کھٹ تحریر لکھ کر بھیجو جو پڑھنے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے۔

مارچ کے شمارے کو پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ آئندہ ماہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆